بلوچستان کا مسئلہ

بلوچ قوم پرستی کا ایک جائزہ

عنایت اللہ بلوچ

The Problem of Greater Baluchistan

Inayatullah Baluch

مترجم: ریاض محمود انجم

جُمہوری پبلیکیشنز

Scanned by CamScanner

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ بلوچستان کا مسئلہ۔ بلوچ قوم پرستی کا ایک جائزہ

• مصنف۔ عنایت اللہ بلوچ • مترجم۔ ریاض محمود انجم

• سرورق۔ مصباح سرفراز • اشاعت۔ 2014ء

• ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

• جملہ حقوق محفوظ

ISBN:978-969-9739-76-7

قیمت 700 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Balochistan Ka Masla- Baloch Qoum Parasti Ka Aik Jaiza

Copyright © 2014, Jumhoori Publications

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan

T: +92-42-36314140 F: +92-42-36306939

info@jumhooripublications.com

www.jumhooripublications.com

Scanned by CamScanner

عنایت اللہ بلوچ

عنایت اللہ بلوچ 28 دسمبر 1946ء کو بالائی ڈیرہ جاٹ (مشرقی بلوچستان) میں جھوک گول کے مقام پر پیدا ہوئے۔ پشاور یونیورسٹی (شمال مغربی سرحدی صوبہ (اب خیبر پختون خوا) سے گریجویشن کی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر مسلم لاء کالج، یونیورسٹی آف کراچی (سندھ) سے تعلیم حاصل کی۔ 1974ء میں نیشنل انسٹیٹیوٹ فار ہسٹوریکل اینڈ کلچرل ریسرچ کے ساتھ منسلک ہوگئے جہاں انہوں نے ریسرچ فیلو اور سینئر ریسرچ فیلو (اسسٹنٹ پروفیسر) کی حیثیت سے 1978ء تک کام کیا۔ 78-1977ء میں شعبہ بین الاقوامی تعلقات، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ عنایت اللہ بلوچ 1982-1978ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں DAAD (German Academic Exchange Service) فیلو بھی رہے، اس کے ساتھ ساتھ ساؤتھ ایشین انسٹیٹیوٹ، یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ میں ریسرچ ایسوسی ایٹس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہوں نے افغانستان، پاکستان اور بلوچستان (ایران/پاکستان) کی تاریخ اور سیاست پر بھی بہت لکھا ہے۔ زیرِنظر کتاب اُن کی تصنیف "The Problem of Greater Baluchistan" کا اردو ترجمہ ہے۔

Scanned by CamScanner

فہرست

اظہارِ تشکر	13
تحویلِ حرفی پر ایک نظر	16
حصہ اوّل تعارف	
تعارف۔ تحقیقی مسائل و مشکلات	21
زیرِ نظر کتاب کے متعلق عرضداشت	24
اکابرین کی تحریریں	26
انٹرویوز	27
طریقہ کار	28
باب 1: قومی حیثیت اور حق خودارادیت	29
مسئلہ	29
مارکس ازم۔ لینن ازم	33
مغربی اندازِ فکر	39
یو این (U.N) اور بین الاقوامی ماہرین قانون	40
باب 2: قوم پرستی اور جغرافیہ	42
رقبہ اور محلِ وقوع	42
موسم اور آبادی	47

Scanned by CamScanner

سٹریٹجک اہمیت	52
تقسیم	53
کوہک (Kohuk) کا مسئلہ	54
بلوچ افغان یا میکمون سرحد	56
بلوچستان کی سیاسی اور آئینی ہیت	58
نسلی گروہ	61
مکرانی اندازِ فکر یا علاقائی قوم پرستی	63
ترکی یا التائی	64
آریائی	65
سامی (خصوصاً یہودی)	67
بلوچ قبائل اور ان کی بستی	72
مشرقی بلوچستان	75
باب 3: قومی تہذیب و ثقافت اور ادب	78
زبان	78
ماخذ اور ابتدا	80
تحریریں اور نسلی حدود	80
بلوچی ادب	87
بلوچی شاعری کی اقسام اور درجہ بندی	88
تاریخی شاعری	89
حب الوطنی پر مبنی شاعری	91
نوآبادیاتی مخالف شاعری	94

Scanned by CamScanner

قومی شاعری کی ابتدا	96
جدید ادب	99
باب4: مذہب اور سماجی روایت	105
ذکری اور ہندو	107
سیاست	110
بلوچ اور دو قومی نظریہ	113
رسوم ورواج اور عادات	114
بلوچ ضابطۂ عزت نفس	118
بلوچ معیار اور حکومتیں	130
باب5: بلوچ قوم پرستی اور تاریخ	131
قدیم تاریخ	131
تاریخ اور مزاحمت	133
پہلے بلوچ وفاق کی تشکیل	137
مکرانی اور قلات کے وفاقوں کے درمیان تعلقات	138
خانہ جنگی اور ہندوستان کو ہجرت	139
ریاستِ مکران	140
ڈیرہ جات (Derajat) کا دودائی وفاق	142
وفاقِ قلات یا بلوچ خانیت	144
معاہدہ قلات 1758ء یا معاہدہ عدم مداخلت	150
معاہدہ قلات کا مختصر جائزہ	151
بلوچ خانیت کا سیاسی نظام	160

Scanned by CamScanner

ریاستی انتظامیہ	161
فوجی تنظیم	164
قومی پرچم	166
قومی زبان	166
کرنسی	166
خارجہ پالیسی	166
زمینوں کا استعمال	167
قبائلی تنظیم	168
ناصر خاں اعظم کی وفات کے بعد صورتِ حال	170
باب6: سامراجیت اور بیداری	173
پس منظر	173
بلوچستان، افغانستان کی بفر ریاست کا بطور ایک حصہ	175
قلات اور پہلی افغان جنگ	175
قلات کا محاصرہ	178
خانیت کی تقسیم اور بغاوت	178
پہلی افغان جنگ کے نتائج	179
بلوچستان، بطور بفر ریاست اور خود مختار حلیف	180
پنجابی نقطۂ نظر	185
مٹھن کوٹ کانفرنس	186
فارورڈ پالیسی یا پنجابی نقطہ نظر	187
سنڈیمن کا پیش کردہ نظام	190

Scanned by CamScanner

بلوچستان اور جنرل براؤنی	192
بیداری	192
تحریکِ ہجرت	193
مغربی بلوچستان میں مزاحمت	194
باب7: قوم پرستی، انقلابی اور آئینی تحریکیں	196
انقلابی تحریکیں	196
بلوچ وفد اور باکو کانفرنس	197
سوویت انقلاب میں بلوچوں کا کردار	199
آئینی سیاست	200
انجمن کی تشکیل	201
مگسی کا احتجاج اور ہجرت	201
انجمن کی اصلاحات پالیسی	202
آزاد بلوچستان کے متعلق انجمن کا موقف	203
ریاست قلات کی نیشنل پارٹی	205
نیشنل پارٹی اور اصلاحات	206
پارٹی کا سالانہ اجلاس	207
خاران کے متعلق نیشنل پارٹی کی پالیسی	207
وطن پارٹی	209
مسلم لیگ	209
ریفرنڈم	209
میر احمد یار خان کی سیاست	212

Scanned by CamScanner

باب8: بلوچستان کی سیاسی حیثیت	214
پس منظر	214
برطانوی نقطہ نظر	217
بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق لارڈ لٹن کا نقطہ نظر	219
برطانوی پالیسی میں تبدیلی	220
آئینی حیثیت	225
باب9: آزادی اور اس سے محرومی	229
آئین	230
مجلسِ وزراء	230
مقننہ	231
پارلیمان کے انتخابات	231
بلوچ، پاک تعلقات	232
برطانوی پالیسی اور قلات کے لیے ہتھیار	235
قلات پارلیمان اور اس کا الحاق	236
قلات پارلیمان کے الحاق کے متعلق پاکستان کی پالیسی	237
ہندوستان اور قلات	241
خانیت کی حکومت کا خاتمہ	242
بلوچ قومی مزاحمت (1948ء)	243
مقدمہ	254
اختتامی کلمات	255
حصہ دوم	

Scanned by CamScanner

ضمیمہ جات	261
I. قلات کا معاہدۂ امن	261
II. سر سلطان احمد کا تیار کردہ حکومت قلات کا میمورنڈم جسے 1946ء میں محمد علی جناح نے کیبنٹ مشن کو پیش کیا۔	291
IV. بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق بمبئی کے بار ایٹ لا آئی آئی چندریگر کا تیار کردہ ڈرافٹ میمورنڈم	305
V. قلات کے وزیر اعظم کی طرف سے سیکریٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ ایل گریفن کے نام خط (26 دسمبر 1946ء)	308
VI. قانونی ماہر کا تیار کردہ ایک نوٹ (19 مارچ 1947ء)	314
III. سر سلطان احمد کا تیار کردہ کوئٹہ، نوشکی اور نصیر آباد کی واپسی کا میمورنڈم جسے محمد علی جناح نے کیبنٹ مشن کو پیش کیا۔	317
VII. سر والٹر مٹکٹون کی طرف سے قانونی رائے (5 جون 1947ء)	317
VIII. اعلامیہ بتاریخ 11 اگست 1947ء	321
IX. وزیر مملکت کی طرف سے تیار کردہ خفیہ میمورنڈم سے اقتباس (12 ستمبر 1947ء)	321
X. خانوں کے دربار میں برطانوی ریزیڈنٹس کی فہرست (1887-1947ء)	322
حوالہ جات	326
منتخب کتابیات	363
کتاب میں مستعمل اصطلاحات کے معنی	386
حالاتِ زندگی	388
نقشہ جات	395

Scanned by CamScanner

اظہار تشکر

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں دوستوں، ساتھیوں اور دیگر افراد نے مجھے بھرپور تعاون فراہم کرنے کے علاوہ حوصلہ افزائی بھی کی جس کے لیے میں مندرجہ ذیل اصحاب (مقامِ افسوس ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ مرحوم ہو چکے ہیں) کا ممنون ہوں:

عبداللہ جان جمالدینی، کفایت اللہ کولاچی (مصنف کا چھوٹا بھائی)، ایم اکبر برزئی، نعمت اللہ گچکی، صورت خان مری، شہریار قیصرانی، مطیع اللہ لاشاری، پرویز سلیم، خالد عزیز، بشیر احمد بلوچ، نادر قمبرانی، لال بخش رند، شیر محمد مری، ایم، میر مٹھا خان مری، عبدالکریم شورش، قادر بخش نظامانی، ملک ایم سعود لاہور، ملک فیض محمد یوسف زئی، مولانا محمد قمر، نوابزادہ شہباز خان نوشیروانی، چاکر خان بلوچ، منظور بلوچ، عصمت اللہ جمالدینی، غفار ندیم، یعقوب بزنجو، ایم حکیم لہری، نیک محمد بزدار، انور جان کھیتران، میر سکندر خان جمالی، سردار عطاء اللہ خان مینگل، نواب خیر بخش خان مری، میر غوث بخش بزنجو، احمد یار بلوچ خانِ قلات (مرحوم)، محمد حسین عنقا (مرحوم)، ملک محمد پناہ (مرحوم)، میر گل خان نصیر (مرحوم)، عبدالوحید عزت جمالدینی (مرحوم)، پرنس عبدالکریم خان (مرحوم)، محمد عزیر کرد (مرحوم)، ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر آر افضل، پروفیسر ایچ دانی، ڈاکٹر ایچ قزلباش، ڈاکٹر انیس الارا، ڈاکٹر فیروز احمد (پاکستان)، پروفیسر الیف بارتھ، پروفیسر گرون ہاگ اور ڈاکٹر ٹی آسہ (ناروے)، ڈاکٹر ڈیٹیلہ بریڈی (روم، اٹلی)، ڈاکٹر ڈیوڈ ٹیلر، ڈاکٹر زیدی (لندن، انگلستان)، ڈاکٹر ڈی خالد، ڈاکٹر یو سٹینبش (ہیمبرگ)، ڈاکٹر ایچ جے لیو، پروفیسر ڈاکٹر ایچ کویک، ڈاکٹر پی زنگل، ڈاکٹر ہینز فرے، پروفیسر ڈاکٹر فیفر، ڈاکٹر ڈی گریفن برنز آف، ڈاکٹر ڈی کونارڈ، ڈاکٹر ایم ایچ زیدی، ڈاکٹر سونی، ڈاکٹر

Scanned by CamScanner

گلیٹزر (ساؤتھ ایشیا انسٹیٹیوٹ، ہائیڈل برگ)، امریکا اور برطانیہ، خاص طور پر ساؤتھ ایشیا انسٹیٹیوٹ، ہائیڈل برگ کے متعدد کتب خانوں کے سٹاف کے علاوہ کانگریس لائبریری، واشنگٹن ڈی سی، لائبریری آف مڈل ایسٹ سینٹر، کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک، برٹش لائبریری، لندن، لائبریری آف دی سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، لندن کا سٹاف۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے میر احمد یار خان (بلوچستان کے سابق حکمران)، ان کے وزیر خارجہ ڈاکٹر وائی فیل اور پھر بلوچ قوم پرست نوابزادہ شہباز خان نوشیروانی، محمد حسین عنقا اور قادر بخش کا تعاون یوں حاصل ہوا ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے طبع شدہ اور غیر طبع شدہ مواد تک رسائی دی۔ علاوہ ازیں، میں، بلوچ سیاسی قائدین سردار عطاء اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، میر غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیر، میر شیر محمد مری اور خانِ قلات میر احمد یار خان بلوچ کے قیمتی انٹرویوز اور بات چیت کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔ مزید برآں، میں، سلگ ایس ہیریسن کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے میری تصنیف میں انتہائی دلچسپی کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ بلوچستان اور افغانستان کے متعلق طبع شدہ اور غیر طبع شدہ مواد فراہم کیا۔

مزید یہ کہ میں پروفیسر ایرالپیڈس (دی سینٹر آف مڈل ایسٹرن سٹڈیز، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے) کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے میری اس کتاب میں دلچسپی لی اور پھر اس سینٹر میں بلوچستان میں جدید سیاست کے موضوع پر مزید تحقیق کے لیے Postdoctoral fellowship عنایت کی۔ اس کے علاوہ میں مڈل ایسٹرن سینٹر، ہارورڈ یونیورسٹی، کیمبرج، میساچوسٹس کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس سینٹر میں Postdoctoral fellowship عنایت کی (بدقسمتی سے میں کچھ ناگزیر ذاتی اور سیاسی مسائل کے باعث ان سہولیات سے فائدہ نہ اٹھا سکا)۔

مجھے Deutscher Akademischer Austausch Dienst(DAAD) کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ مجھے فیلوشپ فراہم کی گئی جس کے باعث میں اپنی ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کتاب کی حتمی تدوین کے لیے ٹریور اور اس مسودے کی ٹائپنگ کے لیے مسز ڈینگلر، مسز فیلر اور کرس کا ممنون ہوں۔ مزید برآں، میں، نہایت ہی عالمانہ تجویزوں اور تنقید کے لیے Privatdozent Dr. J. Liitt کا بھی شکر گزار ہوں۔ علاوہ ازیں، مجھے "Doktorvater"

Scanned by CamScanner

(سپروائزر)، پروفیسر ڈی روتھینیو ڈ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

سب سے آخر میں، اپنی اہلیہ، Dr.S.Serdaroglu کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ ہر قسم کی مشکلات میں میرا ساتھ دیا۔

ہائیڈل برگ 1986ء

عنایت اللہ بلوچ

Scanned by CamScanner

تحویل حرفی پر ایک نظر

زیرِ نظر تصنیف لسانیاتی نہیں بلکہ تاریخی جائزے پر مشتمل ہے، اس لیے میں نے مستشرقین کے وضع کردہ تحویل حرفی کے مغربی نظام کو استعمال نہیں کیا۔ تحویل حرفی کے کسی ایک نظام کو اپنانے کے ضمن میں، خاص طور پر جب عربی (عبرانی)، فارسی، بلوچی، پشتو (ایرانی، انڈو یورپی)، اردو، سندھی (انڈو یورپی کی ایک ہندی شاخ) اور التائی (Altaic) جیسی بہت سی زبانوں سے الفاظ اور اصطلاحات مستعار لی جاتی ہیں، تو بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔

مزید برآں، ایران، بلوچستان، پاکستان اور افغانستان میں مقامی دانشوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے درمیان تحویل حرفی کے ضمن میں اختلاف موجود ہے کیوں کہ ایک ضلع، حتیٰ کہ گاؤں میں بھی تلفظ کے لحاظ سے قابل ذکر فرق موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ''نہیں'' کو افغانستان کے پشتونوں (پشتون) میں بطور (sh) پڑھا جاتا ہے جب کہ اسی لفظ کو مشرقی بلوچوں میں ''خ'' اور مغربی بلوچوں میں "h" پڑھا جاتا ہے۔ "T" کے لفظ کا تلفظ عربوں اور مشرقی بلوچوں میں "kh" ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسی لفظ کو مغربی بلوچوں اور ترکوں میں "h" پڑھا جاتا ہے۔ ٹی ایس لارنس کو عربی الفاظ اور اصلاحات کی تحویل حرفی کرنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ''اس امر کی تفصیلاً وضاحت کر دینی چاہیے کہ عربی میں صرف تین حروفِ علت رائج ہیں اور یہ بھی کہ کچھ حروفِ علت کے انگریزی میں مترادفات موجود نہیں۔ حالیہ برسوں میں مستشرقین کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ انہوں نے عربی حروفِ تہجی کے الفاظ اور حروفِ علت کی علامات کے لیے روایتی علامات کے مختلف مجموعوں میں سے کوئی ایک مجموعہ استعمال کیا اور ''محمد'' (Mohammad) کی تحویل حرفی ''مُحمد'' (Muhammad)،

Scanned by CamScanner

''موذن'' (Muezzin) کی تحویل حرفی ''مُحذن'' (Muhdin) اور ''قرآن'' (Koran) کی تحویل حرفی ''قُرآن'' (Quran or Kuran) کے طور پر کی۔ یہ طریقہ ان کے لیے مفید ہے جنہیں معلوم ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں لیکن اس کتاب میں تحریر کا پرانا انداز اختیار کیا گیا ہے جو عام انگریزی ہجوں کے مطابق بہترین صوتی مشابہت ہے۔ تحریر کا یہی طریقہ نہ صرف اس وجہ سے مختلف طریقوں میں تقسیم نظر آئے گا کہ بہت سے عربی الفاظ کو جائز طور پر انگریزی میں بہت سے طریقوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کسی ضلع کے مقامی لوگ عام طور پر کسی ایسی جگہ کے نام کا تلفظ مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں جو ادبی استعمال کے لحاظ سے پہلے ہی مشہور ہوتے ہیں۔''

-(T.E.Lawrence.Seven Pillars of Wisdom,p.18,(London,1968)

تحویل حرفی کے ضمن میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار ایل ڈُپری نے اپنی کتاب ''افغانستان'' (1973) اور سرجان اولف کرو ''سوویت ایمپائر'' (1967ء) میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں، A.Bennigsen اور S.Wimbush نے "Muslim National Communism" (1979) میں تحویل حرفی کے نظام میں کسی قسم کی موافقت سے معذوری ظاہر کی ہے۔ اس لیے میں نے مختلف زبانوں اور علاقوں میں مروج الفاظ اور اصطلاحات کے تلفظ کی تحویل حرفی فراہم کی ہے۔ لیکن میں نے وہ اصطلاحات اور نام استعمال کیے ہیں جن کے ہجے معیار کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں بلوچستان (Balochistan) کی بجائے بلُوچستان (Baluchistan) کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک حوالوں کا تعلق ہے، میں نے خیلات "Khelat" (قلات) اور بلوچ "Biloch" (Baloch) وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات کی بنیادی تحویل حرفی برقرار رکھی ہے۔

Scanned by CamScanner

''افراد اپنی تاریخ خود بناتے ہیں لیکن وہ یہ کام اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر پاتے، وہ یہ کام اپنی مرضی سے منتخب شدہ حالات میں انجام نہیں دیتے بلکہ وہ یہ کام ان مخصوص حالات میں انجام دیتے ہیں جن کا انہوں نے ماضی میں براہ راست سامنا کیا ہوتا ہے اور وہ انہیں ورثے میں ملے ہوتے ہیں۔''

(کارل مارکس)

''تاریخ ایک ایسی چیز ہے جسے تجربات کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ جس شخص نے کبھی بھرپور زندگی نہیں گزاری، جس نے اس کائنات کے حوالے سے مشکلات برداشت نہیں کیں، جدوجہد نہیں کی اور نہ ہی کبھی غور و فکر کیا، وہ تاریخ کو سمجھ نہیں سکتا۔''

(پرفیسر ہینز کوہن)

''نوآبادیاتی نظام میں رہنے والا کوئی شخص جو اپنی قوم کے لیے لکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ مایوس نہ ہونے اور امید رکھنے کے ضمن میں عمل اور بنیاد کے طور پر مستقبل کی راہیں تلاش کرنے کے مقصد کے حصول کی خاطر اپنے ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔''

(فرانز فینن)

Scanned by CamScanner

حصہ اوّل

تعارف

Scanned by CamScanner

تعارف

تحقیقی مسائل ومشکلات

حالیہ برسوں میں ''مسئلہ بلوچستان'' نے Perso-Hurmaz Gul میں اپنے سٹریٹجک محل وقوع کے باعث مغربی دنیا کی توجہ حاصل کرلی ہے۔اس ضمن میں صحافیوں اوردانشوروں سمیت متعدد افراد نے مختلف قسم کے مضامین تحریر کیے ہیں۔انہوں نے زیادہ تر سپر طاقتوں کے درمیان مخالفت کے تناظر میں اور بلوچستان کی قومی تحریک اوراس کی طرف سے خودارادیت کے مطالبے کونظرانداز کرتے ہوئے بلوچستان کے مسئلے کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔اس تحقیقی مقالے کا مقصد یہ ہے کہ بلوچ قوم پرستی اور1948ء تک حق خودارادیت کے مطالبے کے تاریخی پس منظر کا تحقیقی جائزہ لیا جائے تا کہ یہ معلوم ہوسکے کہ بلوچ قوم پرستی کی ابتدا کیسے اور کب ہوئی۔

ذاتی اور علمی نوعیت کے حامل چند عناصر اس تحقیقی جائزے کو مرتب کرنے کا باعث ثابت ہوئے۔میرے آباواجداد نے بلوچ وفاقی اکائی، خاص طور پر مشرقی بلوچستان میں دودیائی (Dodai) وفاقی اکائی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔دودیائی وفاقی اکائی کے زوال کے بعد ہمارے گھرانے نے افغان یا پنجابی توسیع پسندوں کے خلاف مزاحمت کی۔میرے دادا سردار رب نواز خان نے 1918ء اور1919ء میں انگریز مخالف سرگرمیوں میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے زہر دے دیا اوران کی دس ہزار ایکڑ اراضی ضبط کرلی گئی۔آزادی کی خاطر جدوجہد کے الزام میں میرے والد اور چچا کو بھی قید وبند میں ڈال دیا گیا۔1967ء سے ہی میں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔میں اس وقت پولیٹیکل سائنس اور قانون کا طالب علم تھا۔1971ء میں جنرل یحییٰ خان کی

Scanned by CamScanner

سربراہی میں فوج نے اکثریتی جماعت عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا۔ عوامی لیگ کے سربراہ مجیب الرحمٰن تھے جو بعد ازاں بنگلہ دیش کے بانی کہلائے۔ جنرل یحییٰ کی طرف سے اکثریتی جماعت کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کے نتیجے میں خودارادیت کے مسئلے پر بنگالی عوام نے احتجاج شروع کر دیا۔ پاکستان کی ''پنجاب فوج'' نے بنگالی عوام کے اس جمہوری مطالبے کو کچلنے کے لیے مشرقی پاکستان پر فوج کے ذریعے حملہ کر دیا۔ وہاں عوام میں اس حملے کا نہایت ہی شدید ردعمل ہوا جو اس سے قبل 1948ء اور پھر 1958ء سے 1968ء تک مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں ظلم کا شکار رہ چکے تھے۔ بلوچ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے احتجاج کیا اور فوجی کارروائی کی مخالفت کی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی مخالفت کا نتیجہ پاکستان کی سیکرٹ سروس کی طرف سے بغیر وارنٹ گرفتاری، ہماری گرفتاری کی صورت میں برآمد ہوا۔ ''غدار بنگالیوں''، ''نیم بنگالی مسلمانوں''، ''ہندوؤں'' اور ''افغانوں'' کے ایجنٹ کے طور پر قید خانے میں ہمارے ساتھ ظلم و ستم روا رکھا گیا، ہمیں اذیت کا نشانہ بنایا گیا اور ہمارے ساتھ بہت ہی غلط اور برا سلوک کیا گیا۔ پولیس کے ایک افسر نے مجھے بتایا کہ حق خودارادیت کا مطالبہ، ایک غیر اسلامی مطالبہ ہے جسے بھارتیوں کے علاوہ اسلام اور پاکستان کے دشمنوں نے پراپیگنڈے کے ذریعے تقویت دی ہے۔ بہرحال جب مشرقی پاکستان میں فوج کو شکست سے دوچار ہوئی تو ہمیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے مجھے یہ خواہش محسوس ہوئی کہ میں حق خودارادیت کی تاریخ کا مطالعہ کروں۔ 1973ء میں بھٹو حکومت نے "National Institute of Cultural Research" تشکیل دیا تاکہ پاکستان اور اس کی تہذیب و ثقافت کو احاطہ تحریر میں لایا جائے۔ 1974ء میں، میں نے اس انسٹیٹیوٹ میں ملازمت اختیار کر لی اور یہاں "Research Fellow" کے علاوہ "Senior Research Fellow" کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس ضمن میں مجھے ''افغان جرگہ'' (خدائی خدمت گار) کے موضوع پر موجود دستاویزات کو جمع کرنے اور ان کی تدوین کرنے کے علاوہ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

اس ذمہ داری کے علاوہ، میں نے بلوچ سیاسی کارکنوں اور سیاست دانوں سے بلوچ قوم پرستی کے موضوع پر دستاویز اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ انہوں نے نہ صرف مجھے اپنی دستاویزات، پرانے اخبارات اور سیاسی جماعتوں کے متعلق تحریری معلومات فراہم کیں بلکہ انہوں نے میری طرف سے کیے گئے حساس سوالات کے جواب بھی دیئے کہ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس

Scanned by CamScanner

نہیں پہنچائی جائے گی۔ان کا اعتماد حاصل کرنے کے ضمن میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے ساتھ ہمارے خاندانی تعلقات اور روابط فیصلہ کن عناصر ثابت ہوئے۔

1977ء میں، میں نے محسوس کیا کہ بلوچستان کے مسئلے کے تحقیقی جائزے کے ضمن میں میرے پاس کافی مواد اکٹھا ہو چکا ہے۔(اس وقت بھٹو حکومت کی طرف سے بلوچ عوام کا ظلم وستم کا نشانہ بنایا جارہا تھا اور ان پر بمباری کی جارہی تھی جسے شاہ ایران کی بھی حمایت حاصل تھی)۔جلد ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ پاکستان میں رہتے ہوئے اس موضوع پر تحریر وتصنیف ممکن نہیں کیوں کہ یہاں قومیتوں کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے متعلق ذکر وگفتگو ممنوع ہے۔مزید یہ کہ 1978ء میں ''قومیت'' کی اصطلاح کا استعمال بھی غداری کے زمرے میں آتا تھا۔بہرحال 1978ء میں Professor Rothermund نے مجھے ڈاکٹریٹ کے اپنے مقالے پر کام کرنے کے لیے ہائیڈل برگ آنے کی دعوت دی اور DAAD کے علاوہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی طرف سے مالی معاونت کا بھی بندوبست کردیا۔1979-1980ء میں مَیں لندن چلا گیا تاکہ انڈیا آفس لائبریری، پبلک ریکارڈ آفس، برٹش میوزیم لائبریری کے علاوہ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز سے متعلقہ مواد حاصل کرسکوں۔ لندن میں میرے قیام کے دوران میری بلوچ رہنماؤں، قادر بخش نظامانی، نواب خیر بخش خان مری، سردار عطاء اللہ خان مینگل اور قلات کے سابق وزیر خارجہ وائی ڈی فیل سے ملاقاتیں ہوئیں۔ان تمام افراد سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے ان سے کئی بار گفتگو بھی کی جس کے دوران انہوں نے مجھے قیمتی معلومات اور دستاویزات فراہم کیں۔1981ء میں مجھے اپنی والدہ کی موت کا صدمہ سہنا پڑا۔ مجھے اس وقت مزید اذیت محسوس ہوئی جب میں نے یہ محسوس کیا کہ بلوچستان پر تحقیق اور اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر میں اپنی والدہ کی تجہیز وتکفین میں شرکت نہیں کرسکوں گا۔میرے سیاسی نظریات اس وقت کے حکمرانوں کی نظر میں ''غداری'' کے سوا کچھ نہیں تھے۔1978ء سے کچھ حلقے میری اس تحقیق کے بارے میں خدشات میں مبتلا ہو چکے تھے۔مثال کے طور پر 1980ء میں وہ اس وقت خدشے میں مبتلا ہوگئے جب مجھے مئی 1980ء میں International Conference on Pakistan میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔(اس ضمن میں Orient Hamburg,21, Jahrgang,Nr.3 Sep.1980,pp.287-288 ملاحظہ فرمائیں)۔ان مشکل حالات میں Professor Rothermund کی معاونت میرے بہت ہی کام آئی۔انہی حالات میں مَیں نے 1981ء کے اواخر میں اپنا مقالہ لکھنا شروع

Scanned by CamScanner

کیااور 1983ء کے موسم بہار میں آخری مسودہ مکمل کرلیا۔ پروفیسر Rothermund نے مجھے اپنا قیمتی وقت دینے کے ساتھ ساتھ اپنی میزبانی کا بھی اعزاز بخشا۔

زیرِ نظر کتاب کے متعلق عرضداشت

ایران، افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کے متعلق بہت سی کتب تصنیف کی گئیں ہیں لیکن ان میں سے چند کتب ہی میں بلوچستان کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے۔ یورپی سیاحوں، جاسوسوں اور سیاسی اہلکاروں نے انیسویں صدی کے دوران اور بیسوی صدی کے اوائل میں بہت سی کتابیں تحریر کیں لیکن 1933ء سے بلوچستان کی تاریخ کے موضوع پر محض چند کتب دستیاب رہی ہیں۔ جہاں تک مصنف کا خیال ہے، ابھی تک بلوچستان کی سیاسی تاریخ کے موضوع پر کوئی ایسی واحد اور جامع تحقیق دستیاب نہیں جو بلوچستان مسئلے کی حقیقی تصویر پیش کر سکے۔

بہرحال اس ضمن میں مغرب میں جو پہلی کتاب طبع ہوئی (اس میں عظیم تر بلوچستان کا تمام علاقہ شامل ہے)، اسے ایک برطانوی سیکرٹ ایجنٹ لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر نے تحریر کیا تھا اور اس کتاب کا نام "Travels in Baloochistan and Sinde" تھا۔ یہ کتاب لندن سے 1816ء میں شائع ہوئی۔ اس نے اپنی کتاب میں بلاروک ٹوک بلوچستان کے جغرافیہ، تاریخ اور سیاست (10-1809) کے متعلق لکھا۔ اس کی کتاب کا تاریخی حصہ بہت کمزور ہے کیوں کہ اس نے محض معلومات پر انحصار کیا اور وہ بلوچستان کے خانوں کی حکومت کے سرکاری ریکارڈ تک بمشکل رسائی کے قابل ہوا تھا۔

پوٹنگر کی کتاب کی اشاعت کے بعد چارلس میسن کی کتاب بعنوان "Narrative of Journeys in Balochistan, Afghanistan, the Panjab, and Various Kalat" کی چار جلدیں 1842ء میں شائع ہوئیں۔

اگرچہ یہ کتب ایک سو سال سے زیادہ پرانی ہیں اور بلوچستان تاریخ کے کئی ادوار طے کر چکا ہے لیکن ان کتب میں مذکور معلومات بعض پہلوؤں کے لحاظ سے ابھی بھی مفید ہیں۔ میسن کی کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں 1839ء میں بلوچستان پر برطانوی حملے، قلات پر قبضے، محل اور سرکاری ریکارڈ کی تباہی کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری نصف حصے اور بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد برطانوی

Scanned by CamScanner

سیاسی افسروں نے بلوچستان کے متعلق کتب تحریر کیں، جن میں Thomas Henry Thornton کی Sir Robert Sandeman(London 1895) History of Persia and Persian Question(London 1892) کی Lady Betty Balfour Forward Policy and its Results(London 1901) کی R.Bruce Ten Thousand Miles in Persian(London 1902) کی Percy M.Sykes The Baloch Race(London 1904) کی M.Longworth Dumes Popular Poetry of Baloch(London 1907) The North West Frontier,1890-1908(Cambridge 1932) اور Colin Davi Seistan(London 1910) کی G.P.Tat شامل ہیں۔ مذکورہ کتب گوشہء ادب سے شائع ہوئیں۔

مندرجہ بالا تقریباً تمام کتابیں نہایت اہم نوعیت کی حامل ہیں جن کے ذریعے بلوچستان کے متعلق برطانوی سوچ اور نقطہ نظر کے علاوہ بلوچ عوام اور ان کی تہذیب وثقافت کے متعلق مفید اور کارآمد معلومات اور اعداد وشمار حاصل ہوتے ہیں۔ ان طبع شدہ کتب کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری، پبلک لائبریری آفس اور برٹش میوزیم لائبریری میں اہم غیر طبع شدہ مواد بھی دستیاب ہے۔ ان غیر طبع شدہ معلومات اور اعداد وشمار میں سے جو 1931ء سے 1948ء تک کی بلوچ تاریخ کے آئینی اور سیاسی پہلوؤں کو سمجھنے کے ضمن میں بہت ہی قابل قدر ہیں، مختلف قسم کی مسلیں (files) نمبری IOR:L/P+S/13/1846-47، L/P-S/12/3174 اور R/+166 بلوچستان کی اصلاحات اور آئینی حیثیت کا جائزہ لینے کے ضمن میں بہت زیادہ مفید ثابت ہوئیں۔ دفتر خارجہ میں دستیاب ریکارڈ میں سے سنڈیمن اور ریمسے کے تحریر کردہ "Memoranda on Balochistan" کے ذریعے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بلوچوں کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔

1931ء سے 1948ء تک کی سیاست کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے اس عرصے سے متعلقہ دستیاب بلوچی اخبارات حاصل کر لیے۔ عنقاء کے مطابق، بلوچستان کے پہلے صحافی، جس کے زیادہ تر ریکارڈ میں 1948-1932ء کے تمام اخبارات کی مکمل جلدیں شامل تھیں، کو جب 1958ء میں گرفتار کیا گیا تو یہ تمام ریکارڈ حکام نے تباہ کر دیا۔ اس تباہی سے بچ جانے والے اخبارات کے چند شمارے مصنف کے حوالے کر دیئے گئے اور مندرجہ ذیل اخبارات کا مطالعہ کیا گیا:

Scanned by CamScanner

اخبارات کے نام	مقام اشاعت	پالیسی
البلوچ	کراچی	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
بلوچستانِ جدید	کراچی	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
نجات	کراچی	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
ینگ بلوچستان	کراچی	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
بلوچستان	کراچی	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
اتحادِ بلوچاں	کراچی	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
بولان	مستونگ	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
الحسیف	جیکب آباد	بلوچ قوم پرستی کی حمایت
استقلال	کوئٹہ	کانگریس کی حمایت
پختون	پشاور	کانگریس کی حمایت
تنظیم	کوئٹہ	کانگریس کی حمایت
زمیندار	لاہور	کانگریس کی حمایت
ڈان	کراچی	کانگریس کی حمایت

مندرجہ بالا اخبارات کا انتخاب اس لیے کیا گیا کیوں کہ یہ مختلف اندازہائے فکر کے نمائندہ ہیں اوران کے ذریعے بلوچستان کی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اکابرین کی تحریریں

بلوچستان کے سیاسی رہنماؤں اوران کے نجی نامہ نگاروں کی تحریروں کے علاوہ ان کی خودنوشت سوانح عمریاں بھی، سیاسی رہنماؤں کے نظریات اور خیالات کو جاننے کے ضمن میں مفید اور کارآمد ہیں۔ مصنف نے سیاسی رہنماؤں کے ایک سو سے زائد غیر طبع شدہ خطوط حاصل کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ ترمگسی، اچکزئی، نوشیروانی، عنقاء اور نظامانی کے نجی خطوط ہیں۔

خانِ قلات، میر احمد یار کی خودنوشت سوانح عمری کے علاوہ کُرد کی خودنوشت سوانح عمری، بلوچستان قومی تحریک کے متعلق قیمتی دستاویزات پر مشتمل ہیں۔ قلات کے وزیراعظم، سر ایڈورڈ ویکفیلڈ کی

Scanned by CamScanner

آپ بیتی(1933-35)اور ڈی وائی فیل کی تحریریں، قلات کی سیاست اور انتظامیہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔

انٹرویو

1920-1948ء کے سیاسی واقعات کے فہم کے لیے میں نے بلوچ سیاسی رہنماؤں یا پھر اُن لوگوں سے رابطہ کیا جنہوں نے ان واقعات میں براہ راست یا بالواسطہ حصہ لیا تھا۔ اس ضمن میں معلومات فراہم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل رہنماؤں نے اپنی رضامندی ظاہر کی:

نام	مقام	تاریخ
سردار حبیب اللہ خان کولاچی	ڈی آئی خان	ستمبر 1977ء
خانِ قلات، میر احمد یار خان	کوئٹہ	اپریل 1977ء
محمد حسین عنقا	مچھ	اپریل 1977ء
عبدالکریم شورش	کوئٹہ	اپریل 1977ء
ملک فیض محمد	مستونگ	موسم بہار 1977ء
میر گل خان نصیر	کوئٹہ	اپریل 1978ء
شہباز خان نوشیروانی	کوئٹہ	اپریل 1978ء
شیر محمد خان مری	کوئٹہ	اپریل 1978ء
مولوی محمد عمر	مستونگ	اپریل 1978ء
ملک محمد پناہ	مستونگ	اپریل 1978ء
عبدالواحد عزت جمالدینی	کوئٹہ	اپریل 1978ء
قادر بخش نظامانی	لندن	موسم سرما 1979ء
ڈی وائی فیل، سابق وزیر خارجہ قلات	سکاٹ لینڈ	موسم گرما 1979ء
سردار عطاء اللہ مینگل	لندن	مارچ 1981ء
میر غوث بخش بزنجو	اسلام آباد	1978ء
نواب خیر بخش مری	لندن	مارچ 1981ء

Scanned by CamScanner

طریقہ کار

اس کتاب کی تصنیف کے دوران متعدد تحقیقی مسائل سامنے آئے۔ تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے تا کہ یہ امر یقینی بنایا جا سکے کہ بلوچستان کی اس قسم کی مختصر تاریخ بیان کی جائے جو جنوب مغربی ایشیا میں قوم پرستی کی تاریخ کے متعلقہ اہم نکات پر مشتمل ہو۔ اس ضمن میں Nejla Izzudin کی "The Arab World"، Haim کی "Arab Nationalism"، Cottom کی "Iranian Nationalism" اور Rothermund کی کتاب "Phases of Indian Nationalism" رہنمائی مہیا کرتی ہیں۔

برطانیہ، پاکستان اور افغانستان کے سرکاری ریکارڈ اور پاکستانی دانشوروں کی شائع کردہ کتب کو استعمال کرنے کے ضمن میں ہمیں اس تعصب کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے قومی مفاد کے حوالے سے یہ مواد پیش کیا۔ اکثر مواقع پر یہ دانشور اپنے قومی یا نظریاتی خیالات اور نظریات کے مطابق مختلف توجیہات اور تشریحات پیش کرتے ہیں۔

میری کتاب کا بہت سے حصہ انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ انٹرویوز کے دوران میں نے محسوس کیا کہ متعدد انداز ہائے فکر کے ساتھ منسلک ہونے کے باعث ان کے خیالات میں تضادات کا عنصر موجود ہے۔ میں نے ان تمام بیانات کا نہایت محتاط انداز میں تجزیہ کیا ہے اور طبع شدہ مواد کے ساتھ ان کے تقابل کے ذریعے ان کی جانچ پڑتال کی ہے۔ جہاں معلومات دستیاب نہیں تھیں، اس خلا کو پُر کرنے کے لیے میں نے یہ انٹرویوز استعمال کیے ہیں۔ میں نے اختلافِ رائے کی نشاندہی کے لیے بھی یہ انٹرویوز استعمال کیے ہیں۔

حوالوں کے علاوہ، اہم مختصر تحریریں بھی دی گئیں ہیں تا کہ ان کتاب میں مذکور نکات کی بخوبی وضاحت ہو سکے۔ اس ضمن میں چند مختصر خودنوشت سوانح عمریوں کے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ بلوچی، ترکی، فارسی، عربی، سندھی اور اردو الفاظ کے معنی بھی دیئے گئے ہیں تا کہ قارئین بعض غیر ملکی اصطلاحات کے معنی سمجھ سکیں۔ کتاب کے آخر میں تصاویر اور نقشے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ برطانوی بلوچستان کی اصطلاح کی بجائے برطانوی افغانستان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ یہ ایک گمراہ کن اصطلاح ہے کیوں کہ نسلی، جغرافیائی اور تاریخی طور پر یہ علاقہ افغانستان کا حصہ ہے جسے ''عظیم تر بلوچستان'' کے نقشے سے بلوچ قوم پرستوں نے خارج کر دیا ہے۔ ''مشرقی بلوچستان'' کی اصطلاح بلوچستان کی خان حکومت کے لیے استعمال کی گئی ہے جس میں ڈیرہ جات اور جیکب آباد شامل ہیں جب کہ ''مغربی بلوچستان'' کی اصطلاح، ایران اور افغانستان میں شامل بلوچ علاقوں کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

Scanned by CamScanner

باب 1

قومی حیثیت اور حق خودارادیت

مسئلہ

بیسویں صدی میں ''ایفروایشیا اقوام کے ممالک'' دنیا کے سیاسی نقشے پر ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ سیاسی اور تاریخی لحاظ سے انہیں ''غیر مغربی اقوام'' کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے[1]۔ ان کی تشکیل روایتی ممالک اور نوآبادیاتی بندوبست میں ہوئی ہے جن میں قوم پرستی کے لیے درکار مربوط بنیاد کا فقدان ہے۔ جنوب مغربی ایشیا کا نقشہ پاکستان، ایران اور افغانستان جیسی ریاستی اقوام پر مشتمل ہے جہاں مختلف قسم کے متعدد لسانی، نسلی، تہذیبی اور ثقافتی اختلافات وتضادات موجود ہیں۔ ان نوزائیدہ ''ریاستی اقوام'' کی اکثریت قوم پرستی کی مربوط بنیاد سے محروم ہے اور وہ خود میں موجود قومیتوں کی طرف سے حق خودارادیت کے مطالبے کا سامنا کررہی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان ''ریاستی اقوام'' کا مستقبل کیا ہے؟ ان ریاستوں کی بقا کا مسئلہ بہت حد تک قوم پرستی کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ ایک قومیت یا ان لوگوں کی طرف سے قوم پرستی، اپنی قومیت کے لیے ایک مطالبہ اور جدوجہد ہے جو ایک مشترکہ تہذیب وثقافت، زبان، تاریخ اور جغرافیائی حیثیت کی بنیاد پر ایک ریاست تشکیل دینے کے ضمن میں اپنی پہچان سے آگاہ ہیں۔ اس حوالے سے جان سٹورٹ مل نے کہا تھا، ''آبادی کے ایک ایسے حصے کو قومیت پر مشتمل کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ خود کو ان مشترکہ ہمدردیوں کی بنیاد پر متحد کرلیں جو ان کے اور کسی دیگر آبادی کے درمیان موجود نہ ہوں، نیز وہ خود کو ایک حکومت کے تحت کرنا چاہیں اور ان کی خواہش ہو کہ خود ہی حکومت کریں۔''[2]

ایک قوم اور ریاست کی تشکیل کے لیے وحدت کا تصور نہایت لازمی ہے۔ متعدد جنوب مغربی ریاستیں غیر نسلی حدود کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر، افغانی اور ایرانی ''ریاستی اقوام'' انیسویں

Scanned by CamScanner

صدی کے دوران اس ''گریٹ گیم'' کے باعث وجود میں آئیں جہاں برطانوی اور روسی استعماریت نے مختلف اقوام کو تقسیم کر دیا۔ درحقیقت بہت ہی کم ''ریاستی اقوام'' قومی وحدت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے سیاسی فلسفی کثیر الاقوامی ریاست کی زندہ رہنے اور پنپنے کی صلاحیت کے متعلق شک کا اظہار کرتے ہیں۔ جان سٹورٹ مِل نے اس امر کی پُرزور حمایت کی کہ ''حکومت کی حدود اس میں بسنے والی قومیتوں سے ہم آہنگ ہونی چاہئیں۔''[3] اسی طور Joseph R.Strayer نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''ایک ایسی ریاست جس کی حدود، جس کا ابتدائی سیاسی اکائی سے کوئی تعلق نہ ہو، جس کے مکینوں کا بخوبی علم ہو کہ ان کی ریاست قدیم سیاسی یا تہذیبی گروہ بندی کا محض ایک حصہ ہے اور جس کے اداروں کا لوگوں کے سماجی اقدار اور رسوم و رواج سے کوئی تعلق نہ ہو، ایک ایسی ریاست ہے جو یقینی طور پر ایک قوم نہیں بن سکے گی اور وہ ممکنہ طور پر جلد ہی ایک ریاست کی حیثیت سے مٹ جائے گی۔[4]

ہمیں لازمی طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ نوآبادکاروں کی طرف سے پاکستان، ایران اور افغانستان کی حدود ان کی جغرافیائی، ثقافتی یا تاریخی عناصر اور پہلوؤں کو پیش نظر رکھے بغیر متعین کی گئیں۔ ان ممالک کی علاقائی حدود ان حدود میں سے گزرتی ہیں جہاں افراد رہتے ہیں جس کے باعث یہ ممالک کئی حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

لہٰذا بلوچ عوام کی مشاورت کے بغیر ہی بلوچستان کی حدود کی نشاندہی انیسویں صدی کے وسط میں کی گئی جنہوں نے نوآبادکاروں کے ان فیصلوں کو مسترد کر دیا اور ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ 1930ء کی دہائی میں بلوچ عوام نے بلوچستان کی تقسیم کے خلاف احتجاج کیا۔ 1947ء میں بلوچستان کی خان حکومت آزاد ہو گئی اور اس نے اعلان کیا کہ اس کا مقصد و منشا بلوچ علاقے کا اتحاد ہے لیکن 1948ء میں پاکستان نے بلوچ عوام کے حق خودارادیت کو پیش نظر رکھے بغیر اس حکومت کو زبردستی اپنے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کیا۔ نام نہاد برطانوی بلوچستان اور بلوچستان کے قبائلی علاقوں کا مسئلہ برطانوی حکام کی طرف سے نامزد کردہ غیر نمائندہ council of elders کے ذریعے حل کیا گیا۔

پاکستانی دانشور اور سرکاری حکام 1940ء میں لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے کا حوالہ دیتے ہیں جہاں برصغیر میں ایک علیحدہ اسلامی ریاست قائم کرنے کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس موقع پر یہ امر نہایت ہی دلچسپی کا حامل ہے کہ جس وقت مسلم لیگ نے ''قراردادِ پاکستان'' یا قراردادِ

Scanned by CamScanner

لاہور (1940ء) منظور کی، اسی وقت مسلم لیگ کے صدر ایم اے جناح، خانِ قلات کے قانونی مشیر کی حیثیت سے بلوچستان کی ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے لیے آئینی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ امر بھی قدرے دلچسپی کا حامل ہوسکتا ہے کہ لاہور کی اس تاریخی کانفرنس میں بلوچستان کی نمائندگی نہیں تھی۔ اس کے باوجود 1947ء میں بلوچستان کے خانوں کی حکومت آزاد ہوگئی جسے پاکستان نے بھی تسلیم کرلیا لیکن 1948ء میں پاکستان، برطانوی حکومت کے تعاون کے ذریعے بلوچ عوام کی پیشگی منظوری کے بغیر اس حکومت کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگیا۔

ایران اور پاکستان میں بلوچستان کے زبردستی انضمام کے ذریعے بلوچ عوام کے حق خودارادیت کا سوال خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق خودارادیت کیا ہے؟ اگرچہ حق خودارادیت کی بین الاقوامی تسلیم شدہ درست اور عملی تعریف کا ادراک ممکن نہیں لیکن حق خودارادیت سے یہ مراد ضرور ہے کہ دنیا کی ہر قومیت کو یہ فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس پر کس طرح حکومت کی جائے اور اس کا حاکم کون ہوگا۔ یہی عنصر جدید قوم پرستی کی روح ہے، نیز نوآبادیوں کے علاوہ نوآبادیاتی نظام سے آزادی کے لیے قومی جدوجہد اور آزادی کی تحریکوں کی بنیاد یہی عنصر ہے۔ Cobban کے نزدیک اصول حق خودارادیت وہ نظریہ ہے کہ ''ہر قوم کو ایک آزاد ریاست تشکیل دینے اور اپنی حکومت کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔''[5] علاوہ ازیں Selassie لکھتا ہے: ''حق خودارادیت کا اصول قدیم نظریات اور اصولوں سے اخذ کیا گیا ہے جن میں سے سب سے اہم نظریہ اور اصول یہ ہے کہ کسی بھی حکومت کا انحصار عوام کی رضامندی پر ہوتا ہے۔''[6] ایمرسن (Emerson) کا کہنا ہے کہ ''انیسویں صدی ہی سے یہ سمجھا جارہا ہے کہ انسان ایک قومی حیوان ہے اور جس حکومت کے متعلق وہ رضامندی ظاہر کرے گا، وہ اس کی اپنی قوم کی ہی نمائندہ ہوگی۔''[7] بہرحال، حق خودارادیت کی اصطلاح کے کئی معنی اور تشریحات ہیں۔ یورپ میں اس اصطلاح کا مطلب ''قومی حق خودارادیت'' لیا جاسکتا ہے جب کہ تیسری دنیا میں اس سے مراد ''نوآبادیاتی حق خودارادیت'' لی جاسکتی ہے۔ ''ریاستی اقوام'' میں اس کا مطلب ''اعترالی حق خودارادیت'' یا ''علیحدگی پر مشتمل حق خودارادیت'' لیا جاتا ہے۔ لہٰذا Lent کے مطابق حق خودارادیت سے مراد ''ایک بہت ہی خوش کن بلکہ نہایت ہی مبہم اصطلاح'' ہے۔[8] سیکسینا (Sexena) نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حق خودارادیت کی تعریفیں مبہم اور غیر واضح ہیں۔[9]

Scanned by CamScanner

براؤنلی لکھتا ہے: ''یہ درست ہے کہ حق خودارادیت کے اصول کی درست اور واضح تعریف آسان نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بنیادی یقینیت موجود ہے۔ یہ بنیادی یقینیت عوام کے حق پر مشتمل ہے جس کی ایک خاص خصوصیت اور خوبی ہے جو اس حکومت کی موجودگی کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے جس حکومت کے تحت عوام رہ رہے ہوتے ہیں۔[10]

قانون سازوں پر مشتمل ایک بین الاقوامی کمیشن نے حق خودارادیت کی تعریف کے ضمن میں باہمی رضامندی ظاہر کی ہے کہ ''وہ لوگ مشترکہ تاریخ، جغرافیہ، ثقافت (زبان سمیت)، مذہب یا نظریہ اور معیشت کے باعث متعدد مشترکہ خصوصیات اور خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔''[11] بہرحال ان تعریفوں میں ایک لازمی عنصر نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ ''ایک قومیت اس وقت وجود میں آتی ہے جب وہ اپنی شناخت سے آگاہ ہو اور اس کا دعویٰ ہو کہ وہ زندہ رہے گی۔''[12] ہینز کوہن (Hans Kohn) کے نزدیک یہ ادراک وفہم ''ذہن کی ایک ایسی حالت ہے جس کے تحت فرد کی وفاداری ملک یا قومی ریاست کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ دیگر اقوام سے مختلف ہونے کا ادراک اور فہم، ''حق خودارادیت'' کے مطالبے کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔''[13]

Karl Deutsch کے نزدیک ایک قومی ریاست کے قیام کے لیے ''ابلاغ'' (communication) ایک اہم عنصر ہے۔ اس کے مطابق، جو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ابلاغی رابطہ نہیں کر سکتے، وہ ایک قوم کی تشکیل نہیں کر سکتے۔''[14] ایک ''قومی ریاست'' یا ''مصنوعی'' ریاستوں میں موجود متعدد قومیتوں کے درمیان ابلاغی رابطہ کے فقدان کے باعث ان لوگوں میں حق خودارادیت کے زیادہ جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کی ''مصنوعی'' ریاست میں اقلیتی حیثیت کے باعث ظلم وستم کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ حق خودارادیت کے مقصد کے حصول کی خاطر تاریخی لحاظ سے افراد بہت سے مختلف مراحل میں سے گزرے ہیں۔ مغرب میں حق خودارادیت، اٹھارہویں صدی میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب میں سے اخذ شدہ خودمختاری کے تصور سے منسلک ہے جب مساوات اور آزادی کے تصورات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔[15]

انیسویں صدی میں خودارادیت کا تصور مارکس (Marx) اور اینگلز (Engels) کی تحریروں کے ذریعے پیدا ہوا اور بیسویں صدی میں اس تصور کو لینن (Lenin) نے مزید فروغ دیا۔ لیکن ایک امریکی دانشور، ایمرسن (Emerson) حق خودارادیت کے اظہار کا تمام تر سہرا امریکی صدر ووڈرو ولسن

Scanned by CamScanner

(Woodrow Wilson) کے سر باندھتا ہے۔ ''ابتدائی طور پر پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ووڈرو ولسن اور دیگر افراد نے بین الاقوامی اصطلاح میں حق خودارادیت کا اعلان اظہار کیا لیکن عملی مقاصد کے لحاظ سے جنگ کے بعد یورپی علاقوں میں آبادکاری پر توجہ دی۔ دوسرے یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد، یہ توجہ سمندپاران سلطنتوں کو پارہ پارہ کرنے کی طرف مرکوز ہوگئی جو ولسن کے حق خودارادیت کے تصور سے نہایت ہی موثر طور پر لاتعلق رہی تھیں۔[16]

مظلوم اور تقسیم شدہ اقوام کی طرف سے حق خودارادیت کے مطالبہ کے مستقبل کے متعلق فہم کے حصول کے ضمن میں ہم مارکسی لینن اندازِ فکر کو زیرغور رکھیں گے اور اس کا نہایت ہی مختصر انداز میں ولسن کے حق خودارادیت کے تصور کے ساتھ تقابل کریں گے۔

مارکس ازم، لینن ازم

کمیونزم، ایک غیر طبقاتی اور غیر ریاستی معاشرے کا علمبردار ہے اور قوم پرستی کو محنت کش طبقہ کے مفادات کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس لیے مارکس اور اینگلز نے 1850ء تک قومی خودارادیت کے نظریے میں کسی بھی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مارکس نے آئرلینڈ کی قومی حیثیت کے متعلق اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور زار کے زیرتسلط روس کے خلاف پولینڈ میں عوام کے حق خودارادیت کی حمایت کی۔[17]

آئرلینڈ اور آئرلینڈ کی حیثیت کے متعلق ان کے تحقیقی جائزے کے ذریعے انہوں نے حق خودارادیت کے حوالے سے عمومی اصول وضع کیے۔

شروع میں تو مارکس نے برطانوی وفاق کے اندر رہتے ہوئے ایک خودمختار آئرلینڈ کی حمایت کی لیکن بعد پھر 1960ء کی دہائی میں وہ قائل ہوگیا کہ آئرلینڈ کی آزادی انگلستان کے محنت کش طبقہ کی آزادی کی پیشگی شرط ہے۔ مارکس اور اینگلز نے واضح طور پر زور دیا کہ ''اگر کوئی قوم دوسری اقوام پر ظلم وستم کرتی ہے تو وہ آزاد نہیں ہوسکتی۔'' اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے برطانیہ اور آئرلینڈ کے زبردستی اتحاد کی بھی مخالفت کی اور برطانوی محنت کش طبقے (حاکم قوم کے افراد) سے درخواست کی کہ وہ آئرلینڈ کی آزادی کی تحریک کی حمایت کریں[18]۔

1853ء میں اینگلز نے عثمانی سلطنت کے زیرتسلط بلقان ریاستوں میں قومی حیثیت کے مسئلے کا جائزہ لیا اور عثمانی سلطنت کی تقسیم کی حمایت کی تاکہ بلقان کی مظلوم ریاستیں حق خودارادیت حاصل کرسکیں۔[19]

Scanned by CamScanner

لینن

قومی حیثیت کے موضوع پر بحث ومباحثے کے حوالے سے اپنے کردار کے ذریعے ''لینن نے قومی خودارادیت کے بنیادی نعرے کی بنیاد پر وضع کیے گئے نظریے کی خوب نشوونما کی۔''[20] روس میں بالشویک انقلاب سے قبل بھی لینن نے اس مسئلے پر توجہ مرکوز کی، یعنی 1903ء میں جب روسی مارکسٹوں کے پروگرام کا اعلان کیا گیا اور تمام اقوام کے حق خودارادیت کی حمایت کی گئی۔

سویڈن سے ناروے کی علیحدگی کی حمایت کرتے ہوئے لینن نے لکھا:

''ناروے اور سویڈن کے درمیان جغرافیائی، معاشی اور لسانی تعلقات اس قدر گہرے ہیں جس طرح روسی ریاستوں اور متعدد دیگر سلاو (Slav) ریاستوں کے درمیان تعلقات گہرے ہیں۔ لیکن ناروے اور سویڈن کے درمیان اتحاد باہمی رضامندی کے ذریعے قائم نہیں۔ ناروے کو شہنشاہ نے نپولین کی جنگوں کے دوران ناروے کے عوام کی خواہشات کے برعکس، سویڈن کے ساتھ منسلک کر دیا اور ناروے کو اپنے تسلط میں لانے کے لیے سویڈن کو اپنی فوجیں لانا پڑیں۔''[21] بہت زیادہ خودمختاری حاصل کر لینے کے باوجود (ناروے کی اپنی پارلیمان تھی وغیرہ)، زبردستی اتحاد کی کئی دہائیوں کے بعد تک بھی ناروے اور سویڈن کے مابین چپقلش جاری رہی اور ناروے کے عوام نے سویڈن کی مطلق العنان حکومت کے پنجے سے آزاد ہونے کے لیے کٹھن جدوجہد کی۔ بالآخر 1905ء میں ناروے کے عوام ایک ریفرنڈم منعقد کروانے میں کامیاب ہوگئے۔ بہت بڑی اکثریت (چند افراد کے مقابلے میں 20,000 افراد) نے سویڈن سے مکمل علیحدگی کے حق میں ووٹ دیا۔ کچھ دیر کی پس وپیش کے بعد سویڈن کی حکومت نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ سویڈن سے ناروے کی علیحدگی کے عملی جائزے کے بعد لینن نے مارکسٹوں اور انقلابیوں سے کہا، ''یہ مثال عملی طور پر ظاہر کرتی ہے کہ طبقاتی امتیاز کے شکار محنت کشوں کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ ایک منضبط پراپیگنڈا کریں اور ان اختلافات کو حل کرنے کے لیے میدان ہموار کرنے کی تیاری کریں جو اقوام کے مابین علیحدگی کے باعث ابھر سکتے ہیں۔ اس طرح ناروے اور سویڈن کے درمیان موجود اختلافات 1905ء میں حل کر لیے گئے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کے لیے بالشویک پارٹی کے پروگراموں میں موجود مطالبہ سے کیا مراد ہے۔''[22]

سویڈن سے ناروے کی علیحدگی کے عملی جائزے کے دوران اس نے سویڈن کے مارکسٹوں اور سوشلسٹوں کے فرض اور کردار کے متعلق یہ کہتے ہوئے ذکر کیا کہ ''اگر وہ ناروے کے حق خودارادیت

کے لیے اپنی بھرپور قوت کے ساتھ حاکم قوم (سویڈن) کے ساتھ نہ لڑتے تو وہ سوشلزم اور جمہوریت کے ساتھ غداری کرتے۔''[23]

مارچ 1919ء میں لینن (Lenin) نے کمیونسٹ رہنما Bukharin کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جس نے کسی بھی قوم کے حق خودارادیت کی مخالفت کی تھی۔ لینن نے پارٹی کو بتایا کہ مظلوم اقوام کے حق خود ارادیت سے انکار کے باعث مظلوم اور محکوم اقوام عدم اعتماد کا شکار ہو جائیں گی اور حاکم اقوام میں شاونیت جنم لے گی۔ فن لینڈ کے معاملے کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے کہا، ''فن لینڈ کے عوام جرمنی کی آمریت میں گرفتار رہے ہیں اور اب وہ اتحادی طاقتوں کی آمریت کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن ہم نے اس حقیقت کو اپنایا ہے کہ ہم نے اقوام کے حق خودارادیت کو تسلیم کیا ہے اور یہاں ہم نے اختلافِ رائے کے عمل کو شامل کیا ہے۔''

حق خودارادیت کے موضوع پر Bukharin کے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے لینن نے اعلان کیا، ''ہمارا منشور محنت کش طبقہ کے حق خودارادیت کا ترجمان نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ غلط ہوگا۔ ہمارے منشور کو لازمی طور پر اس چیز کا ترجمان ہونا چاہیے جو واقعی عملی طور پر موجود ہو۔ چوں کہ اقوام شاؤنزم سے بورژوائی جمہوریت کی طرف اور بورژوائی جمہورت سے پرولتاری جمہویت کی طرف جانے والی شاہراہ کے مختلف مراحل پر ہیں، ہمارے منشور کی بنیاد نہایت ہی درست ہے۔ ہر قوم کو لازمی طور پر چاہیے کہ وہ حق خودارادیت حاصل کرے جس کے باعث محنت کش طبقہ کے لیے خودارادیت کا حصول کہیں زیادہ آسان ہو جائے گا۔''[24] لینن نے مزید کہا، ''ہم یہ نہیں کہہ سکتے: ''اقوام کے حق خودارادیت پر لعنت ہے! ہم صرف محنت کش طبقے ہی کو حق خودارادیت بخشتے ہیں۔'' خودارادیت کا عمل بہت ہی پیچیدہ اور مشکل ہے۔۔۔ یہ کہیں اور نہیں بلکہ صرف روس ہی میں موجود ہے اور دیگر ممالک میں ترقی کے ہر مرحلے کا پیشگی اندازہ لگاتے ہوئے ہمیں ماسکو سے کسی فیصلے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اصولی طور پر یہ تجویز نا قابل قبول ہے۔''[25] لینن نے 22 نومبر 1919ء کو "Second All-Russia Congress of Communist Organization of the Peoples of East" سے خطاب کرتے ہوئے مشرق میں بورژوائی قوم پرستی کی حمایت کرنے کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا اور کمیونسٹوں کو زوردار انداز میں کہا کہ انہیں چاہیے کہ وہ مشرق کے استحصال زدہ اور مظلوم عوام کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔''[26]

5 جون 1920ء کو لینن نے Second Congress of the Communist

International کے لیے قومی اور نوآبادیاتی حیثیت کے موضوع پر مقالے کا مسودہ تیار کیا جس میں اس نے زور دے کر کہا کہ تمام ممالک میں موجود طبقاتی کمیونسٹ پرولتاریوں کا یہ فرض ہے کہ دنیا کی ان اقوام میں موجود زندہ رہنے کے جذبے کا احترام کریں اور اس کا خیال رکھیں جو عرصہ دراز سے ظلم وستم سہ رہی ہیں۔[27] اپنی زندگی کی آخری ایام میں وہ قومی حیثیت اور حق خودارادیت کے موضوع پر مسلسل لکھتا رہا۔ اس نے لکھا، ''کسی بھی ظالم وغاصب اور مظلوم ومحکوم قوم کے علاوہ ایک بڑی اور چھوٹی قوم کی قوم پرستی کے درمیان فرق ضرور روا رکھنا چاہیے۔ دوسری قسم کی قوم پرستی کے حوالے سے، ہم بڑی قوم کے شہری، تشدد کے بے شمار واقعات پر مبنی تاریخ اقدامات کے حوالے سے ہمیشہ سے ہی تقریباً مجرمانہ رویے کے حامل رہے ہیں۔ مزید برآں، ہم کسی بھی قوم کا لحاظ کیے بغیر اس کے ساتھ متشدد اور توہین آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں۔ میرے لیے Volga کو یاد کر لینا ہی کافی ہے کہ کس طرح روسیوں کے ساتھ سلوک کیا گیا، کس طرح لوگوں کو polyachishka کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے نہیں پکارا گیا، کس طرح تاتار (Tatar) کو پرنس (Prince) کی عرفیت سے پکارا گیا؛ اب اہل یوکرائن تو ہمیشہ Khokhols اور اہل جارجیا کے علاوہ کاکیشیا کی دیگر اقوام ہمیشہ سے ہی Kapkasians ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ظالم اور غاصب اقوام یا ''عظیم'' اقوام کی جانب سے بزعم خود بین الاقوامی قوم پرستی کا مظاہرہ (اگرچہ وہ اپنی طرف سے کیے گئے تشدد کے لحاظ سے عظیم ہیں، نیز غنڈوں کی مانند بڑی ہیں) نہ صرف اقوام کے درمیان رسمی مساوات بلکہ ایک مظلوم ومحکوم قوم میں عدم مساوات پر بھی مشتمل ہونا چاہیے۔ مزید برآں عظیم قوت کو اس عدم مساوات کی تلافی کرنی چاہیے جو وہ عملی طور پر اختیار کرتی ہے۔ جو یہ سب کچھ سمجھ نہیں پایا، وہ قومی حیثیت کے لحاظ سے حقیقی پرولتاری رویے کا ادراک نہیں کر پایا اور وہ ابھی تک اپنے اندازِ فکر کے لحاظ سے پرولتاری ہی ہے، اور اس لیے، وہ یقینی طور پر پرولتاری رویے ہی کو اپنائے گا۔''[28]

لینن نے فن لینڈ کے حق خودارادیت کو تسلیم کیا اور ناروے کے حق خودارادیت کے معاملے میں سویڈن کے سوشلسٹوں کے کردار کی تعریف کی۔ اس نے ترکوں، ایرانیوں اور عربوں وغیرہ کو تقسیم کرنے کے لیے اتحادیوں کی جانب سے تمام خفیہ معاہدوں کی مذمت کی اور کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ سوویت سفارتکاروں کو بھی ہدایت کی کہ وہ مظلوم ومحکوم اقوام کی طرف سے اپنے حق خودارادیت کے لیے لڑی جانے والی جنگ کی حمایت کریں۔ مثال کے طور پر جب اس نے وائی زیڈ سورٹس (Y.Z.

Scanned by CamScanner

(Surits کو افغانستان میں روس کا سفیر مقرر کیا تو اسے دیئے گئے کاغذات سفارتکاری جن پر لینن نے 1919ء میں دستخط کیے، میں بیان کیا گیا کہ موصوف کو یہ ذمہ داری اور اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ وہ آزاد افغانستان، آزاد (بلوچستان کے قبائل) بلوچستان کے عوام کے علاوہ اہل ہند سے بھی سفارتی تعلقات برقرار رکھے جو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔[29]

ستمبر 1920ء میں پہلی "Congress of the Peoples of the East" باکو میں منعقد ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی تمام اقوام کے حق خودارادیت کی حمایت کی جائے، نیز ایک بین الاقوامی انقلاب برپا کیا جائے۔

اس کانفرنس میں بلوچستان، کردستان، فلسطین، ایران، افغانستان اور برطانوی ہند کے وفود سمیت 2,050 وفود نے شرکت کی۔ کانگریس کا اختتام ''اہل مشرق سے درخواست'' پر ہوا کہ مشرق کو آزاد کرانے کے ایک مقدس جنگ شروع کی جائے اور وہاں کے عوام پر مسلط ظلم وستم کو ختم کرایا جائے، نیز زبان، رنگ اور عقیدے کے امتیاز کے بغیر ہر ایک کو مکمل آزادی میسر ہونی چاہیے۔''[30]

1913ء میں لینن نے سٹالن سے ''قومی حیثیت'' کے موضوع پر لکھنے کا کہا جس کے نتیجے میں سٹالن نے "Marxism and the National Question" کے عنوان سے مشہورِ زمانہ مقالہ تحریر کیا۔ یہ مقالہ لینن اور بالشویک پارٹی کے نظریات اور پالیسیوں پر مشتمل تھا۔ سٹالن نے لکھا کہ مشترکہ خصوصیات، خوبیاں، زبان، علاقہ، معاشی زندگی اور طبعی ہیت، کسی بھی ''قوم'' کی بنیاد ہیں، نیز سٹالن نے حق خودارادیت کی حمایت کی: ''حق خودارادیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی قوم اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنا طرزِ زندگی اختیار کر سکتی ہے، نیز اس قوم کو اپنی خودمختاری اور مرضی کے مطابق اپنا طرزِ زندگی تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس قوم کو بھی کسی بھی دوسری قوم کے ساتھ وفاقی اکائی قائم کرنے کا بھی حق حاصل ہے، نیز یہ قوم مکمل طور پر علیحدگی کا حق بھی رکھتی ہے۔ تمام اقوام خودمختار اور برابر ہیں۔''[31]

''قومی حیثیت'' کے موضوع پر Sverdlov University میں لیکچر دیتے ہوئے اس نے قومی تحریک آزادی کو دو اقسام ''رجعت پسند'' اور ''ترقی پسند'' میں منقسم کر دیا۔ اس نے ان تمام تحریکوں کو رجعت پسند قرار دے دیا جنہیں ''مطلقیت'' اور ''سامراجیت'' کی حمایت حاصل ہے، نیز اس نے اقوام کو ترقی پسند قرار دیا جو سامراجیت اور ظلم وستم کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ اس لیے، اس نے

Scanned by CamScanner

برطانوی سامراجیت کے خلاف افغانیوں کی جدوجہد کو ترقی پسند قرار دیا، اگرچہ اس جدوجہد کی قیادت ایک بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔[32]

بہرحال، جنوب مغربی ایشیا میں سٹالن کی پالیسیاں، مارکس ازم رلینن ازم کے خطوط پر استوار نہ تھیں۔ سٹالن اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی (سٹالن کی حمایتی) نے اسرائیل اور پاکستان جیسی ریاستوں کے قیام کی حمایت کی جن کی بنیاد مذہب تھی۔ مزید برآں سٹالن، ایرانی ظلم وستم، جسے برطانوی سامراجیت کی حمایت حاصل تھی، کے خلاف عزری ترکوں اور کردوں کی جدوجہد کی حمایت کرنے میں ناکام رہا۔ بالآخر، اس کی حکومت نے پاکستان کی طرف سے بلوچستان پر قبضے (برطانویوں کی مدد سے) کے خلاف بلوچ مزاحمتی تحریک (1948ء) کی حمایت نہیں کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سٹالن کے زیر تسلط روس کے علاوہ دیگر سوشلسٹ ممالک کا خودارادیت کے اصول کے حوالے سے کیا رویہ تھا؟ سوشلسٹ یوگوسلاویہ نے کروشیا کو اپنے سے علیحدہ ہونے کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ماؤزے تنگ کا چین خودمختاری کا علمبردار ہے لیکن وہ منگولیا (سابقہ ترکستان) اور تبت کو حق خودارادیت دینے سے انکار کرتا ہے۔[33] بہت سی ''مارکسٹ رلینسٹ'' ریاستیں، حق خوداختیاری کی بجائے خودمختاری دینے پر رضامند ہیں۔ لیکن ڈیوس (Davis) کے الفاظ میں ''خودمختاری تو مذہبی رواداری اور آزادی کی مانند ہے جسے کسی بھی وقت غصب کیا جا سکتا ہے۔''[34] مثال کے طور پر 1972ء میں سوشلسٹ عراق نے حق خودارادیت کے حوالے سے بلوچوں کے مطالبے کی حمایت کی۔ بعدازاں، پانچ برس بعد جب عراق اور ایران نے اپنے اختلافات ختم کر لیے اور ایران نے عراق میں کردوں کی حمایت نہ کرنے کا وعدہ کیا، تو پھر عراق بھی ایران اور عراق کے بلوچوں کی حمایت سے انکاری ہو گیا۔ بلوچ قوم پرست رہنماؤں کو غیر ممالک میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔

اگر بلوچ عوام کے حق خودارادیت کے حوالے سے کارل مارکس، اینگلز اور لینن کی تعلیمات ابھی بھی درست اور جائز ہیں تو پھر پاکستان کے محنت کش طبقے اور ترقی پسند قوتوں کے علاوہ ایران کی ترقی پسند قوتوں جن کا تعلق غالب قوم سے ہے، کی ذمہ داری ہے کہ وہ بلوچوں کی خودارادیت کی حمایت کریں۔ کچھ ''سوشلسٹ'' بلوچوں کے اس حق کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے ''علیحدگی پسندی'' قرار دیتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ بلوچوں کو حق خودارادیت ملنے کے باعث بلوچستان کے وہ دونوں حصے متحد ہو جاتے جن پر ایران اور پاکستان کا تسلط ہے اور اس طرح بلوچ

Scanned by CamScanner

عوام وحدت کی لڑی میں پروئے جاتے۔ لینن نے یہ اعلان کیا تھا، ''ایک سوشلسٹ جو حاکم قوم کا فرد ہے، اگر وہ زمانۂ امن یا زمانۂ جنگ کے دوران مظلوم ومحکوم اقوام کے حق خودارادیت اور علیحدگی کے حق کی حمایت نہیں کرتا، تو وہ سوشلسٹ ہے نہ ہی وہ کسی بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے بلکہ وہ شاونیت پسند ہے۔[35]

مغربی اندازِ فکر

1862ء میں لارڈ ایکٹن (Lord Acton) نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''قومیت'' میں لکھا کہ فرانسیسی انقلاب سے قبل قومیتوں کا حق خودارادیت اور خودمختاری کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا، نیز حکمران طبقے کا مفاد قومیتوں یا اقوام کی بجائے ریاستوں کی سرحدیں متعین کرنا تھا: ''قدیم یورپی نظام میں قومیتوں کے حقوق کو حکومتوں نے تسلیم کیا تھا نہ ہی عوام نے کبھی اس کا مطالبہ اور دعویٰ کیا تھا، نیز اقوام کے مفادات نہیں بلکہ حکمران طبقات اور خاندان کے مفادات ہی سرحدوں کا تعین کرتے۔[36]

قومیت کا جدید مسئلہ اٹھارہویں صدی میں پولینڈ کی تقسیم کے ساتھ پیدا ہوا۔ پولینڈ کی تقسیم نے حق خودارادیت کے اصول پر قومیت کے نظریے کو جنم دیا۔ ایکٹن (Acton) نے لکھا: ''اس طرح ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جس کا مطالبہ تھا کہ اسے ایک ریاست، ایک ایسی روح جو پہلے سے ہی اس میں موجود تھی، میں متحد ہونے کا حق اور موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنی زندگی دوبارہ شروع کر سکے۔''

یورپ کے روشن خیال طبقے نے ایکٹن (Acton) کے اس نظریہ قومیت کی حمایت کی۔ اس سے پہلے یہ نظریہ اہل پولینڈ، اہل فن لینڈ اور اہل سرب جیسی ''مہذب'' قومیتوں تک ہی محدود تھا اور ایفرو ایشیا (Afro-Asia) کی اقوام اس دائرے سے باہر تھیں۔ یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک سوشلسٹ یورپ بھی یورپ کی ''مہذب'' قومیتوں کے مسئلے تک محدود تھا۔

امریکی صدر وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) سرمایہ دارانہ ممالک کے وہ پہلے رہنما تھے جنہوں نے باقی دنیا کے لیے خودارادیت کے نظریے کی حمایت کی اور اسے اپنے 14 نکات کا حصہ بنایا: ''تمام نوآبادیاتی دعووں کی کھلے ذہن کے ساتھ اور مکمل طور پر غیر جانبدار قبولیت جن کی بنیاد قطعی طور پر اس اصول کی پیروی پر ہے جس کے تحت خودمختاری کی اس قسم کی حیثیتیں متعین کی جاتی ہیں۔ متعلقہ عوام کے مفادات بھی لازمی طور پر اس قدر اہمیت کے حامل ہونے چاہئیں جس قدر اہمیت کے اس حکومت کے دعوے اہمیت کے حامل ہیں جس کی شناخت کا تعین ابھی باقی ہے۔ فروری 1918ء میں صدر ولسن نے

Scanned by CamScanner

کانگریس کے نام اپنے پیغام میں زور دیا کہ ''قومی امنگوں کا ہر حال میں احترام کیا جانا چاہیے کیوں کہ اب اقوام کو صرف ان کی مرضی ہی سے محکوم بنایا جا سکتا ہے۔'' انہوں نے لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے منشور میں مذکور خودارادیت کی شق کی حمایت کی جسے برطانوی مخالفت کے باعث بالآخر واپس لے لیا گیا۔[37]

یواین (U.N) اور بین الاقوامی ماہرین قانون

مغربی ممالک اس اصول سے متفق ہیں اور اسے بین الاقوامی ماہرین قانون کے علاوہ اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ لیکن یہ اصول محض نوآبادیوں تک ہی محدود ہے اور ''ریاستی اقوام'' پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا۔ اقوام متحدہ کا منشور ان تقسیم شدہ اقوام کے حوالے سے حق خودارادیت کو تسلیم نہیں کرتا جن پر ''ریاستی اقوام'' کی حکمرانی ہو۔ 1971ء میں جب پنجابی حکمران اشرافیہ نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا اور اس کے جمہوری حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو پھر مشرقی پاکستان کے مطالبہ حق خودارادیت کے معاملہ اقوام متحدہ میں بھی زیر بحث لایا گیا۔ اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی اکثریت نے مشرقی پاکستان کے مسئلے کے پُرامن حل کی حمایت کی اور ساتھ ہی ساتھ اقوام متحدہ کے ایک رکن ملک، پاکستان کی علاقائی سلامتی اور یکجہتی کی بھی حمایت کی۔[38]

بہرحال، بلوچ عوام کی طرف سے حق خودارادیت کے مطالبہ کے ضمن میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک کے رویے کے متعلق کچھ کہنا بہت ہی مشکل ہے۔ بلوچستان کے معاملے کی سابقہ مشرقی پاکستان کے معاملے کے ساتھ بہت کم مشابہت ہے۔ بلوچ عوام کے حق خودارادیت کے اس قسم کے معاملے کے تاریخی پس منظر میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہوتے:

1. بلوچستان کبھی بھی برصغیر پاک و ہند کا حصہ نہیں رہا۔ اس کے برعکس یہ ایک آزاد، خودمختار ریاست تھی جسے ترکی کی عثمانی سلطنت، ایران، مسقط، اومان کی سلطنتوں کے علاوہ، درانی کے افغانستان نے بھی تسلیم کیا تھا۔
2. 1854ء اور 1876ء کے معاہدہ کے تحت برطانوی حکومت نے خانانِ بلوچستان کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔
3. 1947ء میں پاکستان کی حکومت نے خانانِ بلوچستان کی حکومت کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا۔

Scanned by CamScanner

4. 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت کی تشکیل کے لیے منظور کردہ مشہورِ عالم ''قراردادِ لاہور'' میں بلوچ عوام کی نمائندگی نہیں تھی۔

5. مسلمان بنگالیوں کے برعکس بلوچ مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا۔

6. پاکستان کے ساتھ بلوچستان کا الحاق، پاکستان کی مسلح افواج اور برطانوی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ بلوچ عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں دیا گیا۔

مندرجہ بالا نکات سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

☆ جب تک ''ریاستی اقوام'' کی طرف سے حق خودارادیت کے اصول کو تسلیم اور اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا، اس وقت تک عالمی سطح پر امن اور سلامتی کی صورتِ حال قائم نہیں ہو سکتی۔

☆ حق خودارادیت کے اصول کی قبولیت کے ذریعے محکوم اور منقسم اقوام کے لیے ان کے مستقبل کی امید کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر امن حاصل ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

باب2

قوم پرستی اور جغرافیہ

قوم پرستی کی نشوونما کے لیے ایک مخصوص علاقہ یا خطہ ایک لازمی عنصر ہے۔ بکھرے اور طبعی طور پر منتشر افراد کبھی بھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ یہ اصول اس لیے سچ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص اور مشترکہ علاقے کے حامل ہوتے اور وہ اکٹھے زندگی بسر کرتے ہیں، ان میں ان کی مخصوص تہذیب و ثقافت، مشترکہ تاریخ اور مفادات جنم لیتے ہیں۔

منگولیا کے قیام سے قبل، جب منگول کسی ایک مخصوص علاقے میں آباد نہیں تھے تو اس وقت ان کی کوئی قومیت نہ تھی۔ اگر قدرتی رکاوٹوں کے باعث ایک ملک کے علاقے الگ الگ ہو جائیں تو پھر ایک قوم کی تشکیل نہایت مشکل ہوتی ہے۔ پاکستان، اپنے منقسم محل وقوع کے باعث ایک قوم کی حیثیت سے نہیں ابھر سکا۔ اس کا مشرقی صوبہ، مشرقی پاکستان، اپنی مرکزی سرزمین سے ایک ہزار میل دور ہونے کے باعث علیحدہ ہو گیا۔ دُور افتادہ علاقوں میں رہنے سے مراد مختلف قسم کی اقوام ہیں۔

رقبہ اور محل وقوع

بلوچستان کی شناخت کے تحفظ کے ضمن میں جغرافیائی محل وقوع نے بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے جو اس وقت سیاسی لحاظ سے تین مختلف ممالک میں منقسم ہے لیکن درحقیقت طبعی طور پر ایک مکمل جامع اکائی پر مشتمل ہے۔ اس کا کُل رقبہ تقریباً 340,000 مربع میل ہے جو کئی یورپی ریاستوں سے بڑا ہے۔

بلوچستان کی قومی اور نسلی سرحدوں کے متعلق مختلف نکتہ ہائے نظر کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مطابق: ''بلوچستان کی صحیح ترین سرحدوں کا تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ عمومی طور پر بلوچستان، ایرانی سطح مرتفع کے جنوب مشرقی حصے جس کا آغاز Bam اور Bashagird کے مشرق میں صحرا کرمان سے ہوتا ہے، سے سندھ اور پنجاب کی مغربی سرحدوں پر مشتمل ہے۔''[1] انسائیکلوپیڈیا

برٹینیکا کے مطابق بلوچستان کی سرحدیں ''شمال میں شمال مشرق سے بحیرۂ عرب اور مغرب وشمال مشرق میں ایران اور افغانستان کی سرحدوں سے، مشرق میں کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے اور کٹھار کی پہاڑیوں تک ایران کے جنوب مشرقی علاقے تک پھیلی ہوئی ہیں۔[2] لارڈ کرزن (Lord Curzon) نے بلوچستان کی تعریف یوں کی تھی، ''ہلمند (Helmand) اور بحیرۂ عرب کے علاوہ کرمان اور سندھ کے درمیان واقع ملک۔''[3] اے ڈبلیو ہیوز (A.W.Hughes) کے مطابق، ''جدید قابل قبول اصطلاح کے تناظر میں بلوچستان کو عمومی لحاظ سے ایک ایسا ملک کہا جاسکتا ہے جس کے لیے اس کی شمالی اور شمال مشرقی سرحدیں افغانستان کی ایک بہت بڑی سلطنت پر مشتمل ہیں، اس کی مشرقی سرحد سندھ کے برطانوی صوبے اور اس کی مغربی سرحدیں ایرانی سلطنت تک محدود ہیں جب کہ بحیرۂ عرب اس کے تقریباً چھے سو میل علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔ بہرحال اسے بلوچستان کی سرحدوں کے متعلق ایک عمومی بیان کہا جاسکتا ہے۔''[4] ڈیمز (Dames) نے یوں تبصرہ کیا ہے: ''جدید سیاسی سرحدوں سے قطع نظر بلوچستان، ایرانی بلوچستان، خانانِ قلات، ڈیرہ غازی خاں کے برطانوی ضلع (ملحقہ پہاڑی سلسلے کے ساتھ) جیکب آباد اور جہاں تک دریائے سندھ کا تعلق ہے، شکارپور کے کچھ حصے پر مشتمل ہے۔''[5] ڈیویز (Davies) افغانستان کے پشتونوں اور پاکستان کے بلوچوں کے درمیان نسلی سرحد کو یوں بیان کرتا ہے: ''بلوچستان اور سرحدی صوبہ کے درمیان سرحد نسلی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ نسلی سرحد، تھل چھوٹیالی اور بی سے چمن میں سے گزرتی ہوئی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں شادون شہر کے نزدیک پٹھانوں اور بلوچوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔''[6] میجر ریورٹی (Major Raverty) نے یہ کہتے ہوئے بلوچستان کی حدود کے ضمن میں ''سائرہ البلاد (Sair-ul-Bilad) کا حوالہ دیا ہے، ''اس کی سرحد ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال میں تقریباً 10 کوروہ (Kuroh) نمک کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع پہاڑپور سے پھیلی ہوئی ہے اور سمندر کی طرف ڈیرہ جات (Derha-Jat) بھی اس میں شامل ہے۔[7]

خلاصۃ التواریخ (Khulasatul-Tawarikh) کے مصنف سجن رائے بٹالوی، اپنے نقطہ نظر کا یوں اظہار کرتا ہے، ''بلوچستان اور مغل ہندوستان کے درمیان بطور مشرقی سرحد دریائے چناب۔''[8] خان قلات (75-1840) میر ناصر خان دوم سے ان کے دربار میں برطانوی اور افغانی وفود نے جب بلوچستان کی سرحدوں کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا، ''میرے جدامجد اور میرے ہم نام ناصر خان نوری نے کافی عرصہ قبل اسی سوال کا جغرافیائی اصطلاح میں جواب دیا اور میں اسی جواب کو

Scanned by CamScanner

دہراتا ہوں،''وہ تمام علاقے جہاں بلوچ آباد ہیں،وہ ہمارے ملک کالازمی حصہ ہیں۔''[9] حکومت ہندوستان کے سیکریٹری خارجہ سرتھارنٹن (Sir Thornton) نے خانانِ قلات کے زیرتسلط بلوچستان کے علاقے کے متعلق یوں بیان کیا ہے،''اس علاقے کووادی سندھ کے مغرب میں ایک پہاڑی علاقہ کہا جاسکتا ہے جس کے شمال میں افغانستان،مشرق میں سندھ اور پنجاب،مغرب میں ایران اور جنوب میں بحیرۂ عرب واقع ہیں۔اس (قلات) کا رقبہ سوئٹزرلینڈ کے رقبے سے دس گنا اور اس کا ساحلی علاقہ تقریباً600 میل تک پھیلا ہوا ہے۔''[10]

رابرٹ سنڈیمن (Robert Sandeman) نے 10اپریل 1872ء کولکھا،''خانانِ بلوچستان کی حکومت میں ہماری طرف سے مداخلت سے پہلے اس کی سرحدیں شمال میں شالکوٹ یا جیسا کہ ہم اسے کوئٹہ کہتے ہیں،مکران کے ساحلی علاقے،مغرب میں خاران اور پنجگور سے پرے ایران کی سرحد سے مشرق میں سندھ اور پنجاب تک پھیلی ہوئی تھیں۔''[11] ایرانی مصنفین کے بیان کے مطابق مغربی بلوچستان شمال میں Central Kawir،جنوب میں بحیرۂ اومان،مشرق میں پاکستان اور مغرب میں ایرانی صوبے کرمان تک پھیلا ہوا ایک ملک ہے۔[12] محمد سردار خان کا خیال ہے کہ بلوچستان کا نقشہ،روسی سرحد پر سراخس (Sarakhs) سے گن آباد،مشہد اور پھر سیدھا بم پور،رامیش اور آخر میں بندرعباس،اسی راستے پر واقع مشرق کی طرف افغانستان کے بلوچ علاقے اور مکران پر مشتمل ہے۔''[13] قوم پرستوں کی طرف سے شائع کیے گئے بہت سے دیگر نقشے بھی کم وبیش سردار خان کے بیان کردہ نقشوں کے مطابق ہی علاقوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔یہ بات نہایت دلچسپی کی حامل ہے کہ ان میں سے بہت سے نقشے لارڈ کرزن کے سفرایران کے درمیان حاصل کردہ معلومات پر مشتمل ہیں۔

اکثرقوم پرست فراموش کردیتے ہیں کہ مشرقی خراسان ایک کثیرالاقوامی علاقہ ہے جو بلوچ،ترکمان اور دیگر تمام نسلی گروہوں پر مشتمل ہے۔[14] یہی کلیہ افغانستان میں ان کے فرح (Farah) پر دعوے پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ایک محتاط تحقیقی جائزے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بلوچستان ایک مشترکہ خطے،تاریخ،تہذیب وثقافت اور زبان کی بنیاد پر مندرجہ ذیل علاقوں پر مشتمل ہے:

سندھ اور حب کے دریا اور کرتھر (Kirthar) کے پہاڑ بلوچستان اور ہندی برصغیر کے درمیان ایک قدرتی سرحد تشکیل دیتے ہیں؛شمال مشرق میں کوہ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ اور دریائے گومل، بلوچستان کو پاکستان کے پشتونوں سے علیحدہ کرتے ہیں جب کہ مغربی بلوچستان،فارسی بولنے والے

Scanned by CamScanner

ایران کے مرکزی علاقے سے دشت لوط اور دشت کاویر سے علیحدہ ہو جاتا ہے، جنوب میں خلیج اومان اور خلیج فارس عربوں اور بلوچوں کو علیحدہ کرتے ہیں، شمال مغرب میں راجستان کا صحرا اور پہاڑ، افغانیوں اور بلوچوں کے درمیان قدرتی سرحد کی تشکیل کرتے ہیں۔[15]

طبعی طور پر بلوچستان وسطی ایشیا کی سطح مرتفع کا ایک حصہ ہے۔ یہ حقیقت سیاسی مؤرخین، دانشوروں اور قانونی ماہرین کی تحریروں میں تسلیم کی گئی ہے۔ ایک برطانوی سیاسی اہلکار ایڈورڈ ویکفیلڈ (Edward Wakefield) نے بلوچستان کا سفر کیا اور بلوچستان کے موسم اور جغرافیائی محل وقوع کے متعلق مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا: ''ہم ریل کے ذریعے کراچی سے شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دو انجن ہماری ریل گاڑی کو کھینچتے ہوئے درہ بولان سے لے کر گزر رہے تھے تو اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ اپنے ڈبے کی کھڑکیوں سے لالیج (Lalagg) اور مجھ پر ایک نئی دنیا آشکار ہو رہی تھی، یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اس سے قبل ہندوستان میں ہم نہیں دیکھی تھی۔ یہاں ناہموار، بنجر، چٹیل اور سورج کی تپش سے جھلسے ہوئے پہاڑ تھے جہاں جا بجا تنگ گھاٹیاں اور درے واقع تھے۔ صبح صادق کی دھندلی روشنی میں سورج کی ابتدائی کرنوں میں لپٹے یہ پہاڑ نہایت ہی خوبصورت اور مانوس معلوم ہو رہے تھے۔ یہاں کی ہوا بھی ہندوستان کی ہوا سے مختلف تھی لیکن وسطی ایشیا کی سطح مرتفع سے مختلف نہیں تھی۔ اس قسم کے ماحول میں یہ ہوا ہماری سانسوں کو نہایت فرحت بخش بنا رہی تھی۔[16]

1964ء میں خان کے قانونی مشیر، کیبنٹ مشن کو ایک یادداشت پیش کی جس میں جغرافیائی بنیادوں پر برطانوی ہند سے بلوچستان کو علیحدہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا! جغرافیائی طور پر قلات، ہندوستان کی علاقائی حدود میں شامل نہیں۔

شمال کی طرف سے یہ کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے جنوبی پشتے کی بھاری رکاوٹ کے باعث ہندوستان سے علیحدہ تھا۔ جنوب میں ناقابل یقین حد تک پھیلا ہوا جنگلی مضافاتی علاقہ تھا جس کے سامنے سندھ کا صحرا تھا جس کے دامن میں ہندوستانی سرحد تشکیل پذیر ہوتی تھی۔ بلوچوں کی یہ سرزمین اور چونے کے پتھر سے تعمیر شدہ سرحدی رکاوٹ، ہندوستانی سرحدی علاقوں کی ترتیب کے لحاظ سے نہایت ہی نمایاں خصوصیت کی حامل تھی۔[17]

بہت سے پاکستانی دانشور تسلیم کرتے ہیں کہ بلوچستان جغرافیائی لحاظ سے برصغیر پاک و ہند کا نہیں بلکہ وسطی ایشیا سطح مرتفع کا حصہ ہے۔[18] اسی طرح مغربی بلوچستان فارسی بولنے والے اس ایران

Scanned by CamScanner

سے بھی علیحدہ ہے جہاں فارسی بولی جاتی ہے۔ جہاں تک جغرافیائی محل وقوع کا تعلق ہے، ڈبلیو کوٹم (W.Cottam) ایرانی قوم پرستی کی کمزوریوں کو تسلیم کرتا ہے۔ کوٹم لکھتا ہے، ''موسم اور جغرافیائی حالات کے باعث ایرانی قوم پرستی کے فروغ کو روک دیا۔ ناقابل تسخیر تکون کے باعث ایران کے وہ حصے سطح مرتفع کے علاقوں سے علیحدہ ہوگئے جو اس تکون کے ضلعوں کے باہر واقع ہیں۔ ختستان، کیسپی کا ساحلی علاقہ، خورستان، سیستان اور ایرانی بلوچستان، یہ تمام علاقے اس تکون سے باہر واقع ہیں اور یہ کافی حد تک مرکزی حکومت کو مسترد کر سکتے تھے۔[19]

قدرتی رکاوٹیں بہت سے ممالک کی آزادی برقرار رکھنے کے ضمن میں مفید ثابت ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر مشکل پہاڑی علاقوں اور موسم کے باعث افغانی برطانوی حملوں سے اپنی آزادی کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اسی طرح سعودی عرب اور منگولیا کے ممالک اپنے پہاڑوں اور صحراؤں کے باعث حملوں سے محفوظ رہے ہیں۔

عین اسی طرح بلوچستان بھی اپنے مشکل پہاڑی علاقوں اور صحرائی سلسلے کی وجہ سے مستقل غیر ملکی تسلط سے محفوظ رہا ہے۔ ایرانیوں، عربوں، ترکوں، افغانیوں اور برطانویوں کو اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ساتویں صدی میں خلیفہ عثمان کو بلوچستان میں مشکل ذرائع مواصلات اور سخت موسم سے خبردار کیا گیا۔ ایک عرب گورنر، سینان بن سلمہ کو لاحق خوف سے بھی یہ حقیقت محسوس کی جا سکتی ہے جس نے لکھا، ''تم نے مجھے مکران (بلوچستان) جانے والی وہ سڑک دکھلائی لیکن ایک حکم اور اسے تسلیم کرنے میں بہت فرق ہے۔ میں اس ملک میں کبھی بھی داخل نہیں ہوں گا جس کا صرف نام ہی مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔''[20]

وہ جغرافیائی خصوصیات جن کی وجہ سے بلوچستان بیرونی تسلط سے خود کو محفوظ رکھنے اور اپنی جداگانہ شناخت قائم رکھنے میں کامیاب رہا، انہی خصوصیات کی بنا پر بلوچستان، قلات میں ایک مرکزی حکومت کے قیام کی روک تھام کر سکا جس کے باعث یہ حکومت بہت عرصہ تک علاقوں پر قبضہ نہ کر سکی۔

دودائی سرداروں اور خانانِ قلات نے ان قدرتی رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے مواصلاتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ مواصلاتی نظام کے فقدان کا ہی نتیجہ تھا کہ 1839ء میں جب برطانوی فوج نے قلات پر حملہ کیا تو وہ بلوچ قبائل کو بروقت اکٹھا کرنے میں ناکام رہے۔[21]

Scanned by CamScanner

برطانوی استعماری حکومت کے عروج کے زمانے میں سٹریٹجکل علاقوں میں ریلوے لائنیں اور سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ بلوچستان کو برطانوی ہند، ایران اور افغانستان کے ساتھ منسلک کردیا گیا۔ بیسوی صدی کے آغاز میں ریلوے لائن کی کُل لمبائی 399 میل تھی۔ نوشکی ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہونے سے جو 1905ء میں مکمل ہوئی، ریلوے لائن کی لمبائی میں 481 میل کا اضافہ ہوگیا۔ 1903ء میں سڑک اور راستے 1,128 میل پر مشتمل تھے۔[22]

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک کو فوجی ساز و سامان فراہم کرنے کے لیے نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ قوم پرستی کے لحاظ سے بلوچستان کے قوم پرست مواصلاتی نظام کے کردار سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب 1932ء اور 1933ء میں بلوچ نیشنل کانفرنسیں منعقد ہوئیں تو نئی سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ ڈاک خانے کھولنے کا مطالبہ کیا گیا۔[23]

بہرحال، قوم پرستوں کے ایک اور گروہ نے جدید مواصلاتی نظام کی تعمیر کی اس بنیاد پر مخالفت کی کہ اس کے باعث طاقت ور دشمنوں کو بلوچستان پر حملہ اور اس پر قبضہ کرنے کا موقع ملے گا۔[24] لیکن مکسیوں کی زیرِ قیادت قوم پرستوں کے گروہ نے اس بنیاد پر مواصلاتی نظام کے قیام کے حمایت کی کہ اس کے باعث بلوچ عوام کو جدید خیالات، نظریات اور ترقی سے منسلک ہونے کا موقع ملے گا۔[25] بہرحال، جب برطانوی بلوچستان سے رخصت ہوئے تو یہاں محض فوجی مقاصد کے لیے ایک محدود مواصلاتی نظام موجود تھا۔

موسم اور آبادی

یہاں بارش ایک سال میں کبھی پانچ یا چھے انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پانی کی فراہمی کا واحد ذریعہ چند آبی رود بار ہیں جو پہاڑی ڈھلانوں کو کھود کر بنائی جاتی ہیں اور ان میں پگھلی ہوئی برف کا پانی گرتا ہے۔ ان رود باروں کو قنات یا کاریز کہا جاتا ہے۔[26] دریائے سندھ اور ہلمند کے علاوہ تقریباً تمام دریا موسمی ہیں۔ بلوچوں کی زیادہ تر آبادی ڈیرہ جاٹ، بالائی سندھ اور سیستان کے علاقوں میں رہتی ہے جو دریائے سندھ اور ہلمند کے ذریعے سیراب ہوتے ہیں۔ ملک کے بقیہ حصے کی آبادی قناتوں (Qanats) کے ذریعے سیراب ہونے والے علاقے اور موسمی دریاؤں کے کناروں پر رہتی ہے۔

پانی کی قلت کے باعث بلوچستان کا تین چوتھائی سے زیادہ رقبہ بنجر صحرا اور چٹیل پہاڑوں پر

Scanned by CamScanner

مشتمل ہے۔ بہت سے بلوچ حکمرانوں، مثلاً ڈیرہ جاٹ کے دودائی کے حکمرانوں اور میر ناصر خان اعظم نے دریاؤں سے نہریں کھودنے اور بندوں کی تعمیر کے ذریعے نظام آبپاشی تشکیل دینے کی کوشش کی۔[27]

برطانوی عہدِ حکومت میں بعض علاقوں مثلاً خان گڑھ (جیکب آباد) اور ڈیرہ جاٹ میں نہریں کھودی گئیں تا کہ زرعی زمینوں پر قبائل کو آباد کیا جائے تا کہ ان کے حملے رک سکیں۔[28] پاکستان اور ہندوستان کے برعکس، بلوچستان مون سون کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔ پہاڑی علاقوں میں اکتوبر اور مارچ کے مہینوں جب کہ میدانی علاقوں میں جولائی اور اگست میں بارشیں ہوتی ہیں۔ جہاں تک موسم کا تعلق ہے، موسم گرما میں شدید گرمی اور موسم سرما میں شدید سردی ہوتی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں موسم گرما خوشگوار جب کہ موسم سرما انتہائی سرد ہوتا ہے۔ پانی کی قلت اور درجہ حرارت میں تغیرات نے عوام کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلوچ زندگی نیم خانہ بدوشانہ ہے۔ موسم سرما میں بلوچ عوام کی اکثریت پہاڑوں اور وادیوں میں رہتی ہے جہاں یہ لوگ پھل اُگاتے ہیں اور اپنے جانوروں کو چراتے ہیں۔ موسم سرما میں بلوچ عوام میدانی اور ساحلی علاقوں کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں جہاں وہ آبپاشی کرتے ہیں۔ پانی کی قلت نے بلوچستان کو یہاں رہنے والی مختلف آبادیوں کے لحاظ سے متاثر کیا ہے۔ چودھویں صدی سے ہی بلوچستان سے مختلف قبائل ہندی برصغیر، سوویت یونین، مشرقی افریقا اور خلیج فارس کی عرب ریاستوں کی طرف ہجرت کرتے رہے ہیں۔

1930ء میں جب بلوچ نیشنل تحریک کا آغاز ہوا تو بلوچ عوام کی اکثریت بلوچستان کی

A.	انتظامی بلوچستان:	آبادی
	(موجودہ پاکستان کا حصہ)	834,703
B.	برطانوی ہند:	
	(i) پنجاب۔ اجمیر اور راجپوتانہ	469,393
	(ii) سندھ۔ بمبئی	596,094
	(iii) شمال مغربی سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی)	47,185
	(iv) شمال مغربی سرحدی ہند	57

1941ء میں بلوچ قوم پرست قائدین کے دعوے کے مطابق بلوچ عوام کی آبادی یوں تھی:[30]

	بلوچ علاقے	آبادی
1.	انتظامی بلوچستان	1,000,000

Scanned by CamScanner

(برطانویوں کے بلاواسطہ زیرتسلط)

.2	مغربی بلوچستان	
	ایرانی حصہ	500,000
	افغان حصہ	500,000
.3	برطانوی ہند	
	(پنجاب، سندھ)	2,700,000
	کُل بلوچ آبادی	4,700,000

بلوچستان کے حوالے سے سرکاری مردم شماری کی مختلف اطلاعات کے ذریعے آبادی کے متعلق مختلف اعداد و شمار فراہم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اطلاعات (سرکاری یا قوم پرست) بہرحال متفق ہیں کہ بلوچ عوام کی اکثریت بالائی سندھ اور ڈیرہ جاٹ سمیت عظیم تر بلوچستان کی نسلی سرحدوں پر رہائش پذیر تھی جس کے متعلق نیشنل موومنٹ کا دعویٰ تھا اور ہے کہ یہ بلوچستان کا حصہ ہیں[31]۔ عوام کی ہجرت کے قوم پرستی پر منفی اور مثبت اثرات مرتب ہوئے:

(i) وہ بلوچ قبائل جو سندھ اور پنجاب کے اندرونی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے، وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن میں ڈھل گئے۔ ان بلوچوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔

(ii) وہ بلوچ جو بالائی سندھ، کراچی اور ڈیرہ جاٹ میں رہتے تھے، انہوں نے اپنی تہذیب و ثقافت برقرار رکھی۔ بالفاظ دیگر، انہوں نے اپنے آباواجداد کی سرزمین سے تعلق قائم رکھا۔ انجمن (بلوچ نیشنل موومنٹ 1935-1930ء) نے بالائی سندھ، کراچی اور ڈیرہ جاٹ کے بلوچوں سے مالی معاونت حاصل کی جنہوں نے قومی معاملات کے حوالے سے خود کو جماعت اور اس کے اخبارات کے لیے مکمل طور پر وقف کر دیا۔

1933-1948ء کے برسوں میں بلوچوں کو متحد کرنے کے لیے بلوچ قوم پرستوں نے مطالبہ کیا کہ تہذیبی و ثقافتی، نسلی، جغرافیائی اور تاریخی بنیادوں کے باعث جیکب آباد اور ڈیرہ جاٹ کے برطانوی اضلاع کو بلوچستان میں شامل کیا جائے۔[32] مگسی نے 1934ء میں ان بلوچوں کے حوالے سے قوم پرستوں کے متعلق اپنی پالیسی کی وضاحت کی جو برطانوی ہند میں رہ رہے تھے: ''ایک آزاد بلوچستان تمام بلوچوں کو دعوت دے گا کہ وہ اپنی آبائی سرزمین واپس آجائیں اور ہم ان کی آبادکاری

Scanned by CamScanner

میں ان کی مدد کریں گے۔"[33] مغربی بلوچستان میں بلوچوں کی اکثریت، بلوچستان/سیستان کی انتظامی حدود میں رہ رہی تھی۔"[34]

1944ء میں جنرل مونی (General Money) نے ایک خفیہ یادداشت/مراسلے میں لکھا کہ اگر بلوچستان میں موجود زرعی وسائل وذرائع کو استعمال کیا جائے تو یہ ایک عملی ریاست کا روپ دھار سکتی ہے۔[35] پاکستان سے الحاق کے بعد پاکستانی حکومت نے بلوچستان میں اس کے وسائل و ذرائع کے استعمال اور ہندی مسلمان پناہ گزینوں کو یہاں بسانے کے لیے بلوچستان کو ترقی دینے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس مقصد کے لیے حکومت پاکستان نے لاس اینجلس (امریکا) کے ایک ادارے جانسٹن انٹرنیشنل کے شعبہ واٹر ڈویلپمنٹ سے بلوچستان کو ترقی دینے کے ایک منصوبہ کی تشکیل کے لیے رابطہ کیا۔ امریکی ماہرین کو اس منصوبہ کی تیاری کے ضمن میں مخصوص اعداد وشمار درکار تھے۔ یہ اعداد وشمار حکومت کے کئی محکموں سے حاصل کیے گئے۔

1952ء میں پاکستان کی وزارت برائے معاشی امور، مانک بی پتھاوالا (Maneck B.Pathawalla) نے سرکاری اداروں سے حاصل کردہ اعداد وشمار کی بنیاد پر ایک مقالہ شائع کیا جس میں بلوچستان میں ترقی کے امکانات پر بحث کی گئی تھی۔ پتھاوالا نے لکھا:

"خوش قسمتی سے بلوچستان میں موجود چٹانیں پانی کو محفوظ رکھنے میں کسی حد تک مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ اگرچہ بلوچستان میں بارشوں کی کمی ہے اور مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں بارشیں ہوتی ہیں، نیز مختلف علاقوں کی زمین بھی انتہائی بنجر قسم کی ہے لیکن کچھ چٹانیں اس قدر کھوکھلی ہیں کہ ان میں سے گزر کر زیر زمین موجود قیمتی مائع تک پہنچا جا سکتا ہے۔ زمین کے نیچے کچھ ایسے قدرتی ذخائر موجود ہیں جنہیں سائنسی انداز میں نکالنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت، قدرت ہی پانی کی محافظ ہے اور اسے تلاش کرنے کے لیے انسان کو اپنی مدد آپ کرنی ہوگی۔ فراہمی آب میں بے قاعدگی اور نامعقولیت کو باقاعدگی اور معقولیت میں بدلنا ہوگا تاکہ بلوچستان محض دوسروں کی مدد کا محتاج نہ رہے بلکہ مناسب اور معقول انداز میں پاکستان کے لیے مفید ثابت ہو سکے:

1. اس کی آبادی بے حد کم جب کہ رقبہ بہت زیادہ ہے، اس لیے پاکستان کے زیریں ترین بڑے رقبے پر دوبارہ آبادکاری اور اس کا مناسب انتظام کرنے، خاص طور پر پناہ گزینوں کی آبادکاری کا بہترین موقع میسر ہے۔

Scanned by CamScanner

2. اس کی خشک دریائی وادیاں اور چشمے، آبی وسائل کے لحاظ سے مالا مال ہیں، اس لیے جدید سائنسی طریقوں کے ذریعے آبپاشی اور کاشت کاری میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بلند و بالا پہاڑوں کے ذریعے برف کی کچھ مقدار کی صورت میں پانی کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر متعدد دریائی وادیوں اور آبی رود باروں میں واقع زمینیں اس قدر زرخیز ہیں کہ صرف ایک ہی ترقیاتی منصوبے، یعنی، انمبر اریگیشن سکیم (Anambar Irrigation Scheme) کے ذریعے فاضل ایک لاکھ ایکڑ زمین کو مستقل طور پر زیر کاشت لایا جاسکتا ہے۔

3. یہ بحیرۂ روم کے مخصوص علاقے کی آب و ہوا کی وسیع پٹی کے کنارے پر واقع ہے جس کے باعث موسم سرما کی کچھ بارش اپنے اندر سمو لیتا ہے جس کے نتیجے میں یہ پھل پیدا کرنے والا اوّل درجے کا ملک بن جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں پھلوں کے نئے باغوں کے قیام کی منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے، نیز پھلوں کو محفوظ کرنے کے کچھ کارخانوں کے قیام کے ذریعے پھلوں کی تجارت کو بہت زیادہ حد تک فروغ دیا جاسکتا ہے اور یوں محض باغبانی کا شعبہ، بلوچستان کو فاضل پھل پیدا کرنے والا صوبہ بنایا جاسکتا ہے۔

4. جن علاقوں میں درخت نہیں اگتے، وہاں پانی کو محفوظ کرنے کے ذریعے کم از کم سال کے زیادہ تر حصے میں بھرپور گھاس اگ سکتی ہے تاکہ بلوچستان ملک کی ایک منفرد چراہ گاہ بن جائے، نیز ہم گھاس اور بکریوں کے درمیان ہونے والی جنگ جیت سکیں۔

5. نصب سے زیادہ زمین بھیڑوں اور بکریوں کے چرنے کے لیے بہت ہی مناسب ہے۔ اس کے نتیجے میں بلوچستان کھال اور اون پیدا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرسکتا ہے۔ اس علاقے میں پہلے ہی سالانہ 300,000 من اون پیدا ہوتی ہے۔

6. پاکستان کے تمام صوبوں میں بلوچستان میں معدنیات، مثلاً کرومائٹ، کوئلہ اور پٹرولیم کے بہت وسیع ذخائر موجود ہیں۔ خام رکچ دھات نکالنے کے مناسب طریقوں کے ذریعے پانی بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے اور یوں پاکستان کی صنعتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا جاسکتا ہے۔

7. اس کا طویل ساحلی علاقہ صنعت ماہی پروری کے لیے بہت ہی کارآمد ہے لیکن اگر لسبیلہ اور مکران کی مقامی آبادی کو دوبارہ تازہ پانی مہیا کیا جائے جو یونانی مؤرخین کے مطابق ماہی گیروں کے قدیم نسل سے ہیں جسے Ikhthyopagoi کہتے ہیں، تو پھر ساحلی علاقے کو مزید ترقی دی جاسکتی ہے۔

Scanned by CamScanner

8. اس کی تمام سرحدیں سائنسی انداز کی نہیں، نیز پشین، لورا، قندر اور مخیل جیسی وادیاں، بین الاقوامی نوعیت کی حامل ہیں۔ اگر دفاعی لحاظ سے ان وادیوں کو ترقی دی جائے اور فراہمی آب کو یقینی بنایا جائے تو پھر سالانہ اخراجات میں قابل قدر کمی کی جاسکتی ہے۔

9. بلوچستان، پاکستان کا واحد صوبہ ہے جہاں دیگر تمام صوبوں کی نسبت ہل سٹیشن اور صحت افزا مقامات قائم کرنے کے وسیع مواقع میسر ہیں۔ اس کے مواصلاتی نظام، خاص طور پر ہوائی اڈوں میں توسیع کے ذریعے سیاحتی تجارت کو بہت زیادہ ترقی دی جاسکتی ہے۔

''لیکن ان امکانات اور مواقع کا انحصار پانی اور محض پانی پر ہے۔ ہر حال میں تازہ پانی محفوظ کرنا ہوگا۔ مسئلہ زیادہ تر قدرتی جغرافیائی نوعیت کا ہے اور اس کے مطابق ہی اسے حل کرنا ہوگا۔ اس قسم کے خشک خطے میں ہمیں دیگر ذرائع پر بھی انحصار کرنا ہوگا، مثلاً صوبہ بھر کے میدانوں اور وادیوں میں زیر زمین تازہ پانی کے ذخائر کی تلاش کرنی ہوگی۔

''فراہمی آب کے مسئلے کے ساتھ ساتھ زمین کی زرخیزی کم ہونے یا زمین کو محفوظ کرنے کے علاوہ شجر کاری بھی بہت اہم مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسا موذی اور ضرر رساں چکر ہے جس کو کسی بھی قیمت پر ٹوٹنا ہوگا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بلوچستان کے مسئلے کے حل کا انحصار مندرجہ ذیل امور پر ہے:

(1) پانی کو محفوظ کیا جائے۔

(2) زمین کو محفوظ کیا جائے۔

(3) نباتاتی اراضی کو فروغ دیا جائے۔''[36]

سٹریٹجک اہمیت

بلوچستان کی سٹریٹجک اہمیت نے بلوچ قوم پرستی پر مثبت اور منفی اثرات مرتب کیے اور ابھی بھی یہی صورتِ حال ہے۔ خلیج فارس، اومان میں اپنے 700 میل طویل ساحلی علاقے[37] پر مشتمل ہے۔ اپنے سٹریٹجک محل وقوع کے باعث استعماری اقتدار کے آغاز ہی سے یہ علاقہ مغرب کی تجارت کے لیے اہم رہا ہے۔ اس کی سٹریٹجک اہمیت بلوچ قوم پرستوں کو ملک کو آزاد کرانے کے ضمن میں بڑی طاقتوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ "Great Game" کے دوران، برطانویوں کی جانب سے بلوچستان پر قبضے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بحیرۂ عرب میں بلوچ ساحل کی طرف روسیوں کی پیش قدمی روکی جائے۔[38]

Scanned by CamScanner

دونوں جنگ ہائے عظیم کے دوران برطانویوں نے روسیوں کو اس لیے مغربی بلوچستان پر اپنے قبضے میں شریک نہیں کیا کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ روسی گرم پانیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ 1928ء میں برطانویوں نے مغربی بلوچستان میں میر دوست محمد بارانزائی کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ مبینہ طور پر اس کے روسیوں کے ساتھ تعلقات تھے۔[39]

1944ء میں جنرل مونی (General Money) نے بلوچستان کی آئینی حیثیت کا جائزہ لینے کے بعد اس کی آزادی کی حمایت کی۔[40] بہر حال 1947ء میں انگریزوں نے بلوچستان کی آزادی کی مخالفت کی اور پاکستان کو بلوچستان پر قبضہ کرنے کی شہ دی تا کہ قوم پرستوں کے علاوہ استعمار مخالف یا اپنے روسی مخالفین کو کچل دیا جائے۔[41]

تقسیم

اپنے آغاز ہی سے قوم پرستی کو ''بین الاقوامی'' سرحدوں کو سامنا کرنا پڑا ہے جس کے باعث بلوچوں کو پاکستان، ایران اور افغانستان کے ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔

اس مسئلے کی جڑیں Baluch(1 Perso- 1871 اور 1895- 1905)، سیستان (1872-1896) اور بلوچ افغان (1895) سرحدوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔[42]

ان سرحدوں کی نشاندہی نے مسئلے کو مزید گمبھیر بنا دیا اور اس کی سنگینی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ 1930ء میں بلوچ قوم پرستی کے عروج کے ساتھ ہی بلوچ، ایران، افغانستان اور اس وقت کے برطانوی ہند میں تقسیم ہو گئے۔

بہت سی واضح وجوہ کے باعث بلوچوں کے حق خود ارادیت غصب کرنے کے ضمن میں پاکستان اور ایران کے مفادات مشترک تھے اور انہوں نے اس مقصد کی خاطر ایک مشترکہ حکمت عملی اختیار کی۔ افغانستان، ایران اور پاکستان کی حکمت عملیوں میں کبھی بھی شریک نہیں ہوا لیکن اس نے بلوچستان پر ملکیت کا اپنا دعویٰ کر دیا جو اس کی طرف سے پشتونستان کے مطالبے کا ایک حصہ تھا۔[43] ایک بین الاقوامی سرحد کی حیثیت سے بلوچ اور افغانی پٹی افغانیوں کے باعث متنازع قرار پائی جن کا خیال ہے کہ انگریزوں نے پاکستان کے ساتھ ان کی سرحد متعین کی اور افغانیوں کو اسے زبردستی قبول کرنا پڑا۔[44]

مسئلے کی پیچیدگی کو سمجھنے کے لیے بلوچستان کی تقسیم اہم نوعیت کی حامل ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس ضمن میں موجود تاریخی حالات کے متعلق آگہی حاصل کی جائے۔ جنوب مغربی ایشیا، وسطی ایشیا

Scanned by CamScanner

اور جنوبی ایشیا کے تجارتی راستوں پر قبضہ کرنے کے حوالے سے بلوچستان، ایران اور افغانستان کی سٹریٹجک حیثیت، انیسویں صدی کے وسط اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایشیا کی دو بڑی سلطنتوں کے جغرافیائی اور سیاسی توسیع کے تناظر میں برطانویوں اور روسیوں کے لیے نہایت اہمیت اختیار کر گئی۔

1854ء میں برطانیہ نے وسطی ایشیا اور ایران کی طرف سے بیرونی حملوں سے دفاع کرنے کی خاطر بلوچستان کے حکمران، خان کے ساتھ ایک معاہدے طے کیا۔ اس وقت ایرانی حکمرانوں نے جو روسیوں کے ہاتھوں اپنے شمالی صوبے گنوا چکے تھے، بلوچستان کے ضمن میں ایک توسیع پسندانہ حکمت عملی اپنائی تاکہ اپنے گنوائے ہوئے علاقوں کی تلافی کی جاسکے۔ بہرحال، 1870ء میں برطانوی حکومت، خانانِ بلوچستان کے ساتھ سرحد کی نشاندہی پر رضامند ہوگئی۔ 1871ء میں برطانوی حکومت نے ایرانی تجویز منظور کرتے ہوئے میجر جنرل گولڈزمڈ کو Joint Perso-Baluch Boundary Commission کا چیف کمشنر مقرر کیا جب کہ ایران کی نمائندگی مرزا ابراہیم، خانانِ قلات کی نمائندگی سردار فقیر محمد بزنجو، گورنر مکران کے سپرد کی گئی۔[45]

بلوچ وفد نے مغربی بلوچستان کی حق ملکیت کے متعلق اپنا دعویٰ پیش کیا جب کہ ایرانیوں نے کوہک (Kohuk) سمیت[46] مکران کے زیادہ تر حصے پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ کئی مہینوں کی گفت وشنید کے بعد گولڈزمڈ نے بلوچستان کی تاریخ، جغرافیائی حالات، تہذیب وثقافت یا مذہب کو مدنظر رکھے بغیر اور ان بلوچ سرداروں کے بیانات کو نظرانداز کرتے ہوئے حصوں میں تقسیم کر دیا جو خود کو خان کی رعایا سمجھتے تھے۔[47] گولڈزمڈ کے فیصلہ کی بنیاد سیاسی حالات تھے۔ اس کا مقصد تھا کہ ایران کی خوشنودی حاصل کی جائے تاکہ ایران کو روسیوں سے دُور رکھا جائے۔

کوہک (Kohuk) کا مسئلہ:۔

کوہک (Kohuk)، Perso-Baluch پٹی پر واقع ہے۔ 1871ء میں جنرل گولڈزمڈ نے مندرجہ ذیل بنیادوں پر کوہک کو خانان بلوچستان کے سپرد کر دیا:[48]

1. کوہک کے سردار نے بتایا کہ وہ خود کو خان کا ایک مزارعہ سمجھتا ہے۔
2. ایرانی کمشنر، ابراہیم نے اس سوال کے استحقاق کی تفتیش کرنے سے انکار کر دیا۔

بہرحال، ایرانی حکومت، بالآخر ایک خط مورخہ 4 ستمبر 1871ء کے ذریعے اس فیصلے پر

Scanned by CamScanner

رضامند ہوگئی لیکن علیسن (Allison)، (تہران میں برطانوی وزیر) کو ایک علیحدہ اطلاع کے ذریعے ''اسی روز درخواست کی کہ دریں حالات، کوہک، اسفندہ اور کونا بسٹا سمیت علاقے کا ایک چھوٹا سا حصہ ایران کو دے دیا جائے۔'' اس سوال کو حکومت برطانوی ہند کے حوالے کیا گیا اور جنرل گولڈ زمڈ سے مشاورت کی گئی۔ گولڈ زمڈ نے اپنا موقف تبدیل کرلیا اور علاقے کی ایران کو منتقلی کی حمایت کی کیوں کہ ''اس کے باعث قلات کے علاقے کی بجائے ایران کی کہیں زیادہ اور جامع سرحد تشکیل پائے گی۔'' اس وقت برطانوی ہند نے ضروری نہیں سمجھا کہ ان علاقوں کے اعلان کو جائز ثابت کیا جائے جو قانونی طور پر اس کا حصہ نہیں، ایران کو ملنے چاہئیں۔[49]

بہرحال، نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ برطانوی حکومت نے کوہک اور دیگر متعدد گاؤں کو نکال کر ایک ترمیم شدہ نقشہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ ایران کو اس پر قبضہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ یوں ایک ترمیم شدہ تحریری اطلاع اور نقشہ ایران کو بھجوا دیا گیا۔ اس ترمیم شدہ تحریری اطلاع میں کوہک، اسفندہ اور کونا بسٹا کے اضلاع کو خانانِ بلوچستان سے خارج کر دیا گیا تھا۔ جب خان کو اس علاقے کے بلوچستان سے خارج ہونے کی اطلاع ملی تو انہوں نے ترمیم شدہ فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ اب خان کو مطلع کیا گیا کہ یہ مسئلہ قطعی طور پر حل نہیں ہوا کیوں کہ اپریل 1873ء میں ایرانی حکومت نے اس تحریری اطلاع کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔[50] یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ خان کے اعتراضات کے متعلق کوئی مزید کارروائی کی جائے۔[51]

انیسویں صدی کے اواخر میں ایران نے کوہک کا مسئلہ اس پر فوجی قبضہ کرنے کے ذریعے عملی انداز میں حل کرلیا اور اپنی توسیع پسندانہ حکمت عملی کے تحت بلوچستان میں اپنے دعووں کو جتلانے کے لیے حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1896ء اور 1905ء میں بلوچستان کو ایران اور برطانیہ میں تقسیم کرنے کے لیے ایک اینگلو پرشین جوائنٹ کمیشن (Anglo-Persian Joint Commission) مقرر کیا گیا۔[52] سرحد کی نشاندہی کے عمل کے دوران، خانانِ بلوچستان کے بہت سے علاقے برطانویوں نے ہتھیا لیے جو ایران میں روسی اثر ورسوخ کی روک تھام کے لیے ایرانی حکومت کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ دو خارجی طاقتوں کی طرف سے بلوچ عوام پر مسلط کی گئی سرحد کی نشاندہی خان کی رضامندی کے بغیر کر دی گئی۔[53]

1896ء کا معاہدہ 1854ء اور 1876ء کے معاہدوں کی صریحاً خلاف ورزی تھی جن میں کہا گیا تھا کہ Perso-Baluch پٹی ایران اور ہندوستان کی سرحد ہوگی۔[54] یہ امر نہایت دلچسپی کا حامل ہے کہ

Scanned by CamScanner

جنرل گولڈ زمڈ کی طرف سے جس سرحد کی نشاندہی کی گئی تھی، وہ خانانِ بلوچستان کی آزاد حکومت اور ایران کے درمیان تھی۔ 1896ء اور 1905ء کے معاہدے خانانِ بلوچستان کی حکومت کے متعلق حکمت عملی میں واضح تبدیلی کے عکاس ہیں، اسے اب ایک ہندوستانی ریاست سمجھا جا رہا تھا۔ 1905ء کے معاہدے کے تحت خانانِ بلوچستان میر جاوا (Mir Jawa) کے علاقہ سے دستبردار ہو گئے اور اس کے عوض ایرانی حکومت اس امر پر رضامند ہوگئی کہ اس سرحد کو 1896ء کے معاہدے کے تحت حتمی طے شدہ سرحد سمجھا جائے اور اس ضمن میں مزید کوئی دعویٰ نہیں کیا جائے گا۔[55]

1872ء میں برطانوی حکومت نے ایران اور افغانستان کے درمیان سیستان کا تنازع حل کرنے کے لیے جنرل گولڈ زمڈ کو مقرر کیا۔ بہرحال، اس تنازع کا اختتام بلوچ عوام کی رضامندی کے بغیر سیستان کی ایران اور افغانستان کی تقسیم کے ذریعے ہوا۔ نسلی، ثقافتی اور جغرافیائی لحاظ سے سیستان، بلوچستان کا حصہ ہے۔ سیستان، جس پر سنجرانی سرداروں کی حکومت تھی، 1882ء تک خانان بلوچستان کی حکومت کا اطاعت گزار تھا۔ 20 اپریل 1920ء کو قلات میں برطانوی نمائندے نے ایک خفیہ روزنامچے کو برطانوی حکومت کے لیے مرتب کیا جس میں بتایا گیا کہ چکنسور (سیستان) کا سردار ابراہیم خان سنجرانی خانانِ بلوچستان کا اطاعت گزار رہا تھا۔[56] سر رابرٹ سنڈیمن نے لارڈ کرزن کو لکھے گئے اپنے خطوط مورخہ 22 نومبر 1891ء اور 12 جنوری 1982ء میں بتایا کہ خانانِ بلوچستان کی مشرقی حدود حسن ابدال (ایرانی سیستان) اور رودبار کے نزدیک دریائے ہلمند پر مشتمل ہیں۔[57] سیستان کی حتمی حد بندی 1904ء میں برطانوی کمشنر، سر میکموہن کے ہاتھوں انجام پائی لیکن خانانِ بلوچستان کی حکومت اور حق خودارادیت کے اصول کو نظرانداز کر دیا گیا لیکن چکنسور کے حکمران سنجرانی نے عامف عبدالرحمٰن کی حکومت کے تسلط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[58] بہرحال، برطانی ہند کی کابل پالیسی کے باعث عبدالرحمٰن ملک پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر بلوچستان کے حکمران، میر خداداد خان کے ردِعمل کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

بلوچ۔ افغان یا میکموہن سرحد:۔

نیوچمن سے Perso-Bloch تک کا علاقہ اس میں شامل ہے۔ اس کی سرحد کی نشاندہی 1986ء میں انڈو افغان باؤنڈری کمیشن کے سربراہ کیپٹن (بعد میں ''سر'') اے ہنری میک مہون نے کی۔[59] یہ سرحد، بلوچ ملک پر مشتمل ہے جو ایک خاندان اور ایک قبیلے کو دوسرے خاندان اور قبیلے سے جدا کرتی ہے۔ چوں کہ

Scanned by CamScanner

Perso-Baloch سرحد کی نشاندہی کے ضمن میں خان سے مشاورت نہیں کی گئی، اس لیے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اس سرحد کی حیثیت مشکوک ٹھہرتی ہے:

1. 1871ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے خان پر گولڈ زمڈ کی متعین کردہ حد بندی (سرحد) (Perso-Baluch سرحد کا شمالی حصہ) مسلط کی گئی۔
2. 1896ء میں Perso-Baluch کی باقی سرحد کی نشاندہی کرتے ہوئے خانانِ بلوچستان کی آزاد حکومت سے مشاورت نہیں کی گئی۔
3. سیستان کی تقسیم ناانصافی پر مبنی تھی کیوں کہ سیستان ایک خودمختار ریاست تھی اور عوام کی اکثریت بلوچ تھی جنہوں نے خان کو اپنا حکمران تسلیم کیا ہوا تھا۔ چکنسور (سیستان) کے سنجرانی سردار نے 1882ء میں افغان بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
4. برطانوی تحریری اطلاعات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بلوچ عوام ایرانی تسلط سے خوش نہیں تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ ایران کے خلاف برطانوی حکومت کا تحفظ حاصل کریں۔[60]
5. جغرافیائی، ثقافتی اور تاریخی عناصر اور بلوچ عوام کی مرضی کو مدنظر رکھے بغیر بلوچستان تقسیم کر دیا گیا۔[61]

بہرحال، بلوچ عوام پر مسلط کیے گئے سرحدی معاہدے کا حتمی نتیجہ مندرجہ ذیل برآمد ہوا:

1. سیستان، مغربی مکران اور سرحد وغیرہ، ایران کا حصہ بن گئے۔
2. سیستان کا بیرونی علاقہ اور راجستان، افغانستان کے زیر تسلط آ گئے۔
3. جیکب آباد، ڈیرہ جاٹ اور سبی برطانوی ہند میں شامل کر دیئے گئے۔
4. خانان بلوچستان کی حکومت کو زیر تحفظ ملک کی حیثیت سے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

بہرحال، انیسویں صدی کے وسط میں یا بیسویں صدی کے اوائل میں بلوچ قبائل نے برطانوی اور ایرانی اقتدار کے خلاف بغاوتوں کے ذریعے بلوچستان کی غیر قدرتی اور غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ ایک قوم پرست منصف گل خان نے لکھا، ''باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے نتیجے میں بلوچستان کا نصف سے زیادہ علاقہ ایران کے قبضے میں آ گیا اور اس کا نصف حصہ افغانستان کو دے دیا گیا۔ قیادت سے محروم بلوچستان کی تقسیم کا مقصد دراصل، برطانیہ کی حمایت کے لیے روس کے

Scanned by CamScanner

خلاف ایرانی اور افغانی حکومتوں کو خوش کرنا اور ان پر تسلط حاصل کرنا تھا۔"[62] بہر حال، 1932ء میں جیکب آباد کی بلوچ کانفرنس نے مغربی بلوچستان پر ایرانی قبضے کے خلاف آواز اٹھائی۔ بلوچستان کے ایک ممتاز قومی رہنما میر عبدالعزیز خان نے 1933ء میں عظیم تر بلوچستان کا پہلا نقشہ شائع کرنے کے ذریعے بلوچستان کی تقسیم کے خلاف اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔[63] بلوچ نیشنل موومنٹ کے سربراہ مگسی نے 1934ء میں بلوچستان کی آزادی اور اسے متحد کرنے کے لیے مسلح جدوجہد شروع کرنے کا اعلان کیا۔[64]

بہر حال، یہ کام انتہائی مشکل تھا کیوں کہ بلوچستان کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور ہر حصہ اپنی علیحدہ آئینی اور سیاسی حیثیت کا مالک تھا۔

بلوچستان کی سیاسی اور آئینی ہیت

بلوچ قومی جدوجہد کو سمجھنے کے لیے، بیسویں صدی کے اوائل میں بلوچستان کی آئینی و سیاسی ہیت کا علم نہایت ہی اہم نوعیت کا حامل ہے؛

A. مشرقی بلوچستان

1. خانان بلوچستان جسے مزید مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کر دیا گیا:

   a. ریاستِ قلات

   b. لسبیلہ اور خاران ریاستیں

   c. مری، بگتی، کیھتر ان پر مشتمل بلوچ قبائل کا علاقہ، نیز سنجرانی، چاغی اور ڈیرہ غازی خان کا بلوچ قبائل کا علاقہ، کوئٹہ، بولان، نوشکی اور نصیر آباد کا لیز پر دیا گیا علاقہ

2. برطانوی ہند میں بلوچ علاقہ

   a. سبی تحصیل

   b. ڈیرہ غازی خان

   c. جیکب آباد

   d. تحصیل ڈیرہ اسماعیل خان (شمالی سرحدی صوبہ)

B. مغربی بلوچستان (ایران)[65]

1. مکران

Scanned by CamScanner

2. سرحد

3. سیستانن (افغانستان)

1. سیستان

2. گارمسل اور راجس

C. مغربی بلوچستانان[66]

3. شمالی بلوچستان، گوادر (سلطنت اومان)

1854ء اور 1876ء کے معاہدات کے تحت، خانانِ بلوچستان کی حکومت کو برطانویوں نے ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرلیا تھا۔[67] بہرحال، ایک آزاد اور غیر ہندوستانی ریاست کے طور پر اس کی آئینی حیثیت 47-1935ء کے دوران متنازع ہوگئی تھی۔[68] خانانِ بلوچستان 1947ء میں ایک خود مختار ریاست بن گئی اور اسے پاکستان نے تسلیم کرلیا۔[69] مزید برآں، 1947ء ہی میں اس کے ٹھیکے پر دیئے ہوئے اور قبائلی علاقے، برطانوی ہند نے پاکستان کو منتقل کردیئے۔ سابق برطانوی ہند کے بلوچ علاقے جغرافیائی لحاظ سے خانان بلوچستان کا حصہ تھے۔ لارڈ کرزن نے 1876ء میں میر خداداد خان کی بہترین میزبانی کی تھی، اس کی ممنونیت کے اظہار کی خاطر میر خداداد خان نے جیکب آباد (خان گڑھ) کا ضلع لارڈ لٹن کے حوالے کردیا تھا۔[70] ڈیرہ غازی خان، جغرافیائی لحاظ سے بلوچستان کا حصہ ہے اور یہاں مکمل طور پر بلوچوں کی رہائش ہے اور ڈیرہ غازی خان پر انگریزوں کے قبضے کے وقت اس کے مکین خانِ قلات کے علامتی وفادار تھے۔ مزید برآں، ڈیرہ اسماعیل خان (شمال مغربی سرحدی صوبہ)، بلوچستان کا ایک حصہ تھا اور اس کے عوام کی اکثریت بلوچ تھی جنہوں نے 1794ء تک خانان بلوچستان کا ایک صوبہ تشکیل دے دیا تھا۔[71] اس کے بعد 1795ء اور پھر 1830ء میں اس پر دوبارہ افغانوں اور سکھوں نے قبضہ کرلیا۔ خانِ قلات، میر مہراب، اپنے اقتدار کے اختتام 1839ء تک اس علاقے پر اپنے اقتدار کا دعویٰ کرتے رہے۔ 1845ء میں اس پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا اور اسے برطانوی ہند میں شامل کرلیا گیا۔ سبی کی تحصیل جغرافیائی لحاظ سے بلوچستان کا حصہ ہے اور اس میں بلوچ عوام رہتے ہیں۔ پندرھویں صدی میں یہ مشہور بلوچ افسانوی ہیرو میر چاکر خان کی نشست تھی۔ بعدازاں یہ خانان بلوچستان کے زیرنگیں آگیا۔[72] جب برطانویوں نے سبی پر قبضہ کیا تو اس کی آئینی حیثیت مشکوک ہوگئی۔ سر رابرٹ سنڈیمن نے اس علاقے کو خانان بلوچستان کا ایک حصہ تصور کیا۔ بیسویں صدی میں

Scanned by CamScanner

اسے برطانوی افغانستان (برطانوی بلوچستان) میں شامل کر دیا گیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں مغربی بلوچستان نے خانان بلوچستان کی تشکیل کی۔ انیسویں صدی میں جب بلوچستان کی تقسیم ہوئی تو بلوچ قبائل نے ایرانی یا افغانی حکمرانوں کی بجائے خان قلات کی اطاعت گزاری کا اعلان کیا۔[73] بلوچستان میں برطانوی ریذیڈنٹ، سر جے رمزے نے دہلی کی برطانوی حکومت کو ایران کے ساتھ مغربی بلوچستان کی سیاسی قیادت کے تعلقات کے متعلق یوں آگاہ کیا: ''ایرانی بلوچستان کا تمام علاقہ۔۔۔ظاہری طور پر، کرمان کے ایرانی گورنر جنرل کے زیر حکمرانی ہے لیکن پندرہ برس سے کسی ایرانی افسر نے اس شورش زدہ علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی جس میں وہ درحقیقت نسلی، مذہبی لحاظ سے ایک اجنبی اور غیر ملکی ہیں کیوں کہ ایرانی بلوچ سنی فرقے کے حامل ہیں اور ان کا نسلی لحاظ سے ایرانیوں کے ساتھ کوئی تعلق یا عزیز داری نہیں۔ علاقوں کے بین الاقوامی قانون کے لحاظ سے فارسی ہیں کیوں کہ سرحدی ستون کے ذریعے یہی ظاہر ہوتا ہے لیکن یہاں ایرانی عملداری ہے نہ ہی ایک ایسے خودمختار علاقے پر ایران کا دعویٰ تسلیم کیا جاسکتا ہے جہاں ایرانی اجنبی ہیں جو اس علاقے سے نفرت کرتے ہیں اور جن سے عوام بھی نفرت کرتے ہیں۔[74]

افغانستان میں سیستان کے متعلق برطانوی ہند کے اسسٹنٹ کوارٹر ماسٹر جنرل انٹیلی جینس، کرنل ایلس نے 1893ء میں یوں اطلاع دی: ''1882ء تک یہ ملک عملی لحاظ سے آزاد تھا جہاں سنجرانی بلوچوں کی رہائش تھی اور سنجرانی سردار اس ملک کا حکمران تھا جس کا علاقہ اور حکومت بلوچستان میں چاغی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے عبدالرحمٰن خان نے خود کو امیر ماننے سے انکار کے باعث معزول کر دیا تھا اور ملک اس وقت افغانی فوج کے زیر تسلط ہے۔''[75]

جنوبی بلوچستان، ایک بندرگاہ گوادر پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کو ناصر خان نے سلطنت اومان کے ایک جلاوطن شہزادے کی میزبانی سے ممنونیت کے اظہار کے طور پر اسے بخش دیا تھا۔ اس علاقے کی آئینی حیثیت 1938ء میں خان میر احمد یار کے باعث متنازع ہوگئی تھی۔[76] بہرحال، ایک معاہدے کے تحت اس علاقے کی پاکستان منتقلی تک یہ سلطنت اومان کا حصہ رہا۔

بلوچ قوم پرستی کی ترقی کے راستے میں بلوچستان کی سیاسی اور بین الاقوامی تقسیم ایک رکاوٹ بن گئی۔ بلوچ، جو مختلف سیاسی نظاموں کے زیر تسلط رہے تھے، وہ سماجی و معاشی ترقی کے مختلف مراحل پر تھے۔ بلوچ قوم پرست رہنماؤں کی طرف سے اصلاحات کے مطالبات، برطانوی حکومت نے اس بنیاد

Scanned by CamScanner

پر مسترد کر دیئے کہ بلوچستان آئینی لحاظ سے ایک جامع اکائی اور وحدت نہ تھی۔[77] جہاں تک مغربی بلوچستان کا تعلق تھا، تہران اور کابل نے بلوچوں کو ایک جداگانہ ثقافتی اکائی کے طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایرانی اور افغان حکمران طبقوں نے بلوچ علاقے کو تقسیم کر دیا تا کہ ان کی ثقافتی اور سیاسی وحدت کو کمزور کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر، ایران میں جنوبی بلوچستان صوبہ کرمان کا ایک حصہ تھا اور سیستان، خورستان کا ایک حصہ تھا جب کہ بندر عباس ایک علیحدہ اکائی تھی۔[78] یہ بات افغانستان کے بلوچ علاقوں کے لیے بھی درست تھی جن پر ہرات، فرح اور قندھار کی حکومت تھی۔ 1934ء میں بلوچ قوم پرستوں نے بلوچستان کی سیاسی تقسیم کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ بلوچ نیشنل موومنٹ کے بانی، مگسی نے اعلان کیا: ''بلوچستان کے اتحاد کے تمام آئینی راستے ہمارے لیے بند ہو چکے ہیں اور صرف مسلح جدوجہد کا راستہ ہی باقی رہ گیا ہے۔''[79] پہلی بلوچ بغاوت کے سربراہ، پرنس آغا خان نے 1948ء میں ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے بلوچوں کو متحد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن پاکستانی فوج کے ذریعے یہ کوشش کچل دی گئی۔[80]

نسلی گروہ:۔

اہل بلوچستان کی نسلی ہیت، ان کے حملہ آوروں اور پناہ گزینوں کے نسلی ورثے کی عکاس ہے۔ اصلی آبادکاروں کے متعلق کچھ معلوم نہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ بروہی اور جٹ تھے۔ تیرھویں صدی میں بلوچستان کے بڑے اور اہم نسلی گروہ نے ایران کے شمال اور شمال مغرب سے ہجرت کی اور اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں آنے والی صدیوں میں بلوچ حملہ آوروں کی زبان اور تہذیب وثقافت ملک کے بیشتر حصوں میں رائج ہوگئی تا کہ آبادی کی اکثریت کو بلوچ سمجھا جائے۔ قلات جیسے مختلف حصوں میں بروہی زبان ہی رائج ہے۔ سندھ، افغانستان اور ایران کے سرحدی علاقوں میں، کچھ ایسے اقلیتی نسلی گروہ موجود ہیں جو انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں آباد ہوئے۔[81]

بہر حال، بروہی خود کو بلوچ قوم کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔[82] برطانوی خارجہ اور سیاسی محکمہ نے 1932ء میں خان کے لیے تقریر کا ایک مسودہ تیار کیا اور منظوری کے لیے ان کے پاس بھجوا دیا۔ خان نے ''بروہی بلوچوں'' کے الفاظ پر اعتراض کیا اور اس بنیاد پر لفظ ''بروہی'' نکالنے کا مطالبہ کیا کہ بروہی بلوچ ہیں اور ایک علیحدہ نسلی گروہ نہیں۔[83] حکومت قلات نے 1947ء میں برطانوی حکومت کو لکھا کہ

Scanned by CamScanner

بروہی نسلی اور ثقافتی لحاظ سے بلوچ ہیں۔[84] یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ بلوچ نیشنل موومنٹ کے بہت سے بنیادی اور ممتاز ارکان بروہی تھے اور ہیں۔[85]

قوم پرستی کی تاریخ کے ضمن میں ہم اس امر پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے کہ بلوچوں اور بروہیوں کی نسل کی ابتدا کیسے ہوئی۔

قوم پرستی کی تاریخ میں مشترک نسلی مخرج، خواہ اصلی ہو یا نقلی، نے قوم پرستی کے تعلق کو مضبوط کیا ہے۔ بہت سی اقوام آج سمجھتی ہیں کہ ان کا تعلق ایک مشترک نسلی ورثے سے ہے۔ اس لیے جرمن خود کو Nordics یا Teutons اور انگریز خود کو Anglo-Saxons کی نسلی اولاد سمجھتے ہیں۔ ایرانی، افغان اور شمالی ہندوستانی، خود کو آریائی سمجھتے ہیں، اور اسی طرح بلوچ بھی خود کو ایک علیحدہ نسل سمجھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ حضرت محمد ﷺ کے چچا امیر حمزہ ان کے واحد جد امجد ہیں اور وہ اپنے دعویٰ کو شجرہ ہائے نصب، رزمیہ نظموں اور روایت کے ذریعے نہایت تسلی بخش انداز میں ثابت کر سکتے ہیں۔[86] بروہیوں پر بھی یہ کلیہ صادق آتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ حلب (Allepo) کے ایک واحد جد امجد براہو یا ابراہیم سے تعلق رکھتے ہیں[87]۔ ان کے دعوے اہم ہیں کیوں کہ ان کے ذریعے بلوچوں میں اتحاد اور ان کی سماجی زندگی میں وحدت اور نظم پیدا ہوتا ہے۔ یہ روایات اور دعوے مختلف دانشوروں کے زیر بحث رہے ہیں جو ان کی مستند حیثیت کے متعلق بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔

ایران کے متعلق ایک ماہر بشریات، ڈاکٹر سپونر (Dr.Spooner) کا موقف یہ ہے کہ بلوچوں (بروہیوں سمیت) اور پشتونوں کی مانند تمام غیر عرب مسلمان خانہ بدوش بغیر کسی تاریخی ثبوت کے اس امر کے دعوے دار ہیں کہ ان کا تعلق قدیم عربوں سے ہے۔ وہ لکھتا ہے، ''کیا وجہ ہے کہ عربوں کو، جو اپنی زبان، شاعری اور شناخت کو اپنے لیے قابل فخر سمجھتے ہیں، اجازت دے دینی چاہیے کہ وہ خود کو ایک دوسری مبہم لسانی اور ثقافتی روایت سے جڑا سمجھیں۔[88]

مغربی دانشور اور کئی ایک برطانوی سیاسی اہلکار، جنہوں نے بلوچوں کے مخرج کا سراغ لگانے کی کوشش کی، ان کی آراء میں تضاد موجود ہے۔ وہ بلوچوں کو اصلی مکین سمجھتے ہیں اور اس نظریے کو ہی درست سمجھتے ہیں، یا پھر انہیں مندرجہ ذیل نسلی گروہوں کے وارث سمجھتے ہیں:

1. ترکی یا التائی
   a) ترکمان شاخ

b) کرغز شاخ

2. آریا

a) ایرانی شاخ

b) ہندوستانی شاخ

3. سامی (خصوصاً یہودی)

a) چلدین شاخ

b) عرب شاخ

مکرانی اندازِ فکر یا علاقائی قوم پرستی

1895ء میں کرنل ای موکلر نے اپنے مضمون بعنوان ''بلوچوں کا مخرج'' میں اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ بلوچ، مکران (بلوچستان) کے اصلی باسی تھے۔ اس کے نزدیک لفظ ''بلوچ'' (Baluch) کا ماخذ "Bad-roch" یا "evil day" (بُرا دن) ہے۔ استعارہ پر مشتمل یہ عرفیت بلوچوں کے لیے ان کے دشمنوں نے وضع کی تھی۔ وہ لکھتا ہے، ''برطانیہ میں "Bad roch" یا "Bad rosh" کو "Gadrosch" یا پھر انتہائی قدیم پہلوی یا زند (Zend) میں "Gadro" اور پھر یونانی میں "Gadros-ii" یا "Gedrosii" کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے۔ مزید برآں، اگر Badroc کی تحویلی حرفی کی جائے تو "r" اور "l" کے استعمال سے "Badloch" کا لفظ سامنے آتا ہے جس میں سے "d" کو خارج کر دینا چاہیے جس کے نتیجے میں بلوچ کا مترادف "the Gedrosii" برآمد ہوتا ہے۔[89]

لانگ ورتھ ڈیمز (Longworth Dames) نے موکلر کے نظریے کی تردید کی اور کہا کہ مکران میں تیرھویں صدی سے قبل ''بلوچ'' کا لفظ اجنبی تھا اور اس لفظ کا ماخذ چھ سو برس قبل لفظ "Gedrosii" سے تلاش کرنا بے سود اور فضول ہے۔[90]

بلوچ، مکران کے اصل باسی تھے، اس نظریہ کی بلوچستان کے دو مذہبی علما، مولانا عبداللہ درمنی اور مولانا قاضی عبدالصمد سربزی نے بھی حمایت کی ہے۔ مولانا سربزی نے اپنے مضامین بعنوان ''بلوچ اور بلوچستان'' اور ''مکران اور اس کا جغرافیائی محل وقوع'' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مکران اور کرمان، دو بھائی تھے اور حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی نسل سے تھے جو بابل میں زبانوں میں

Scanned by CamScanner

تقسیم کے بعد آباد ہو گئے تھے۔'' ان کے مطابق، مکران نے آج کے بلوچستان کی طرف ہجرت کی جہاں اسے بلوچ کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ انہوں نے اپنا یہ نظریہ ایک عرب مؤرخ ''البدوری'' کی تحریر کردہ کتاب ''معجم البلدان'' سے اخذ کیا۔[91] اس لیے قبل از تاریخ تہذیب کو بلوچ تہذیب کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں بڑھتی ہوئی علاقائی قوم پرستی شاید اس موقف کی حمایت کی عکاس ہوگی۔[92]

بہر حال، یہ نظریہ کہ بلوچ، اس سرزمین کے اصلی باسی ہیں، اس کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں اور چند دانشور ہی اس نظریہ کے حامی ہیں۔

ترکی یا التائی (Altaic)

سر ایچ پوٹنگر (Sir H.Pottinger) اور خانکوف (Khanikoff) نے یہ کہتے ہوئے بلوچوں کو ترکی النسل قرار دیا ہے کہ وہ ترکمان اور کرغز کی نسل کے وارث ہیں، نیز انہوں نے ان نظریات کی بھی مخالفت کی جن کے مطابق بلوچوں کو سامی النسل قرار دیا گیا ہے۔ اپنے نظریے کی حمایت میں، پوٹنگر نے کہا کہ ''ان کے ادارے، عادات، مذہب اور مختصر یہ کہ زبان کے سوا ہر چیز ایک جیسی ہے۔''[93]

ان کے ترکی مخرج پر تبصرہ کرتے ہوئے لانگ ورتھ ڈیمز نے لکھا، ''مجموعی طور پر ترکمان کے ساتھ مشابہت بہت ہی قریبی دکھائی دیتی ہے لیکن جہاں تک ایرانی خانہ بدوشوں کا تعلق ہے، یہ مشابہت سب سے زیادہ مضبوط اور قریبی ہے۔ بہر حال، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک گرم اور خشک ملک میں خانہ بدوشی کی زندگی کے باعث، ان کی دُور افتادہ نسلوں میں اسی قسم کے رسم و رواج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ گھوڑوں کا شوق، وسطی ایشیا کی نسلوں کی ایک نہایت ہی نمایاں خصوصیت ہے، اسی طرح ایرانی سطح مرتفع کے مکینوں اور عربوں کو بھی گھوڑوں کا شوق ہے۔[94] کیئن (Kaene) کے نزدیک بلوچ زیریں زمین پر رہنے والے تاجکوں جیسے ہیں۔[95] بجارانی کے مطابق، اس نظریے میں کوئی قوت نہیں اور خاص طور پر اس کے موقف کے مطابق، جب بلوچوں کو امن پسند، عمومی طور پر اطاعت گزار تجارت پیشہ تاجکوں کے برعکس جنگجو نوعیت کا حامل سمجھا جاتا ہے تو اس نظریے کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔[96]

ایوانوف (Ivanov) نے بلوچوں کے عرب مخرج کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایرانی النسل ہیں اور اس ضمن میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ بلوچ اپنی طبعی خصوصیات کے لحاظ سے ایرانیوں اور کردوں سے مختلف ہیں۔''[97] بہر حال، ہم بلوچوں کے ساتھ ترکی النسل لوگوں کی ملاوٹ سے انکار نہیں کر سکتے۔

Scanned by CamScanner

بارہویں صدی، بعد از وفات مسیحؑ، میں بلوچ، ایران کے شمال میں رہتے تھے جہاں ترکوں کے غلبے کا آغاز Oxus علاقے میں ہوا جس کے نتیجے میں مغرب کی طرف ترک قبائل نے شمالی ایران اور ایشیائے کوچک (ترکی) کی طرف ہجرت کی جس پر سلجوقی ترکوں کا قبضہ تھا۔ اس عرصے میں ترکمان خانہ بدوشوں کے گروہ کے گروہ یہاں آئے اور بلوچستان کے قریب آباد ہوگئے، اس کے بعد شمالی اور شمال مشرقی ایران سے بھی خانہ بدوشوں کے بہت سے گروہ یہاں آباد ہوگئے۔[98] سلجوقی ترکوں کی حکومت کے عرصے کے دوران ممکنہ طور پر ترکمان خانہ بدوشوں کو بلوچوں نے اپنے میں شامل کرلیا تھا۔ لانگ ورتھ ڈیمز، جس کا دعویٰ تھا کہ بلوچ ایرانی النسل تھے، وہ ترکمانی خانہ بدوشوں کے بلوچوں پر اثر ورسوخ کے متعلق بتاتا ہے، ''اپنے رسوم ورواج کے لحاظ سے یہ لوگ ممکنہ طور پر خونی تعلق کے بغیر یقینی طور پر ترکمانی اثرات کا مظہر ہیں۔ ممکنہ طور پر سلجوقی شہنشاہیت کے دَور میں مختلف قبائل کی طرف سے ترک ناموں (تومان، بولک، ایل اور اولاس) کے علاوہ مخصوص ناموں (چاکر، سنجر، زنگی) کی اپنائیت سے اس قسم کے تعلق کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔[99]

آریائی

A. ایرانی شاخ

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بلوچ ایرانی النسل ہیں، ان میں آر برٹن (R.Burton)، لانگ ورتھ ڈیمز (Longworth Dames)، ڈینیکر (Deniker)، ڈبلیو ایوانوف (W.Ivanov)، سپیگل (Spiegal)، ٹرمپ (Trumpp)، وائی کیئن (Y.Kaene)، گینکوسکی (Gankovsky)، جے ایچ ایلفنبن (J.H.Elfenbein) شامل ہیں اور ان سب نے ان تمام نظریات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جن کے مطابق بلوچوں کو سامی النسل قرار دیا گیا ہے۔[100] برٹن (Burton) نے بلوچوں اور عربوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا، اس نے لکھا کہ بلوچوں کا ظاہری حلیہ اسماعیلی نسل کے افراد سے بہت کم ملتا ہے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی، سیاہ اور تاثر انگیز، جب کہ ایرانیوں کی آنکھیں چھوٹی نہیں ہوتیں، ان سے بے چینی مترشح ہوتی ہے اور عربوں کی مانند اعضا سخت گیر محسوس ہوتے ہیں اور ان کے دیگر نقش ونگار سیدھے، باقاعدہ اور ایرانی ہوتے ہیں، اور ان کی ڈاڑھی جوان کی بلند طبعی نشوونما کی بے عیب عکاس ہے، لمبی، گھنی اور بھرپور ہے۔''[101] لانگ ورتھ ڈیمز جس نے "The Baloch Race" نامی کتاب تصنیف کی تھی، نے تحریر کیا، ''عمومی طور پر مبہم نظریہ کہ بلوچ، عرب نقش ونگار کے حامل ہیں، اس کی

Scanned by CamScanner

بنیاداس حقیقت پر ہے کہ ان کی لمبی ناکیں عقاب کی چونچ جیسے مڑی ہوتی ہیں، جو یہودی نظر آتے ہیں، اوراس لیے انہیں سامی (بطورِ خاص یہودی) یا عرب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ عربی قسم کی نہیں ہے۔ عربوں کی ناک عام طور پر اپنی جڑ سے دبی دبی سی معلوم ہوتی ہے، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جسے بلوچوں میں بمشکل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ سراور ڈاڑھی کے وافراور گھنے بال، عربوں جیسے نقش ونگار کے حامل نہیں۔ ماتھے پر بال بہت گھنے اور گہرے ہوتے ہیں۔[102]

B. ہندوستانی شاخ

ڈاکٹر بیلو(Dr.Bellow) نے بلوچوں کے علاوہ پشتونوں کو بھی ہندوستانی قبائل کی نسل قرار دیا جو بالیچا(Balaecha) کے چوہان راجپوت قبیلے کی نسل سے تھے جو بنیادی طور پر بلوچستان کے علاقہ نوشکی کے مکین تھے۔ ڈاکٹر بیلو کے مطابق، اس قبیلے کو قوریش(Kuriush)، قورش(Korish) اور گورش(Gorish) کہا جاتا تھا اور ان کا تعلق شاہی راجپوت قیروش(Kerush)، قروش(Keruch) یا قریش(Korech) سے تھا۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا نام قریش(Koreish) کے طور پر تبدیل کرلیا اور عربی النسل ہونے کا دعویٰ کیا۔ ڈاکٹر بیلو کے نزدیک، بلوچی زبان فارسی ''ڈھلی ہوئی ہندوستانی زبان'' ہے۔ اس نے مشہور رند قبیلے کو ایک ایسا بلوچ قبیلہ قرار دیا جس کے بلوچ ایک شاخ تھے، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''رند'' کا نام ''رن آف کچھ'' سے اخذ کیا گیا ہے جس کے سنسکرت آریائی معنی ''کچرا، کاٹھ کباڑ'' کے ہیں۔[103] لانگ ورتھ ڈیمز نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اس نظریے کی مخالفت کی:[104]

1. بلوچ(Baloch) اور بالیچا(Balaicha) کی آوازوں کو کسی بھی صوتی قانون کی بنیاد ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

2. چوہان اور راجپوت قبائل نے کبھی بھی وادیٔ سندھ پر قبضہ نہیں کیا اور نہ ہی سندھ یا پنجاب کو اپنے زیرنگیں بنایا۔ اور یہ بھی ثبوت میسر نہیں کہ چوہان قبیلہ کبھی دریائے لونی (ڈیرہ اسماعیل خان میں بلوچوں یا پٹھانوں کی قدرتی نسلی سرحد) رن آف کچھ کے مضافات میں رہائش پذیر تھا۔

بہرحال لانگ ورتھ ڈیمز نے تسلیم کرلیا کہ گچکی اور مکران کے جدگال، لورالائی کے کھیتران کے علاوہ مکران، ڈیرہ غازی خان اور میڈ (ماہی گیروں کے قبائل) جیسے ہندوستانی النسل قبائل بلوچوں میں مدغم ہوگئے۔

خود بلوچ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ غیر ہندی نسل کے وارث ہیں جس کا اظہار مندرجہ ذیل بلوچ

Scanned by CamScanner

کہاوت سے ہوتا ہے: ''جن بلوچوں نے دریائے سندھ عبور کیا، جٹ (ہندوستانی) بن گئے اور جو ابھی بھی مغربی طرف رہتے ہیں، بلوچ ہی رہے۔'' اس لیے، بلوچ ہندوستانی زبان کی اپنائیت کو اپنے لیے لعنت کے مترادف سمجھتے تھے۔ 1946ء میں خانانِ بلوچستان نے کابینہ مشن کو ایک یادداشت پیش کی جس میں اس بنیاد پر آزاد بلوچستان کا مطالبہ کیا گیا کہ بلوچ غیر ہندوستانی ہیں۔[105]

سامی (خصوصاً یہودی)

چلدین (Chaldean) نظریے کو پروفیسر جارج رالنسن (Professor George Rawlinson) نے پیش کیا تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں قدیم تاریخ کے پروفیسر تھے۔[106] اس کے بعد میجر پرسی مولز ورتھ سکائیز (Major Percy Molesworth Skyes) نے ایک اور نظریہ پیش کیا۔[107] بعدازاں، 1936ء میں ریاست قلات کی نیشنل پارٹی نے اپنے منشور میں یہ دعویٰ کیا کہ بلوچوں کا اصل وطن چلدین ہے۔[108] اس کے بعد مزید نظریات بھی پیش کیے گئے جن کے پیش کرنے والوں میں بلوچ قوم پرست مصنفین مثلاً محمد سردار خان گشکوری، گل خان، عالم رقیب، مولانا فریدی اور خدا بخش خان بجارانی شامل تھے۔[109]

بجارانی کا دعویٰ ہے کہ متعدد سامی قبائل کے نام، بہت سے بلوچ قبائل کے نام پر ہیں جب کہ شام اور عراق صدیوں ہی سے Kushite-Chaldean کی تہذیب وثقافت کی آماجگاہ رہے ہیں۔ بلوچستان میں مری، بلیدی، مہری، جمالی، عزدی اور نومیری جیسے بلوچ قبائل کی مانند عرب قبائل کے نام بھی المری، البلیدی، الجمالی، مہری، عزدی اور النومیری ہیں۔[110]

بجارانی نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اس نظریے کی حمایت کی ہے:

''Kushite شاخ کے معزز Kaldo-Belus خاندان کی نسلیں موجودہ تاریخ کے بلوس (Balos) یا بلوچ (Baloch) ہیں۔ ہمیں بیلوس (Belus) حکمران خاندان کے Kaldian حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ مندروں، دیوتاؤں، دریاؤں، پہاڑوں، شہروں اور قبائل کے نام ان کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بلوچ Khushite نسل کے Kaldian قبائل کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ Kaldian خاندانی حکمران کا پہلا طاقتور حکمران نمرود، بیلوس (Belus) تھا اور اس کے بعد اس حکمران خان کا عظیم ترین حکمران بیلوس (Belus) تھا جس نے بابل پر حکومت کی۔''

Scanned by CamScanner

-(2130 B.C)[111]

اپنے اس نظریے کی حمایت میں، بجارانی نے کھدائیوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ ''ایک متوازی Chaldian حکمران خاندان موجودہ بلوچ قبیلے مری کے مشابہ ہے جس کی کسی زمانے میں جدید شام کے شمالی علاقے پر حکومت قائم تھی۔[112] اس نظریے پر بحث ومباحثہ ہوتا رہا ہے کہ بلوچ، چلدی النسل ہیں۔ ناموں کی مشابہت کی بنیاد پر تشکیل پانے والے نظریے کی حمایت نہایت مشکل ہے۔ زبان میں اختلاف کے باعث یہ نظریہ غلط ثابت ہوتا نظر آتا ہے۔ چلدین کی زبان، آج کے بلوچستان کی زبان بلوچی سے کہیں مختلف ہے جس کا تعلق ہندوستانی یورپی لسانی خاندان کی ایرانی شاخ سے ہے۔ بہرحال، بجارانی لکھتے ہیں، ''متعدد دیگر لوگوں کی مانند بلوچ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ دوسری نسلوں کا ملغوبہ نہیں ہیں۔ صدیوں سے ہی مختلف نسلی گروہوں کے لوگ، بلوچوں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ درحقیقت، یہ کہا جا سکتا ہے کہ Dravidian یا دراوڑ کا خون، قلات کے کچھ بروہی قبائل میں شامل ہے، نیز میڈیس، راجپوت اور افغانی بھی بلوچوں میں سے ہی ہیں۔ لیکن درحقیقت لفظ ''بلوچ'' کے ماخذ اور یہ کہ بلوچ لوگ دراصل کون تھے، یہ سب کچھ ابھی تک صیغۂ راز میں ہے۔[113] بہرحال، یہ نظریہ ان کے لیے احساسِ تفاخر سے کم نہیں کیوں کہ یہ نظریہ ان کے اس دعوے پر مشتمل ہے کہ وہ دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کے بانی ہیں۔

بجارانی کے اس موقف کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ مری بلوچ، میسوپوٹامیا کی مری سلطنت کی نسل سے ہیں۔ ایک اور بلوچ مصنف، عالم رقیب کو بھی ہندوستان کے موریہ حکمران خاندان میں سے مری بلوچوں کے مخرج کو تلاش کرنے کے سلسلہ میں اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔[114] وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ مری قبیلہ رند کی ایک شاخ ہے۔ اس سلسلے میں، ہم بلوچوں کی اس روایت پر انحصار کرتے کہ پندرہویں صدی میں جب میر چاکر خان کی نگرانی میں عظیم بلوچ ہجرت رونما ہوئی تو پھر رند قبیلے کے ایک حصے، جس کی سربراہی میر بجار کے ہاتھ میں تھی، نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میر چاکر خان نے اصرار کیا کہ انہیں جانا چاہیے۔ ان کے مسلسل انکار کے باعث میر چاکر خاں مشتعل ہو گیا اور اس نے انہیں ''مری'' کے نام سے پکارا (جس سے مراد یہ ہے کہ بلوچوں کو سمجھایا نہیں جا سکتا)۔[115] بہرحال، ہم اس امکان کو مسترد نہیں کر سکتے کہ بلوچوں میں چالدین بھی شامل ہو گئے تھے، جیسا کہ ڈینیکر نے لکھا کہ مکرانی بلوچ، ایرانی، آریا اور نیگرو نسلوں کا ملغوبہ ہیں۔[116]

روایتی طور پر عربی النسل ہونے کا نظریہ بلوچ عوام میں بہت مقبول ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے

Scanned by CamScanner

بھی ذکر کیا گیا، بلوچ مخرج اور روایت اس نظریے کی حمایت کرتے ہیں حالاں کہ اس ضمن میں کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ مؤرخین اور ماہرین بشریات کا موقف یہ ہے کہ بلوچ تاریخ میں بہت سے عرب خانہ بدوش قبیلے، بلوچ قبائل میں شامل ہو گئے۔ اس نظریے کے ممتاز حمایتی ٹی ہولڈش (T.Holdish)، ایچ گرین (H.Green)، ہیتو رام (Hittu Ram) اور چرنجیت لال (Charanjeet Lal) ہیں۔[117]

ہنری گرین (Henry Green) جس نے انیسویں صدی میں بلوچ ہندوستان سرحد پر ایک سیاسی افسر کے طور پر خدمات انجام دی تھیں، اس نے شام کا سفر کیا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ عرب قبیلوں کے بھی وہی نام ہیں جو بلوچ قبائل کے ہیں، مثلاً مری، بلیدی اور جمالی وغیرہ۔[118] ٹی ہولڈش نے ان کی روایات اور طبعی خصوصیات اور حلیہ کی بنا پر انہیں عربی النسل سمجھا۔[119]

بلوچوں کے مخرج کے متعلق مختلف نظریات کے مطالعے اور جائزے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بلوچ کوئی ایک نسل نہیں بلکہ وہ متعدد نسلوں کا ملغوبہ ہیں جن کی زبان کا ایرانی ماخذ سے تعلق ہے۔ وہ شمالی علاقے میں عربوں کے ساتھ، مشرقی علاقے میں ہندوستانیوں اور شمال مغربی علاقے میں ترکمان اور دیگر ترک گروہوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ ساحلی علاقے (مکران) میں رہنے والے بلوچ، ایرانی، آریائی اور نیگرو نسلوں کا مجموعہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقت بلوچ قوم پرستی کے دعوے کے لیے ضرر رساں ہے؟ جب ہم دیگر نسلوں، خاص طور پر ایرانیوں، پشتونوں اور ہندوستانیوں کے مخرج کا مطالعہ کرتے اور ان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی نسل خالص نہیں، یہ کہنا نہایت سچ ہوگا کہ خالص نسل کی موجودگی کا تصور عبث ہے۔ بلوچوں نے اپنی قوت میں اضافے کی خاطر دیگر اقلیتی گروہوں کو اپنا لیا۔ اپنی تہذیب و ثقافت میں اجنبیوں کو شامل کرنے کی حکمت عملی پر مبنی بلوچوں کا یہ رویہ، قوم پرستی کی افزائش کے ضمن میں ایک مثبت قدم تھا۔ بہر حال، بلوچوں کی اکثریت کا یہ موقف کہ وہ سامی یا عرب نسل سے ہیں اور وہ غیر ایرانی و غیر ہندوستانی ہیں، پاکستان اور ایران میں مختلف پس ہائے منظر کی بنیاد پر ان کو ایک علیحدہ قوم کی حیثیت دینے کے حوالے سے جائز معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، بلوچستان میں بلوچوں کے علاوہ ایک اور اہم نسلی گروہ موجود ہے جسے بروہی کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس نسلی گروہ کو ان کی زبان میں فرق کے باعث بلوچ قوم پرستی کے راستے میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ پاکستانی حکومت، جس طرح اس سے قبل برطانویوں نے اس قسم کا رویہ اپنایا، بلوچوں کی قوم پرستی کو کمزور کرنے کے لیے بروہیوں کو ایک علیحدہ نسلی گروہ سمجھتی ہے۔ اس مسئلے کی

Scanned by CamScanner

گہرائی کو سمجھنے کے لیے ہم بروہیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تا کہ ان کے مخرج اور بلوچوں کے ساتھ تعلق سے آگاہ ہو سکیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ لفظ ''بروہی'' کا ماخذ ایرانی لفظ ''بارروہی'' (پہاڑی علاقے کے رہنے والے) ہے عین ویسے جس طرح بلوچ قبیلہ ''نہروئی'' (میدانی علاقے کے رہنے والے) کو یہ نام ملا۔ بروہی روایات اور رزمیہ نظموں کے مطابق یہ لفظ براہو (Braho) ، براہم (Brahim) یا ابراہیم (Ibrahim) سے لیا گیا ہے۔ بروہیوں میں براہو (Braho) ابراہیم (Ibrahim) کی عام عرفیت ہے۔[120] بروہیوں کے نسلی مخرج کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ پوٹنگر کے نزدیک بروہی، تاتاری یا مغل نسل سے ہیں۔[121] ٹیٹ (Tate) کی رائے کے مطابق، نوشکی کے بروہی قبیلے، ذاگر مینگل کی آمد سوویت وسطی ایشیا سے ہوئی۔ ٹیٹ کا کہنا ہے کہ بروہی میں ''گال'' (Gal)، ایک اجتماعی لاحقہ ہے، نیز وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ مینگل سے مراد من (Min) کا قبیلہ ہے۔ (لفظ ''مَین'' (Men) یا ''مِن'' (Min)، بیستم (Behistum) کی مقدس کتب میں سکائتھ قبائل (Scythian tribes) کے نام کی حیثیت سے آتا ہے جسے ایران کے Achaemenian یا خمانیشی حکمران دارا (Darius) نے جلاوطن کر دیا تھا۔[122] ہیوز بُلر (Hughes Buller) کا کہنا ہے کہ ساجدی، بزنجو اور زہری قبائل، Sychthin نسل کی اولاد ہیں۔[123] گل خان انہیں چلدین (Chaldean) سمجھتا ہے۔[124]

قلات کے آخری حکمران، میر احمد یار خان اور ملک صالح کا کہنا ہے کہ بروہی، بلوچ النسل ہیں۔[125] جب انہیں سیستان اور قلات کے ایرانیوں نے نکال باہر کیا تو وہ اس سے قبل البرز (Alburz) کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں قیام پذیر تھے جہاں مقامی آبادی نے انہیں ''برزکوہی'' (البرز کے پہاڑوں میں رہنے والے) کا نام دیا جو مختصر ہو کر ''بروہی'' بن گیا۔[126]

بہر حال روایات کے مطابق بروہی، مختلف نسلوں کا مجموعہ ہیں۔ خانِ قلات میر خداداد نے بروہیوں کی ہیت ترکیبی یوں بیان کی ہے:[127]

بروہی قبائل	قمبرانی قبائل کے احمدزئی اور ایلتازئی، میروانی، گرگناڑی، سمالانی، قلندرانی
بروہی قبیلے میں شامل ہونیوالے قبائل (بلوچ النسل)	بنگلزئی، لانگو، لہڑی
بروہی قبیلے میں شامل ہونیوالے قبائل (ایرانی النسل)	کرد اور محمد حسنی یا مماسانی

Scanned by CamScanner

بروہی قبیلے میں شامل ہونیوالے قبائل (ہندی النسل)	بزنجو، مینگل، ساجدی، زہری، جگدل اور گچکی
بروہی قبیلے میں شامل ہونیوالے قبائل (افغانی النسل)	رئیسانی، سرپرہ اور زرکزئی، زہری
بلوچستان کے اصل رہائشی	محمد شہی اور نکاری

دیگر کئی ذرائع کا کہنا ہے کہ بزنجو، جلوان کے شاہی مینگل اور قلات کے مندونائی کے شاہی خاندان، رند نسل کے بلوچ ہیں۔[128] نینا سویڈلر (Nina Swidler) جیسی بہت سے ماہرین بشریات کی رائے یہ ہے کہ بروہی، متعدد نسلوں کا مجموعہ ہیں۔[129] کابینہ مشن کو 1946ء محمد علی جناح کی جانب سے پیش کی گئی خانِ قلات کی یادداشت میں یہ کہا گیا ہے کہ قلات کا حکمران خاندان، عربی النسل تھا۔ میر احمد یار خان نے اپنی تحریروں میں یہ موقف اختیار کیا کہ بروہی، بلوچوں کی ایک شاخ ہیں۔[130] اس لیے انہوں نے اپنے آباواجداد کی مانند ''خانِ بروہی'' کی بجائے ''خانِ قلات'' کا لقب اختیار کیا۔ 1947-48ء سے ہی قلات کی پارلیمان نے قلات کی ریاست کے لیے بلوچی کو ہی واحد قومی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ یہ امر نہایت دلچسپی کا حامل ہے کہ یہ قرارداد بروہی النسل ارکان کی مکمل اکثریت کی طرف سے پیش اور منظور کی گئی۔[131] گل خان (بروہی النسل) نے اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ بروہی، بلوچوں کی نسل سے ہیں۔

ماہر بشریات سونڈلر نے بروہیوں کے متعلق تحقیق کی اور زور دیا کہ ''تہذیب وثقافت، روایات اور سیاسی تنظیم میں بہت سی مشابہتیں موجود ہیں۔''[132] نینا سونڈلر (Nina Swidler) کو زبان کے سوا بلوچوں اور بروہیوں کے درمیان کسی بھی قسم کا فرق معلوم نہیں ہوا۔[133]

اگرچہ بروہی، دراوڑی (Dravidian) زبان ہے لیکن اس کا محض 25 فیصد ذخیرۂ الفاظ دراوڑی (Dravidian) زبان پر مشتمل ہے۔[134] سلیگ ہیرسن (Selig Harrison) لکھتا ہے کہ ''جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے، بروہی، بلوچی زبان سے کہیں مختلف ہے۔'' بہرحال، چوں کہ بروہی ایک دراوڑی (Dravidian) زبان ہے، اس لیے کوئی لسانی فرق تو لازمی ہونا چاہیے۔ ہیریسن مزید لکھتا ہے، ''بہرحال، اس امر کے ضمن میں مسلسل اختلاف موجود ہے کہ کیا بروہی کے پرجوش حامی، اس کی خاص خصوصیات پر زور دیتے ہیں جب کہ بلوچ قوم پرست اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ بروہی اور بلوچی، دونوں کے درمیان بہت فرق ہے اور بروہی زبان میں اس قدر اجنبی الفاظ شامل ہو گئے کہ بلوچی زبان، بروہی سے زیادہ سے زیادہ مختلف ہو چکی ہے۔[135]

Scanned by CamScanner

ایک اور دلچسپ عنصر جو بلوچ قوم پرستی کے دعوے کو تقویت بخشتا ہے، بروہی کی دہری لسانی نوعیت ہے۔ بروہیوں کی اکثریت، بلوچی کو اپنی دوسری زبان سمجھتے ہیں۔ قلات کا شاہی خاندان، بزنجو سردار خاندان یا مکران اور ایران کے بزنجو بلوچی بولتے ہیں۔

لہٰذا، بروہی زبان و ''نسل'' بلوچ قوم پرستی کی ترقی کے لیے کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی رکاوٹ ہے اور شاید کسی روز بلوچوں کی طرف سے دوسری نسلوں کے لوگوں کو خود میں جذب کرنے پر روایت، اس لسانی ''مسئلہ'' کو حل کر دے گی۔[136]

بلوچ قبائل اور ان کی بستیاں

باب کے اس حصے میں ہم متعدد بلوچ قبائل کے متعلق معلومات فراہم کریں گے، اس لیے ضروری ہے کہ ان کی جغرافیائی بستی کے متعلق علم حاصل کیا جائے۔ درج ذیل گوشوارے میں قبائل کی بستیاں دی گئی ہیں:

مغربی بلوچستان کے قبائل[137]

آبادی کی اکثریت بلوچ ہے اور مختلف قبائل اور ان کی شاخوں میں منقسم ہیں۔ مندرجہ ذیل بلوچ قبائل، ایرانی مکران میں رہتے ہیں:

☆ ہوت (Hoat) عددی لحاظ سے طاقتور ترین ہیں اور ساحلی علاقوں، لاشر اور بام پور کے جنوبی علاقے اور شاہ بہار میں رہتے ہیں۔

☆ بلیدی (Buledi) راسک، قرسقند اور فانوش میں رہتے ہیں۔

☆ شرخزئی ناہرئیس (Sherkhanzai Nahruis) بنیادی طور پر رودبار سے آئے تھے اور انہوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں اس پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں انہیں ایرانیوں نے یہاں بے دخل کر دیا۔ پھر وہ جیہ، فانوش اور بنت میں رہائش پذیر ہو گئے۔

☆ برزنئی (Baranzai) (یا برکزئی Barakzai)، بام پور، بلوچستان میں سب سے طاقت ور قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قبیلے نے 1928ء تک بلوچستان پر حکومت کی: مغربی بلوچستان کی وفاقی اکائی کا آخری بلوچ حکمران، میر دوست محمد، برزنئی تھا۔ اسے شاہِ ایران رضا اوّل نے قتل کروا دیا تھا۔ برزنئی قبیلے نے جلک، ڈیزک اور ارفشان کے علاقوں کو حاصل کر لیا تھا۔ لاشاری بہت ہی مشہور قبیلہ ہے جو پیپ (Pep) اور کوہِ اواران (Kuh-e-Ahuran) کے درمیان جنوبی بام پور کے میدانی علاقوں میں رہتا ہے۔

Scanned by CamScanner

☆ بزرگزداس(Bazurgzudas) قبیلے کا کہنا ہے کہ وہ کردوں کی نسل سے ہیں۔کئی صدیوں تک وہ جلک، ڈیزک اور سب(Sib) پر حکومت کرتے رہے ہیں۔

☆ نوشیروانیوں (Nausherwanis) کا دعویٰ ہے کہ وہ رند نسل سے ہیں، انہوں نے خاران (مشرقی بلوچستان) سے ہجرت کی اور کوہک(Kuhak) میں آباد ہو گئے۔[138]

بام پور اور ڈیزک کے قبائل سمیت مکران کے بلوچ قبائل کے علاوہ درج ذیل قبائل ہیں جو مغربی بلوچستان کے سرحدی علاقے میں رہتے ہیں۔ ریکی(Rekis) قبیلہ، کوہ تفتان کی شمالی ڈھلانوں سے لے کر ہلمند کے علاقے میں رہتے ہیں۔ان کا دعویٰ تھا کہ وہ رند نسل سے ہیں اور ان کی تین اہم شاخیں ہیں۔

☆ عزمیلوئیوں(Izmailzai) کا کہنا ہے کہ وہ کوہِ ملک سیاہ ڈیکانی باغیاس کے جنوبی پہاڑی علاقے میں واقع ریکی کے مغرب میں رہتے ہیں، نیز جنوب کی طرف کوہِ مرغک تک ان کی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔

☆ مغربی مری یا دمانی (Western Marris or Damanis) قبیلے کا کہنا ہے کہ وہ مغربی بلوچستان کے مری النسل ہیں اور دو مختلف قبائل، یار محمد زئی اور گمشادزئی میں منقسم ہیں۔وہ خواش کے گردونواح اور گشت، جلک میں ارنداگان، بام پور کی طرف رہتے ہیں۔[139] سرحد کے کرد، کوشاہ، خواش اور تامن کے گردونواح میں رہتے ہیں۔وہ سیاسی لحاظ سے دمانویوں کے زیر اثر ہیں۔[140]

☆ میر بلوزئی(Mir Bolozai)، ایک زرعی بلوچ قبیلہ ہیں جو سرحد بھر کے قابلِ کاشت رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

☆ پارسی النسل تمندانی(Tamandanis) قبیلہ، کوہِ تفتان کی بلند ڈھلانوں پر رہتا ہے۔

☆ ریشم زئی(Rashamzai) قبیلہ خود کو سیستان کے بلوچوں کی نسل سے سمجھتا ہے۔وہ ریکی کے ساتھ رہتے ہیں۔

☆ بروہی (Brahuis) مغربی بلوچستان سے ہجرت کر کے آئے، ڈوجنگ کے قریب رہائش پذیر ہیں اور انہیں ریکی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

☆ عربابی اور دہوار(Arbabis and Dehwars) کو بھی خواشی کہا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ تاجک النسل ہیں۔[141]

Scanned by CamScanner

☆ بام اور نرماشر شیخی (Bam and Narmashir Shaikhi) ریگان کے جنوب مشرق میں زیبو کے نزدیک اور پھر چاہ ڈیگل کے علاقے میں رہتے ہیں۔ وہ خود کو رند نسل کا کہتے ہیں۔

☆ بلوچ یا بندر عباس اور بیبان (Baluch or Bandar Abbas and Baiban) بندر عباس کے بلوچوں کو عباسی کہا جاتا ہے جب کہ بیبان زیادہ تر ہوت اور ریکی بلوچ کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

سیستان کے علاقے میں بہت سی نسلیں اور نسلی گروہ، مثلاً ایرانی، عرب اور ترک رہتے ہیں لیکن سب سے اہم بلوچ ہیں، جو اکثریت پر مشتمل ہیں۔ سیستان میں ناروئی بلوچوں کی تعداد وافر ہے۔ ان کی اکثریت خواجہ احمد اند جلال آباد کے علاقوں میں رہتی ہے۔ شاہ نامہ زل، رستم اور سہراب جیسے افسانوی ہیرو نوروئی بلوچ تھے۔

☆ سنجرانی بلوچ (Sanjarani Baluch)، سیستان (افغانستان) کے سابق حکمران، سنجرانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ مختلف شاخوں میں منقسم ہے اور ایران، افغانستان اور پاکستان میں رہتا ہے۔[142]

☆ توخی یا توکی (Tauki or Tauki) تین ذیلی شاخوں، ساروئی، جمالزئی اور گرجیہ میں منقسم ہیں۔

☆ زرکزئی بلوچ (Zarakzais Baluch)، سیستان میں ہیومن اور ڈازک کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

☆ مری بلوچ (Murai Baluch) پالاگان کوہ زریں کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

☆ بروہی (Brahuis)، لوتک کے قریب رہتے ہیں۔

صوبہ خورسان، مختلف نسلوں، مثلاً تاجک، کرد، افشار، کاجر، تاتار، عرب اور بلوچ نسلوں کا مرکب صوبہ ہے۔ کرزن، جس نے مغربی بلوچستان کا سفر کیا، نے ایران کے متعلق اپنی کتاب میں لکھا کہ بلوچوں کی آبادی 10,000 ہے لیکن کُل آبادی 1,160,000 ہے۔[143] اہم شہروں میں سارا خس (ایرانی اور روسی سرحد کے قریب)، تربت، حیدری اور تنبت شیخ جام ہیں۔ ان میں سے اہم ترین قبیلے درج ذیل ہیں:

☆ زورابدی بلوچ (Zorabadi Baluch) اپنی گھڑسواری کے لیے مشہور تھے۔ نصف قبیلہ 1918ء میں کریم خان کی قیادت میں روس ہجرت کر گیا جہاں انہوں نے انقلابی بسماسش کا مقابلہ

کرنے کے لیے سرخ فوج کی مدد کی۔[144]

☆ جان برگی (Jan Bagri) قبیلہ، سارخس اور زوہاباد کے نزدیک رہتا ہے۔

☆ سازار خانیہ (SaZar Khania)، جنگل، بنگل، باغ، بخشی، گیسور، شاہانِ بالا اور الیک کے نزدیک رہتے ہیں۔

شمال مغربی بلوچستان (افغانستان) درج ذیل علاقوں پر مشتمل ہے:

(i) سیستان یا چکنسور

(ii) گارمسل

(iii) راجستان

آبادی کی اکثریت خانہ بدوش تھی۔ ایک ممتاز بلوچ قبیلہ سنجرانی ہے جس نے سیستان پر حکومت کی اور ان کا دارالحکومت چکنسور تھا۔[145]

مشرقی بلوچستان

ڈیرہ اسماعیل، تین تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ تحصیل کانک میں پشتون اور جٹ قبائل کی اکثریت ہے جب کہ ڈیرہ اسماعیل اور کولوچی تحصیلوں میں بلوچ قبائل کی اکثریت ہے۔ مندرجہ ذیل اہم بلوچ قبائل ہیں: ہوت (Hoat) کا قبیلہ ڈیرہ اسماعیل خان کے شمال میں رہتا ہے جہاں انہوں نے ملک پر تین سو سے زائد برس حکومت کی۔ وہاں ان کے اہم شہر، خان پور، گرسل اور پہاڑ پور ہیں، نیز یہ پنجاب میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ 1878ء میں یہ قبیلہ 20,000 خاندانوں پر مشتمل تھا۔[146]

☆ کولونچی (Kolanchi)، کولاچی (Kulachi) ڈیرہ اسماعیل خان کے جنوب میں رہتے ہیں۔ 1878ء میں ان کی طاقت 30,000 اور 40,000 خاندانوں پر مشتمل تھی۔ بلوچستان کی مردم شماری کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے کہ کولونچی، بلڈ قبیلہ کی ایک شاخ ہے۔[147] مزید برآں، اس علاقے میں کورلیس (Korais)، گشکوری (Gishkoris)، قیصرانی (Kaisranis)، جمالی (Jamalis)، بزدار (Buzdar) اور بروہی (Brahuis) قبائل بھی ہیں۔

ڈیرہ غازی خان:۔

☆ نوتکانی (Nuktani) ایک رند النسل قبیلہ تھا جو سانگھڑ یا تونسہ کے ذیلی ضلع میں رہتا ہے۔

Scanned by CamScanner

نوتکانی کا اہم شہر مینگرو تھا۔

☆ میرانی یا مارلینی (Miranis or Marlanis) کو دودائی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ڈیرہ غازی خان پر تیرہ سو برس حکومت کی اور صوبے بھر میں پھیل گئے۔ ان کی شاخ، گورشانی (گورچانی) قبیلہ، کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کورلیس (Korais)، گورمانی (Gormani)، جسکانی (Jaskani)، چانڈیا (Chandia)، پتافی (Pitafi)، لاشاری (Lashari)، دشتی (Dashti) اور کھیتران قبیلے بھی ہیں جن کی رہائش ڈیرہ جات کے میدانی علاقوں میں ہے۔ میدانی علاقوں کے مکین قبائل کے علاوہ مندرجہ ذیل بلوچ قبائل قیصرانی، بزدار، لُنڈ، کھوسہ، لغاری، گورچانی، دریشک اور مزاری، کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں رہائش پذیر ہیں۔

جیکب آباد

اس ضلع میں مندرجہ ذیل بلوچ قبائل کی اکثریت ہے: مری، کھوسہ، مزاری، بگتی، جاکھرانی اور خیری۔ تہذیبی اور جغرافیائی طور پر یہ ضلع بلوچستان کا ایک حصہ ہے۔

انتظامی بلوچستان (پاکستان)[148]

اس علاقے میں مندرجہ ذیل قبائل غالب اکثریت کے مالک ہیں:

علاقے کا نام	قبیلے کا نام
کوہلو ایجنسی (ضلع سبی کے قبائلی علاقے)	مری، بگتی
کوہلو	مری
کھان	کھیتران اور لغاری
سبی اور نصیر آباد	جمالی، گالا، کھوسہ، گشکوری، عمرانی اور بلیدی
کوئٹہ تحصیل	بروہی، کُرد، رند اور کانسی پٹھان
سابق ریاستِ قلات	رند، کُرد، رئیسانی، مگسی، مینگل، بزنجو، قمبرانی، زہری، شاہوانی، مندوانی، لہریا اور دیگر بروہی قبائل
خانان کی سابق ریاست	نوشیروانی، ناہروز
چاغی	جمالدینی، رخشانی، سنجرانی اور ناہروئی

Scanned by CamScanner

مکران	رند، گچکی، بلیدی، ہوت، رئیس، نوشیروانی، بزنجو اور لاشاری
سابق لسبیلہ ریاست	مینگل، رند اور لاسی

جنوبی بلوچستان (گوادر بندرگاہ)

اٹھارہویں صدی سے اس علاقے پر سلطنتِ اومان کے سلطانوں کی حکومت تھی۔ جغرافیائی اور نسلی لحاظ سے یہ بلوچستان کا حصہ ہے۔[149]

Scanned by CamScanner

باب3

قومی تہذیب وثقافت اورادب

جدید قوم پرستی کی ترقی اور نشوونما کے لیے زبان سمیت تہذیب وثقافت اور ادب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب لوگوں کی تہذیب وثقافت مشترک ہوتی ہے تو ان کے درمیان ابلاغی رابطہ نہایت آسانی کے ساتھ قائم ہوجاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خیالات اور احساسات سے بخوبی آگاہ ہوجاتے ہیں۔ اس طرح، ان کے درمیان ایک مشترکہ شعور وادراک پیدا ہوجاتا ہے جو ان کے نظریہ قوم پرستی کی بنیاد ہے۔ مزید برآں، مشترکہ تہذیب وثقافت کے باعث ایک مشترکہ زبان ادب جنم لیتا ہے۔ زبان وادب، جدید قوم پرستی کے ستون ہیں۔

تہذیب وثقافت (زبان وادب) نے بلوچ قوم پرستی کے فروغ میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلوچ اپنے ہمسایوں، ترکمانوں، ایرانیوں (افغان ایرانیوں)، سندھیوں، پنجابیوں (پاکستان)، پشتونوں (پاکستان اور افغانستان) اور عربوں (ایران/اومان) سے زندگی کے متعلق اپنے مختلف طرزِ فکر کے لحاظ سے اور اس کے باوجود تہذیبی وثقافتی طور پر بے حد مختلف ہیں کہ تاریخ کے جبر کے باعث انہیں ایران، افغانستان، برطانوی ہند اور پاکستان کی ریاستوں کے ساتھ رہنا پڑا۔

زبان

بلوچوں کی بنیادی زبان بلوچی کے علاوہ بھی کئی دیگر چھوٹی زبانیں موجود ہیں جو متحدہ یا عظیم تر بلوچستان کی نسلی سرحدوں میں بولی جاتی ہیں۔[1] جو بلوچ یہ چھوٹی چھوٹی زبانیں (بروہی، سرائیکی، سندھی اور دہواری ایرانی) بولتے ہیں، وہ ذوالسانین ہیں۔[2]

مغربی بلوچستان (ایران/افغانستان)، خانانِ بلوچستان اور برطانوی بلوچستان میں انگریزی اور فارسی، سرکاری زبانوں کی حیثیت سے مستعمل تھیں۔ 1947ء میں آزاد خانانِ بلوچستان

نے ''بروہی'' کو سرکاری اور قومی زبان قرار دیا اور یہ پالیسی مارچ 1948ء تک جاری رہی۔[3]

1948ء میں جب پاکستان کے ساتھ بلوچستان کا الحاق ہو گیا تو پھر بلوچ کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان جب کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے رائج کر دیا گیا۔ گوادر (1958ء تک یہاں سلطنت اومان قابض تھی) کے علاقوں میں سرکای زبان عربی تھی۔

بروہی زبان بے شمار مقامی بولیوں پر مشتمل ہے۔ ماہرین لسانیات مندرجہ ذیل بڑی بولیوں پر اتفاق کرتے ہیں: (i) مشرقی بلوچی (ii) مغربی بلوچی

مشرقی بلوچی، کراچی کے شمالی علاقے سے ڈیرہ اسماعیل خان اور کوہ سلیمان تک (بشمول مری اور بگتیوں کے علاقوں) اور پھر سندھ کے بلوچوں کے علاوہ پنجاب میں ڈیرہ جاٹ اور پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے (موجودہ خیبر پختونخوا) میں بولی جاتی ہے۔ اس بولی نے بہت سے سندھی (سنسکرت سمیت) اور پشتو الفاظ مستعار لیے ہیں اور اس زبان کے ذخیرہ الفاظ کے ضمن میں بھی کردار ادا کیا ہے۔[4]

مغربی بلوچی بولی، کراچی (پاکستان) اور کرمان (ایران) کے درمیان، سوویت روس میں ترکمانستان، سلطنت اومان، ایرانی صوبے خورستان اور سیستان (ایران/افغانستان) کے بلوچوں میں بولی جاتی ہے۔ اس بولی نے اپنی ہمسایہ زبانوں مثلاً ترکمانی، فارسی، پشتو اور عربی سے ہزاروں الفاظ مستعار لیے ہیں۔

بلوچی زبان کا ایک مختلف تاریخی پس منظر ہے اور اس کی کسی بھی ہندوستانی زبان سے کوئی مشابہت یا تعلق نہیں۔ محمد علی جناح نے 1940ء میں کابینہ مشن کو آزاد خانان بلوچستان کی جو یادداشت پیش کی تھی، اس میں کہا گیا تھا، ''ہماری زبان کے نقطہ نظر کے لحاظ سے، ہندوستان اور قلات کے درمیان بہت کم مشابہت اور تعلق پایا جاتا ہے۔ بلوچی زبان کا تعلق انڈو یورپی زبانوں کے خاندان کی ایرانی شاخ سے ہے۔[5]

اسی یادداشت میں یہ بھی کہا گیا کہ بروہی زبان، ایک دراڑوی (Dravidian) زبان ہے جس کا وسطی ہند کی گونڈ (Gond) بولی کے علاوہ کسی دوسری ہندوستانی زبان سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق اور مشابہت نہیں۔ بلوچی زبان کا فارسی یا پشتو (ایران اور افغانستان کی قومی زبان) کے ساتھ تعلق کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہیریسن لکھتا ہے، ''بلوچ ایک منفرد زبان ہے اور اس کا قریبی تعلق صرف اور

Scanned by CamScanner

صرف ایرانی زبانوں کے ایک گروہ، کردی(Kurdish) کے ایک رکن سے ہے۔لیکن یہ اپنی مخصوص خصوصیات کی حامل ہے۔[6]

ماخذ اور ابتدا

بلوچی زبان کی ماخذ ایک گمشدہ زبان ہے جس کا تعلق پارتھی(Parthy) یا میڈی(Medean) تہذیب سے تھا۔اسے کرد(Kurdish) کی مانند ہندی یورپی زبان کے خاندان کی زبانوں فارسی، پشتو اور اوسی کے ایرانی گروہ کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ تاریخی لحاظ سے بلوچی زبان کی ابتدا 200 BC اور 700 BC کے درمیان ہوئی۔ بلوچی زبان کے ایک ماہر اور عالم جے ایلفین بائن (J.Elfenbein) نے بلوچی زبان اور قرونِ وسطیٰ کی پراتھی اور فارسی کے ساتھ تقابل کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا:

''بلوچی زبان کا ماخذ پراتھی ہے نہ ہی قرون وسطیٰ کی فارسی ہے بلکہ اس کا ماخذ ایک گمشدہ زبان ہے جس کی خصوصیات کچھ منفرد اور ممتاز خصوصیات ہیں۔[7]

زبان کی کرد زبان کے ساتھ مشابہت اور تعلق کے حوالے سے اس کا قدیم میڈی (Medean) پس منظر ہے۔اس مصنف نے زوردار انداز میں اپنا یہ موقف بیان کیا ہے کہ بلوچی زبان کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں۔اسی نقطہ نظر کا اظہار ایل ڈیمز(L.Dames) نے اپنی کتاب "Baloch Race" میں کیا ہے جس میں مصنف نے بتایا ہے کہ ''بلوچی زبان، قدیم فارسی کی بجائے زند(Zand) یا قدیم بیکٹیرین(Old Bactrian) سے مشابہ ہے۔[8] زبان کی خصوصی حیثیت کا برصغیر ہند کی کسی بھی زبان سے کوئی مشابہت یا تعلق نہیں ہے۔مزید برآں، ہندی یورپی زبانوں کے خاندان کے ایرانی گروہ کی ایک ''منفرد اور ممتاز'' زبان کی حیثیت سے، بلوچی زبان نے بلوچوں کے حق خودارادیت کے مطالبہ کے شعور و احساس کو تقویت بخشی ہے۔

تحریریں اور نسلی حدود

انیسویں صدی سے قبل، بلوچی ایک غیر تحریر شدہ زبان تھی جو بلوچ عدالتوں میں رائج تھی۔ ہندوستان اور وسطی ایشیائی سلطنتوں میں سرکاری تحریری زبان، فارسی تھی۔ یہ برطانوی ماہرین لسانیات اور سیاسی مؤرخ ہی تھے جنہوں نے رومن رسم الخط کے ساتھ بلوچی زبان تحریری شکل میں متعارف کرائی۔[9] انیسویں صدی میں اور پھر بعد میں، بلوچ ماہرین لسانیات نے جن پر ان کے جغرافیائی اور تاریخی ماحول کے اثرات نمایاں تھے یا پھر انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کے باعث ''نستعلیق'' رسم

Scanned by CamScanner

الخط (فارسی رسم الخط) اور نسخ (عربی رسم الخط) اپنا لیا۔ بلوچ ماہرین لسانیات، دانشوروں اور صحافیوں میں نسخ رسم الخط مقبول ہو گیا۔ بلوچ ماہرین لسانیات اور دانشوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے رومن رسم الخط کو پسندیدگی کی سند عطا کی لیکن 1948ء تک ان کی آواز میں زیادہ قوت نہ تھی۔[10]

انیسویں صدی سے ہی نسلی اور لسانی بنیادوں پر بلوچستان کی حدود کی نشاندہی کرنے کی کئی کوششیں کی گئیں۔ انیسویں صدی میں جب میر ناصر خان دوم کے دربار میں موجود برطانوی نمائندوں نے بلوچستان کی سیاسی حدود کے متعلق سوال کیا تو خان نے جواب دیا کہ اس سوال کا جواب تو بہت عرصہ پہلے اُن کے پردادا نے دے دیا تھا۔ عظیم میر ناصر خان نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا، ''جہاں جہاں اور جس جس جگہ بلوچ آباد ہیں، وہ بلوچ ریاست کی سرحدیں ہیں۔''[11] اگرچہ یہ جواب مبہم تھا لیکن زبان اور تہذیب وثقافت کی بنیاد پر خان ایک عظیم سلطنت کی خواہش اور اس کا مطالبہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔ 1843ء اور 1848ء کے موسم خزاں میں، برطانویوں نے سندھ اور پنجاب پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا اور ان کا براہ راست سامنا بلوچ اور پشتون قبائل سے ہوا جو خانِ قلات اور امیرِ کابل کی رعایا تھے۔ سندھ اور پنجاب کے سرحدی صوبوں میں بلوچ اور پشتون قبائل کی اکثریت تھی، دونوں صوبوں کی حدود مہم جوئی اور ضرورت کا نتیجہ تھیں۔ 1875ء میں برطانویوں کو برطانوی ہند کے سرحدی صوبوں میں انتظامی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

1876ء میں لارڈ لٹن (Lord Lytton) کی ہندوستان میں حکومت نے فیصلہ کیا کہ انتظامی اور سٹریٹجک بنیادوں پر صوبہ پنجاب اور بمبئی پریزیڈنسی کا نقشہ تبدیل کر دیا جائے۔

22 اپریل 1877ء کو لارڈ لٹن نے ''سرحدوں کی از سرِ نو تنظیم'' کے موضوع پر ایک یادداشت تیار کی اور اس منصوبے کے مطابق اس نے دو نئے صوبوں کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس کی سفارشات کے مطابق سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا جانا تھا اور سندھ و پنجاب کا ایک نیا متحدہ صوبہ تشکیل کیا جانا تھا۔ اس نے پنجاب کے سرحدی اضلاع، مثلاً ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خاں، ڈیرہ غازی خان (ڈیرہ اسماعیل خاں کے Cis-Indus حصے اور بنوں شامل نہیں تھے) اور کراچی کے علاوہ سندھ کا Trans Indus District پر مشتمل ایک نیا صوبہ تجویز کیا۔ سندھ پنجاب صوبہ کی ترقی کے لیے سمندری بندرگاہ کی حیثیت سے کراچی کو اہم سمجھا گیا۔

مزید برآں، اس نے مجوزہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے لیے ''چیف کمشنر'' کی تجویز پیش

Scanned by CamScanner

کی۔ یہ صوبہ دو ڈویژنوں پر مشتمل ہونا تھا جس کا صدر دفتر پشاور ہوتا۔ اس منصوبے کے مطابق، حکومت کو ایک کمشنر کے تحت دو بڑے ڈویژنوں، بالائی اور زیریں ڈویژن، ہر ڈویژن کا ایک الگ کمشنر ہوتا، میں تقسیم کرنا مقصود تھا۔ مزید برآں، جنوبی ڈویژن کا کمشنر، بلوچستان کے لیے گورنر جنرل کا ایجنٹ بھی ہوتا۔[12]

صوبوں اور ڈویژنوں کی نسلی اور انتظامی ہیت مندرجہ ذیل تھی:

صوبہ کا نام	ڈویژن	ضلع	زبان
شمال مغربی سرحدی صوبہ	زیریں یا بلوچی اور جنوبی ضلع، جس میں سکھر اور کراچی شامل تھے	ڈیرہ غازی خان	بلوچی
		شکارپور	
	بالائی یا پشتون	ہزارہ، پشاور	پشتو
	کوہاٹ، بنوں		
	ڈیرہ اسماعیل خاں، جنوبی بلوچ علاقے کے علاوہ		
صوبہ سندھ۔ پنجاب	سندھ کا Cis ضلع بشمول کراچی اور پنجاب کے Cis-Indus اضلاع (ہزارہ کا Cis-Indus ضلع شامل نہیں		سندھی اور پنجابی

نئے صوبوں اور ان کی مزید انتظامی تقسیم کا لارڈ لٹن کا منصوبہ سائنسی تھا جس کی بنیاد تاریخ اور تہذیب و ثقافت تھی۔ اس نے لکھا: ''سرحدی اضلاع تقریباً ہر قسم کی تخصیص کے لحاظ سے علیحدہ ہیں۔ وہ جغرافیائی، تاریخی، نسلی، ادارہ جاتی اور رسوم و رواج کے لحاظ سے پنجاب سے علیحدہ ہیں۔ دریائے سندھ، اپنے راستے کے زیادہ تر حصے کے ذریعے دو مخصوص علاقوں کے درمیان قدرتی اور چھوٹی سی حد بندی تشکیل دیتا ہے۔ ان میں زیادہ تر ان نسلوں کے افراد رہتے ہیں جو Cis-Indus کے علاقوں میں رہتے ہیں؛ ان میں رائج قبائلی نظام Cis-Indus کی آبادی سے کہیں مختلف ہے۔[13]

مئی 1877ء میں لارڈ لٹن کی حکومت نے پشتو اور بروہی بولنے والوں پر مشتمل سرحدی صوبے کے تجویز ہندوستان کے وزیر خارجہ، Marquis of Salisbury کو پیش کی۔ نومبر 1877ء میں سالسبری (Salisbury) نے پشتو بولنے والوں اور سرحدی صوبے کے منصوبے سے اتفاق کیا، ''عزت

آب کی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی تجاویز کے مطابق، میں مندرجہ ذیل اقدامات کے نفاذ کی منظوری دینے کے لیے تیار ہوں:

a) پنجاب اور سندھ میں دریائے سندھ کے کنارے آباد اضلاع کو دو ڈویژنوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور حد بندی کی لکیر وہاں لگائی جائے گی جہاں بلوچ، پٹھانوں کو جانے کا راستہ دیتے ہیں۔

b) وائسرائے کی طرف سے ہر ڈویژن کے لیے ایک کمشنر کا تقرر کیا جائے گا لیکن جہاں تک داخلی معاملات کا تعلق ہے، ہر کمشنر، حکومت پنجاب سے احکامات وصول کرے گا۔

c) شمالی کمشنر کو گورنر جنرل کا ایجنٹ کہا جائے گا، نیز سرحد کے کمشنر کو گورنر جنرل کا ایجنٹ کہا جائے گا، مزید برآں تمام خارجہ امور یعنی ان کے معاملات جو ملکہ معظمہ کی رعایا نہیں، وائسرائے کی ہدایت کے مطابق نمٹائے جائیں گے۔ وائسرائے، جنوبی کمشنر کا افسر اعلیٰ ہوگا جو ان معاملات کے متعلق اکیلا ہی وائسرائے کے ساتھ معاملات طے کرے گا۔

d) کم از کم فی الحال، سرحدی افواج، کمانڈر اِن چیف کے احکامات کے تحت نہیں بلکہ گورنر جنرل کے ایجنٹ کی ماتحت ہیں۔"[14]

بہر حال، انگلستان میں شدید مخالفت کے باعث نئے صوبوں کو برطانوی ہندوستان کے سیاسی نقشے میں نہیں دکھایا گیا۔[15] برطانوی حکومت نے 1877ء میں سنڈیمن (Sandeman) کو کوئٹہ، بلوچستان میں گورنر بلوچستان کا ریزیڈنٹ، چیف کمشنر اور ایجنٹ مقرر کر دیا۔ اس نے وسطی ایشیا کے علاوہ خلیج فارس میں برطانوی مفادات کے تحفظ کی خاطر برطانوی حکومت کو تجویز پیش کی کہ خانِ قلات کے نام سے تمام بلوچ علاقوں کو متحد کر دیا جائے۔[16] اس کے منصوبے کی بنیاد نسلی اور ثقافتی بنیادوں پر تھی۔ لٹن کے منصوبے کے مطابق، حکومت پنجاب کی مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز عملی صورت نہ اختیار نہ کر سکی۔[17]

انیسویں صدی کے اواخر اور حال ہی میں 1903ء میں جے برائٹ (J.Bright) اور ایچ ریسلے (H.Risley) نے برطانوی ہند کی تنظیم نو کے ضمن میں تجویز پیش کی کہ اس کی بنیاد زبان کو بنایا جائے۔[18] ان تمام تجاویز کے مطابق، لارڈ کرزن کی سربراہی میں صوبوں کی تنظیم نو کے ضمن میں زبان کو بطور بنیاد تسلیم نہیں کیا گیا۔[19]

1901ء میں پنجاب کی تقسیم کے سلسلے میں لارڈ کرزن نے لٹن کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے پشتو بولنے والوں کے لیے شمال مغربی سرحدی صوبہ تشکیل دے دیا، "لیکن اس فیصلہ کی بنیاد اس

Scanned by CamScanner

حقیقت پر ہونے کی بجائے کہ یہ علاقہ ایک مخصوص لسانی حصہ ہے، سٹریٹجک حالات تھے۔[20] (سرحدی صوبے کے ایک حصے کے طور پر بلوچ ڈویژن کی تشکیل کو اس لیے نظرانداز کر دیا گیا کہ ضلع ڈیرہ غازی خان سمیت سندھ کے بلوچ اضلاع، برطانویوں کی طرف سے بلوچستان کے بلاواسطہ انتظام کے باعث نظرانداز کر دیئے گئے۔[21]

بلوچ سرحدی صوبہ کی عدم تشکیل کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ برطانوی، لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل کا خطرہ مول لینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کیوں کہ اس کے باعث غیر ملکی حکومت کی طرف سے زیادتی اور ظلم وستم کے احساس کو یقیناً تقویت ملتی۔ نئے صوبے کی تشکیل سے بلوچستان کی تاریخ تبدیل ہو جاتی اور اسے تسلیم کرنے کے ذریعے بلوچی زبان، ادب اور متوسط طبقے کی حالت بہتر ہو جاتی اور یورپی سیاسی نظریہ، مثلاً قوم پرستی سے متاثر مغرب سے تعلیم یافتہ بلوچ دانشوروں کی حالت بہتر ہو جاتی۔

1917ء میں کئی ایک ہندوستانی تنظیموں نے مونٹیگو (Montagu) اور چلسمفورڈ (Chelsmford) کو تجویز پیش کی کہ لسانی یا نسلی بنیادوں پر برطانوی ہندی صوبوں کی تنظیم نو کی جائے۔ بہر حال، مونٹیگو چیلسمفورڈ رپورٹ (Montagu-Chelmsford Report) میں یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔[22]

1927ء میں سائمن کمیشن (Simon Commission) نے نہ صرف زبان کی بنیاد پر صوبوں کی از سر نو تنظیم کی حمایت کی بلکہ مذہب، جغرافیائی الحاق، معاشی مفاد اور نسل جیسے دیگر عناصر کو بھی مدنظر رکھا۔[22] حکومت ہند نے 1930ء میں ''آئینی اصلاحات کے لیے تجاویز کا مراسلہ'' (Despatch on Proposals for Constitutional Reforms) شائع کیا جس میں تنظیم نو کی ضرورت سے اتفاق کیا گیا۔ بلوچستان کے بارے اطلاع دیتے ہوئے بیان کیا گیا کہ ''کسی بھی قسم کی موجودہ تبدیلی درکار نہیں۔ جب کہ مغربی اداروں نے بھی ابھی تک اپنی طرف سے کسی بھی قسم کی تبدیلی کا اظہار نہیں کیا۔[23] زبان، تاریخ اور جغرافیائی بنیادوں پر بلوچ علاقوں کو متحد کرنے کے لیے لٹن رپورٹ یا سنڈیمن کی تجویز کے ضمن میں کوئی مزید تجویز پیش کی گئی نہ ہی اس معاملے کی حمایت کے ضمن میں مزید کوئی پیش رفت ہوئی۔

برطانوی حکومت نے آئینی اصلاحات اور پنجاب وسندھ کے صوبوں سے علیحدگی سے انکار کر دیا اور 1947ء تک اس ضمن میں برطانوی حکومت کی طرف سے کوئی بھی مزید پیش رفت نہیں ہوئی۔

Scanned by CamScanner

1935ء میں بلوچستان کے خان کے احتجاج کے باوجود حکومت ہند کے قانون کے تحت خانانِ بلوچستان کو برطانوی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ لہٰذا، انیسویں صدی کے برطانوی حکام (مثلاً لارڈ لٹن اور سر رابرٹ سنڈیمن) کے علاوہ بلوچستان کی سیاسی جماعتوں کی تجاویز اور مطالبات کو صریحاً نظرانداز کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے متذکرہ بنیادوں پر بلوچستان کے نقشے کی دوبارہ تشکیل کے مقبول مطالبے کو مسترد کردیا۔

بلوچستان کی سیاسی جماعتوں سے قطع نظر، آل انڈیا نیشنل کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا جیسی کئی ایک ہندوستانی سیاسی جماعتوں نے لسانی بنیادوں پر بلوچستان کی تشکیل نو کی حمایت کی۔ دراصل، غیرملکی حکمرانوں نے بلوچ عوام کے جس مطالبے کو مسترد کیا، اسی کا انڈین نیشنل کانگریس اور کمیونسٹوں نے وعدہ کررکھا تھا۔ 1920ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس میں لسانی صوبوں کی حمایت کی۔[24] دوسری بڑی جماعت، مسلم لیگ نے بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی حمایت زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرقہ ورانہ بنیادوں پر کی۔

1920ء سے ہی بلوچستان کی سیاسی جماعتوں کا مقصد یہ رہا ہے کہ لسانی اور نسلی بنیادوں پر تشکیل شدہ بلوچستان کی آزادی اور اتحاد کے لیے کوشش کی جائے۔ 1932ء میں بلوچ قوم پرستوں کا جیکب آباد میں ایک اجتماع ہوا جس میں بلوچی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ 1933ء میں انجمن کے صدر محمد یوسف علی خان عزیز مگسی نے انڈیا آفس کو ایک برقی تار کے ذریعے درخواست کی کہ ڈیرہ غازی خان، بالائی سندھ کے ان علاقوں کو بلوچستان میں شامل کردیا جائے، جہاں بلوچوں کی اکثریت ہے۔[25]

یکم مئی 1933ء کو بلوچستان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس (1932) کے چیئرمین نے جیکب آباد میں بلوچستان میں اصلاحات کے لیے ایک یادداشت پیش کی۔ بلوچستان کانفرنس جائنٹ اینڈ سلیکٹ کمیٹی (Baluchistan Conference Joint and Select Committee) کی ورکنگ کمیٹی نے منظور کرلیا۔ مزید برآں، ورکنگ کمیٹی نے بلوچستان کی مختلف لسانی، نسلی اور آئینی حیثیت کی بنا پر برطانوی ہند میں بلوچستان کے انضمام کی تجویز پیش کی۔[26]

لسانی بنیادوں پر صوبوں کے قیام سمیت کانگریس کی ترقی پسند پروگرام نے بلوچوں اور پشتونوں کو بہت متاثر کیا۔ 1939ء میں ایک پشتون سیاسی تنظیم، انجمن وطن نے ایک پشتون رہنما عبدالصمد اچکزئی کو بطور قائد چن لیا جو ''بلوچستانی گاندھی'' کے نام سے مشہور تھے۔ اچکزئی نے برطانوی

Scanned by CamScanner

صوبوں کی زبان کی بنیاد پر از سر نو تنظیم کے مقصد کی خاطر اپنی جماعت کا کانگریس سے الحاق کر دیا۔[27]

1945ء میں کانگریس کا انتخابی منشور لسانی بنیادوں پر صوبوں کے قیام کے اعادہ پر مشتمل تھا۔ 1946ء میں اچکزئی نے بلوچستان کی کئی حصوں میں تقسیم اور پشتون وافغانی علاقوں کو شمال مغربی سرحدی صوبہ (جس میں پشتونوں کی اکثریت تھی) میں ضم کرنے کی تجویز پیش کی۔ ''سرحدی گاندھی'' خان عبدالغفار خان نے انجمن وطن کے حق میں ایک مضمون شائع کیا۔[28] (یاد رہے کہ ''وطن'' پارٹی، زیادہ تر برطانوی افغانستان کے پشتونوں کی نمائندہ تھی)۔

1946ء میں ریاست قلات کی نیشنل پارٹی نے آل انڈیا کانگریس کی ایک شاخ کے ساتھ الحاق کر لیا۔ کانگریس سے الحاق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کانگریس نے اس پارٹی کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ صوبوں اور ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر از سر نو تنظیم کی جائے گی۔[29]

اپریل 1946ء میں، ریاست قلات کی نیشنل پارٹی کے جنرل سیکریٹری میر گل خان نے ایک مضمون شائع کیا جس میں بلوچستان کی قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے بلوچی زبان کی حمایت کی گئی۔ ہفتہ وار ''بولان'' کے مدیر اعلیٰ محمد حسین عنقا نے ''بلوچی زبان'' کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا اور خان سے مطالبہ کیا کہ بلوچی زبان کو سکولوں میں تدریسی زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے۔ جنوری 1947ء میں عنقا نے ''بلوچ مجلس'' کی بنیاد رکھی جس کا مقصد بلوچی زبان وادب کا فروغ تھا۔[30]

حکام نے بلوچ سیاسی جماعتوں کا مطالبہ اس لیے قبول نہیں کیا کہ بلوچستان ایک مختلف کثیر الآئینی حیثیت کا مالک تھا اور سرکاری ملازمین کی اکثریت، خاص طور پر وہ ملازمین جو محکمہ تعلیم میں تھے، پنجاب کے ہندوستانی تھے اور بلوچی سے نابلد تھے۔ اس انکار کے پیچھے سب سے اہم عنصر، بلوچستان میں قوم پرستی کی بیداری تھا۔ جہاں تک خوانین کا تعلق ہے، ان کی پالیسیاں برطانوی انتظامیہ اور ان کے ہندوستانی کلرکوں کے ہاتھ میں تھیں۔ اگست 1947ء میں خوانین آزاد ہو گئے اور بلوچی کو قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ سابق برطانوی بلوچستان میں پاکستانی حکومت نے لسانی صوبوں کے لحاظ سے برطانوی نقطہ نظر برقرار رکھا۔ تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں انگریزی اور اردو، تدریسی زبان کی حیثیت سے موجود رہیں۔

بانیٔ پاکستان ایم اے جناح نے لسانی صوبوں کو ''اسلام مخالف'' اور ''پاکستان مخالف'' قرار دیا۔ 1948ء میں بلوچ خانیت کے پاکستان کے ساتھ زبردستی الحاق کے باعث بلوچ عوام اپنی قومی

Scanned by CamScanner

زبان سے محروم ہو گئے۔ یہ پہلا عنصر تھا جو اس سال پاکستان کے خلاف پہلی ''بغاوت'' کا باعث بنا جس کی قیادت شہزادہ عبدالکریم خان نے کی۔ ریاست قلات کی بلوچستان کی آزادی کے لیے نیشنل پارٹی نے خان اور بلوچستان لیگ کی حمایت کی۔

بلوچ قائدین نے بلوچوں سے جنگ آزادی میں شرکت کرنے کی درخواست کی۔ باغیوں کی طرف سے استعمال کی گئی مندرجہ ذیل عبارت بلوچ قوم پرستی میں زبان کی اہمیت کی گواہی دیتی ہے:

''حکومت پاکستان اور ان کے دیگر ساتھی نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی سے ہماری بلوچ تہذیب وثقافت کو تحلیل کرنے کے خواہاں ہیں تاکہ ہم مستقبل میں خود کو بلوچ نہ کہہ سکیں، اپنی مادری زبان نہ بول سکیں، ہماری قدیم رسوم ورواج نظرانداز کر دیں اور ڈھٹائی اور بے شرمی پر مبنی اپنے رویے کو جاری رکھیں۔ ہم پُرعزم ہیں کہ ہم اپنی تہذیب وثقافت بچائیں گے، اپنی مادری زبان ترک نہیں کریں گے اور اپنی زندگیوں میں ہم اپنی عزتِ نفس کا آخری دم تک دفاع کریں گے۔''[31]

بلوچی ادب

بلوچی ادب کی نشوونما ایک شخص سے دوسرے شخص اور ایک نسل سے دوسری نسل کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔ شاعروں، ڈوموں اور لوریوں (پیشہ ور بھانڈ) نے بلوچی ادب کی نشوونما اور اسے محفوظ رکھنے میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا۔ بروہی کے ایک عالم، ایل ڈیمز (L.Dames) نے پیشہ ورانہ بھانڈوں کو ''قدیم روایات وحکایات کے امین'' کی حیثیت سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈوموں اور لوریوں کے ذریعے، بلوچی ادب نہایت ہی صداقت کے ساتھ آج کی نسلوں تک پہنچا ہے۔ بلوچستان میں پائے جانے والی لوری اور ڈوم، قبائلی جرگوں میں نظمیں گاتے اور اپنی وراثت کو محفوظ کرتے ہیں۔

بلوچوں میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے کہ ڈوموں اور لوریوں کی بجائے کوئی اور شخص کھلے عام نظمیں گائے، اس لیے وہ بلوچی شاعر جو اپنے شاعری کو مقبول بنانا چاہے، ڈوم یا لوری کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ درحقیقت، پیشہ ور بھانڈ اور لوگ، بلوچی ادب کو محفوظ رکھنے کے حوالے سے قابل تحسین ہیں۔

بلوچی ادب زیادہ تر شاعری پر مشتمل ہے جو ''اپنی ابتدا اور شکل کے اعتبار سے خالصتاً مقبول ہے۔'' اس ضمن میں ایل ڈیمز (L.Dames) نے لکھا:

''فارسی شاعری کی اشکال جو عالمی معیار کی تھیں، اپنی مقبولیت کے باوجود افغانستان اور

Scanned by CamScanner

اسلامی ہندوستان میں پنپ نہ سکیں۔ فارسی شاعری میں کوئی غزل تھی نہ ہی نظموں کو دیوان میں محفوظ کرنے کا انتظام موجود تھا اور نہ ہی فارسی شاعری کا علمی تفاخر اور علم عروض موجود تھا۔ جس طرح بلوچی شاعری کی اشکال سادہ ہیں، اسی طرح اس کا مواد بھی سادہ اور براہ راست اظہار پر مشتمل ہے جس میں زندگی اور ملک کی واضح جھلک ملتی ہے جو اسے ہمارے سامنے کسی بھی شعوری کوشش کے بغیر گائیک کی طرف سے پیش کرتی ہے۔ جس طرح کسی بنجر سرزمین سے توقع کی جاسکتی ہے، جہاں پانی کی قلت ہو اور کبھی کبھار ہی بارش ہوتی ہو، وہاں شاعر، طوفانِ باد و باراں کو بیان کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے جو شاذ ہی پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور پھر مضافات میں اچانک تبدیلی واقع ہوتی ہے جس کے بعد بارش آجاتی ہے۔ بوجھل فضا جو گرد اور دھند سے بھرپور ہوتی ہے، ایک شفاف اور متاثر کن تازگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر چند ہی روز میں سورج کی تیز تپش میں جھلسے پہاڑ چمکدار سبز قالین سے ڈھک جاتے ہیں، خشک آبی راستے بہتی ہوئی ندیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، آبشاروں کی روانی میں تیزی آجاتی ہے اور ہر چٹانی کھوہ میں تازہ پانی بھر جاتا ہے۔ تلوار، ڈھال اور توڑے دار بندوقوں سے مسلح گڈریے زیریں بنجر علاقوں سے اپنے ریوڑوں کے ساتھ بالائی علاقوں کی چراگاہوں کی طرف جاتے ہوئے گنگناتے ہیں، نیز خواتین بھی خوشی مناتی ہیں اور مردوں کی طرف سے آبروریزی کے خطرے سے بے نیاز اکیلے ہی پہاڑوں میں مٹرگشت کرتی ہیں۔ اس کے برعکس، جنگ اور غارت گری کے واضح مناظر عام ہیں اور ان کی یہ خصوصیت ان کے افعال اور تقاریر میں صاف نظر آتی ہے۔''

بلوچی شاعری کی اقسام اور درجہ بندی[32]

ماہرین لسانیات نے بلوچی شاعری کو مندرجہ ذیل اقسام اور درجوں میں تقسیم کیا ہے:

1) بہادری اور جرأت مندی یا رزمیہ شاعری یا جنگی رزمیہ نظمیں
2) رومانوی رزمیہ نظمیں
3) عشقیہ گیت اور غنائی شاعری
4) مذہبی شاعری
5) لوری اور پہیلیوں سمیت مختصر نظمیں
6) جدید اور قومی شاعری

بلوچی شاعری کے علاوہ بلوچی نثر کی مختلف اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

Scanned by CamScanner

a) عوامی داستانیں

b) جدید نثری ادب

بارہویں صدی کے وسط سے قبل موجود بلوچی ادب کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ان کے دشمنوں کی طرف سے ظلم وستم کے باعث اپنی بقا کے لیے زبردستی ہجرت اوران کی جدوجہد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا، کیپسین اور کرمان وسیستان کے علاقوں میں بلوچوں کوان کی لسانی روایت سے محروم کردیا گیا۔جس پہلی نظم کے متعلق ہمیں معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ بارہویں صدی کے اواخر میں اس وقت کہی گئی جب بلوچ سیستان کرمان سے ہجرت کرکے مکران پہنچے اور انہیں اپنی پہلی اکائی میر جلال خان کی سربراہی میں حاصل ہوئی۔ پندرہویں صدی میں، بلوچ اس علاقے میں پھیل گئے جسے آج مشرقی بلوچستان کہتے ہیں۔اکائی کی تشکیل کے ذریعے شاعروں کوعشقیہ نظمیں کہنے، اپنی روایتی تاریخ کوتحریری طور پر محفوظ کرنے، ان کے ہمسایوں سے تعلقات قائم کرنے، بین القبائلی عداوتوں اور برصغیر پاک وہند میں فتوحات کی کوششوں کے اظہار کا موقع ملا۔اس وقت انہوں نے اس علاقے کو ایک نیا نام، بلوچستان (بلوچوں کی سرزمین) دیا۔انہوں نے اپنے وطن سے اپنی محبت کے ثبوت کے طور پر حب الوطنی پر مبنی گیت تخلیق کیے۔

قوم پرستی کے لحاظ سے بلوچی ادب کوکئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

تاریخی شاعری

اس قسم میں بہت سی نظمیں شامل ہیں جوان کی تاریخ، مخرج، سیستان سے مکران کی طرف ان کی ہجرت، اکائی کی تشکیل اوران کی زرعی زمینوں کی تقسیم وغیرہ کے بلوچ نقطہ نظر کی نمائندہ ہیں۔ چند نظموں کے ذریعے پندرہویں صدی کے اواخر میں ہونے والی 20 یا 30 برسوں پر مشتمل خانہ جنگی، بلوچوں کی برصغیر پاک وہند میں ہجرت اور بلوچ قبائل کے اپنے باہمی تعلقات کے علاوہ ان کے مغلوں و افغانوں کے ساتھ تعلقات کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں۔اس قسم کی ایک نظم کی مثال درج ذیل ہے، جسے دفترِ بلوچ (بلوچوں کے تاریخی حالات) کہتے ہیں:

''میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا اور تعریف بیان کرتا ہوں اس کی جو اس کائنات کا مالک وخالق ہے، جب باقی تمام دنیا مٹی اور کیچڑ کا ڈھیر بن جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی دلوں کے اطمینان اور تسکین کا باعث

Scanned by CamScanner

ہوتا ہے۔ ہم امیر حمزہ کی نسل سے ہیں، کامیابی اور فتح تو ہمیشہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم حلب سے اٹھتے ہیں اور کربلا و بومپور میں یزید کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور پھر ہم سیستان کے شہر کی طرف بڑھتے ہیں۔ شمس الدین ہمارا بادشاہ تھا جو بلوچوں کا حمایتی تھا لیکن جب بدرالدین آیا تو پھر ہمارے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا گیا۔ پھر ہم کیچ (Kech) کی دائیں طرف واقع ہارین (Harin) کی بندرگاہ کی طرف چلے گئے۔"

"ہوت (Hots) مکران میں جب کہ کھوسو (Khosas) کیچ (Kech) کی سرزمین پر آباد ہو جاتے ہیں۔ ہوت اور کھوسو (یا پھر نوح (Nohs) اور دودی (Dodais) اکٹھے ہیں، وہ لاشار نامی سرزمین پر آباد ہیں۔ دریشک (Drishaks)، ہوت اور مزسر (MazSrrs)، (یا دریشک اور مزاری خوانین) رندوں (Rinds) کے برابر ہیں۔ رند اور لاشاری زیادہ تر ایک دوسرے کی سرحدوں میں آتے جاتے ہیں؛ عظیم ترین گھر، ڈومبکی (Dombki) ہے جو گج (Gaj) کے بہتے پانیوں سے اوپر ہے۔ حلب سے کلمت (Kalmatts) کے گھروں تک اکٹھے آتے ہیں۔ نوح (Nohs)، جسکانیوں (Jiskanis) کے ساتھ نالی (Nali) میں آباد ہیں۔ پژ (Phuzh)، میرالی (Mirali) اور جتوئی (Jatol) نامی تمام قبائل سوی (Sevi) اور ڈھادڑ (Dhadar) میں آباد ہیں، پژ (Phuzh) اصلی رند النسل ہیں اور میر چاکر (Mir Chakar) ان کا سربراہ ہے۔ گورگیج (Gorgezh) اپنی دولت کی وجہ سے مشہور ہیں اور وہ تھالی (Thali) کی سرزمین پر آباد ہیں۔ گولہ (Gholo)، گوپنگ (Gopangs) اور دشتی (Dashtis) رندوں کی سرزمین سے باہر رہتے ہیں، دیگر تمام بلوچ قبائل رندوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ رند قبیلہ شوران (Shoran) اور لاشاری، گنداھاوا (Ganddva) میں رہتے ہیں اور ان کے درمیان بہتے پانی کی ندی ہے اور شہک (Shaihak) ان سب کا سربراہ ہے۔

یہ ہمارے نقش قدم اور تاریخ ہے، یہ بلوچوں کے کچھ حالات ہیں، تیس برس سے ہم نے اکٹھی جنگیں لڑیں، یہ بلوچ تنازع ہے۔ شہک اور شہداد (یا پھر شہاک اور شہداد تک) کے بعد میر چاکر سب قبائل کا سربراہ تھا۔ میر کے بلانے پر چالیس ہزار آدمی چلے آئے جو ہمارے آباواجداد کی اولاد تھے اور انہوں نے اپنے دائیں بازو پر حفاظتی خول چڑھایا ہوا تھا، ان سب کے پاس تیر کمان تھے اور انہوں نے ریشمی سکارف اور اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے، ان کی پاؤں میں سرخ بوٹ تھے، علاوہ ازیں، ان کے ہاتھوں میں نقرئی چاقو اور خنجر تھے اور ہاتھوں میں سنہری انگوٹھیاں تھیں۔ وہاں بکر (Bakar)، گواہرم (Gwaharam) اور ریمن (Ramen) تھے اور سونا بکھیرنے والے جارو (Garo)، بھی جو جواب میں خاصی

Scanned by CamScanner

خباثت مظاہرہ کرتے، اور پھر ہیڈی(Hadde)، اس کا پکا بھائی، مزید برآں، پیروشاہ(Pheroshah)، بجار(Bijar) اور ریحان(Rehan) کے علاوہ میر حان(Mir-Han)، رند قبیلے کے تلوار بردار آدمی۔ وہاں صوباہ(Sobha)، میہان(Mihan) اور تمام تھے، ان کے علاوہ جام ساہک(Jam Sahak) اور علن (Allan)؛ پھر ہیوتان(Haivtan) اور بیورغ(Bivaragh)، رندوں، میر حسن اور ابراہیم میں سے تھے۔

شاعر یہ گیت تخلیق کرتا ہے اور میر جلال انہیں نہایت ہی غور سے سماعت کرتا ہے۔''[33]

حب الوطنی پر مبنی شاعری

پندرہویں اور سولہویں صدیوں کے دوران چند ہی ایسے شاعر تھے جنہوں نے رزمیہ نظمیں تخلیق کیں۔ ان نظموں میں بلوچوں کی طرف سے ان کی آبائی سرزمین کے متعلق محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، پندرہویں صدی کی نظم بیورغ(Bivaragh)، سرزمین وطن کی محبت سے لبریز ہے۔[34]

''ہم سرزمین بلوچ کو جاتے ہیں، اور سوی (سبی) کا شہر ہمارے دل کو خوشی بخشتا ہے۔''

حب الوطنی ہمیں ملکی قوانین کی اطاعت بھی سکھاتی ہے۔ یہ بیورغ(Bivaragh) کی نظم میں موجود ہے۔ وہ بلوچوں سے پُرزور انداز میں کہتا ہے کہ عزتِ نفس کے اصول کو اپنانا نہایت ہی اہم ہے، نیز وہ یہ بات بھی زور دے کر کہتا ہے دشمنوں سے خونیں انتقام لیں:

1. مضبوط اور مردِ کوہ بلوچ سردار،
   جسے نہایت ہی غیر منصفانہ طور پر
   بنایا گیا نو تیروں کا شکار۔
2. قبائلی جھگڑے میں کس کا نقصان ہوا،
   موتی جیسا بکر خان مارا گیا۔
3. اب تو میں کسی جگہ بے خیالی کے عالم میں بیٹھا ہوں گا،
   تا کہ اس قبر کو میں،
   کچھ دیر کے لیے ہی سہی، بھول جاؤں۔
4. اگر چہ یہ انتقام،
   بظاہر تو اچھا معلوم نہیں ہوتا،

Scanned by CamScanner

لیکن، پھر بھی میں اسی موقع کی تلاش میں ہوں۔

5. مجھے چاہیے کہ میں شاہ کھٹی (ایک روحانی پیشوا)،
اوران کے بیٹے سے بھی، راستے میں ملاقات کروں،
میری یہ ملاقات ایسی ہو،
جیسے کوئی شیر،
اچانک کسی بھیڑ پر اچھل کر حملہ کرتا ہے،
اوراس کی گردن توڑ دیتا ہے،
میں۔۔۔بھی اسی طرح کروں گا!

6. میں ان کا اس طرح خون چوسوں گا،
کہ میری مونچھیں، ان کے خون میں ڈوبی ہوں گی،
تب ہی، میری بے چین روح کو قرار آئے گا۔
خواہ ہمارا سردار مجھ سے ناراض ہی کیوں نہ ہو جائے،
تب ہی، میں اپنے والد محترم مرحوم کے غم کو بھول پاؤں گا۔

7. تحفے عشق کے،
وہ مجھے نہ دے،
مجھے ان کی ضرورت نہیں،
دودھ دینے والی گائیں،
اور، مضبوط گھوڑے،
وہ مجھے نہ دے،
مجھے ان کی بھی خواہش نہیں۔

8. اگر رند، مجھے اپنا عزیز نہ جانیں،
تب بھی، دودی (ہوت قبیلے کی ایک شاخ)،
میرے بھائی تو ہیں،
اگر میں سندھ چھوڑ بھی جاؤں،

Scanned by CamScanner

تو جلد ہی، ہندوستان مجھے اپنا مہمان بنالے گا۔[35]

سترہویں صدی میں ایران کے شہنشاہ، نادرشاہ نے بلوچوں پر فتح حاصل کرنے اور انہیں ایران کے زیرتسلط لانے کے لیے ایک زبردست اور بھاری بھرکم فوج بھیجی۔ ایرانی حملے سے آئندہ نسلوں کو آگاہ کرنے کی خاطر ایک نامعلوم شاعر نے یہ گیت تخلیق کیا:

''مجھے تمہارے جیسے (نادرشاہ) حکمرانوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہاری دھمکیوں اور خوف سے ہم اپنی سرزمین خالی کردیں؟ یقیناً کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا لیکن اس موقع پر میں اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

''پھر اس دن، انتہائی خوف ناک جنگ ہوئی،
تلواریں اور بندوقیں خوب کام آئیں،
بلاشبہ، کئی بلوچ مارے گئے،
لیکن انہوں نے ایرانیوں کو تباہ و برباد کردیا۔''

اٹھارہویں صدی میں افغانستان کے حکمران احمد شاہ نے بلوچوں کو حق آزادی دینے سے انکار کردیا اور خانیت کو زیرتسلط لانے کے لیے قلات پر حملہ کردیا جس کا حکمران عظیم ناصر خاں تھا۔ خان کے ایک درباری شاعر نے بلوچوں میں افغان مخالف جذبات کے اظہار کے لیے ایک نظم لکھی۔ اس نے خان، بلوچ فوج اور عوام کی تعریف کی جنہوں نے اپنے وطن کے دفاع اور آزادی کے لیے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں:

''میں سروان اور جھلاوان کے بلوچوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں،
وہ اپنے خاں کے وفادار ہیں،
ہمارا خاں، ہمارا امیر، میدانِ جنگ میں انتہائی جنونی ہوجاتا ہے،
اسے معلوم ہے کہ اگر شکست ہوگئی تو قلات کو غلامی اور حاکمیت کا سامنا کرنا ہوگا،
وہ غلامی کی زنجیر پہننے کی بجائے ننگ و ناموس کی خاطر جان دینے کے لیے پُرعزم ہے،
وہ افغانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے موت قبول کرنے کو تیار ہے،
جو قسمت میں ہوگا، دیکھا جائے گا۔''[36]

Scanned by CamScanner

نوآبادیاتی مخالف شاعری

سولہویں صدی میں پرتگیزیوں نے مکران کے بلوچ ساحل سمیت خلیج فارس پر حملہ کر دیا۔ مکران (بلوچستان) کے کلمت قبیلے کا سربراہ میر حمال جائندان سے نفرت کرتا تھا۔ اس یورپی حملے کا احوال بلوچی ادب میں بھی ملتا ہے۔ پرتگیزیوں کے ہاتھوں میر حمال جائند کی شکست اور گرفتاری کے بعد ایک بلوچ شاعر نے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم، وطن کے لیے شاعر کے جذبہ حب الوطنی اور محبت کے علاوہ حملہ آوروں اور ان کی تہذیب وثقافت کے لیے نفرت کا اظہار ہے۔[37]

1. بہنو اور بھائیو، ہفتہ کے دن غسل مت کرو،
ہفتے کا دن بھائیوں کے لیے اور چاند کی سولہ تاریخ باپوں کے لیے نجس ہے۔
2. ہفتے اور چاند کی سولہ تاریخ نے اپنے نجس اوقات میں حمال کو اس کی کشتی اور کشتی کے نیلگوں سمندر سے محروم کر دیا۔
3. سات دنوں اور راتوں تک یہ کشتی بلا رکے چلتی رہی اور ساتویں روز اس کشتی نے پرتگال کے ساحل کو چھوا۔
4. بظاہر حمال کی کشتی پرندوں کے اڑتے ہوئے پروں کی مانند بہت بھاری نظر آتی تھی لیکن حمال کی کشتی کو دشمن نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔
5. پرتگیزیوں نے حمال کو ایک یورپی لڑکی سے شادی کے لیے کہا لیکن حمال کو یورپی لڑکیاں پسند نہ تھیں۔
6. وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہیں نہ ہی خدا کا نام لیتے ہیں،
بلکہ وہ ان کھجوروں کو کھانے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جن پر مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔
7. ان کی قمیصیں ان کے گھٹنوں سے اوپر ہیں اور ان کی ناف صاف نظر آتی ہے،
وہ خدا کا نام نہیں لیتے اور نہ ہی مسلمانوں کی مانند دعا مانگتے ہیں۔
8. حمال کو اپنے ملک کی لڑکیوں سے محبت ہے جن کی آنکھیں نشیلی ہوتی ہیں،
وہ شلوار قمیصیں پہنتی ہیں اور اپنے سروں کو شالوں سے ڈھانپتی ہیں؛
9. انہوں (پرتگیزیوں) نے حمال کے ہاتھ بندگی ہوئی رسیوں سے باندھ دیئے،
یہ ایسی بندگی اور بُنی ہوئی رسیاں تھیں جن سے قوی و چونچال اونٹوں کو قابو میں رکھا جاتا ہے؛

Scanned by CamScanner

10. حمال نے اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کو آواز دی، لیکن وہ بزدل دشتی تھے، ان کا بزدلانہ قدم
ایسے ہی بے کار ثابت ہوا جیسے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اچانک جل اٹھتی ہے لیکن پھر فوراً ہی بجھ جاتی ہے؛

11. میڈیوں (Meds) نے بھی اسے مدد کے لیے ایک ناکام خفیہ پیغام بھیجا،
بالآخر، حمال نے نقرئی دستے والے اپنی تلوار نکالی؛

12. اے میری جنگی تلوار، میں نے تمہیں اپنے بچے کی مانند عزیز رکھا ہے،
اور میں نے تم سے اپنی عزیز ترین بیٹی کی مانند پیار کیا ہے،

13. کیا وجہ ہے کہ تو حمال کے شیر کی مانند ہاتھوں سے گر پڑی،
اور سمندر کی لہریں اسے بہاتی ہوئی ہمیشہ کے لیے سمندر کی گہرائی میں لے گئیں؛

14. اے اڑتے ہوئے پرندو، اپنی پرواز کے ساتھ میری حالت بھی ان کو بتا دو،
میری حالت سے کلمت (Kalmat) کے نوجوانوں کو آگاہ کر دو؛

15. کاغذی ہونٹوں کے مالک حالرو (Halro)، شہداد غلامو (Shahdad Ghulamo) اور ٹالی
(Talli) کو میرے متعلق بتا دو کہ مجھ پر کیا گزری؛

16. رات کے کھانے کے لیے زرد اور خوشبودار گندم مت پیسو، میرے لیے مخصوص سوپ،
مینڈھوں کو احتیاط سے مت پلاؤ؛

17. میرے پلنگ پر پھولدار چادریں مت بچھاؤ،
میرے زدری مائل گھوڑے کی پیشانی پر باریک جھالریں نہ لگاؤ؛

18. میرا زردی مائل گھوڑا، مختلف چراگاہوں میں چرے گا، نیام میں رکھی ہوئی تلوار، ویسی کی
ویسی ہی پڑی رہے گی اور کسی یتیم کے ضائع شدہ کپڑے میں لپٹی پڑی رہے گی،
عین اسی طرح جس طرح ایک سنہری سورج بے حس و حرکت ہو جاتا ہے؛

19. حمال کی موت پر صرف تین یا چار لوگ ہی خوش ہوں گے،
جاہو (Jaho) کے میڈ (Meds)، زرخیز راجرو (Rajro) کے ہرن،
جوان بکرے اپنی ماداؤں اور نروں کو کہیں گے کہ خوشی مناؤ،
وہ کہیں گے کہ اے والدہ، ان پہاڑوں سے کسی دوسری جگہ چلیں،
ہمیں کسی کھیت میں کچھ دیر کے لیے خوشی خوشی چرنے دیں؛

Scanned by CamScanner

20. حمال جائنداس دنیا سے جاچکا ہے،
اب ہمیں کوئی گولی مارے گا نہ ہی کوئی ہلاک کرے گا۔''

درحقیقت، بلوچ شاعر اپنی تاریخ کے ہر دَور میں اپنے اکثر ہمسایوں کی نسبت اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے کہیں زیادہ حساس رہے ہیں۔ جب کبھی بھی یورپ یا ایشیا سے حملہ ہوا، بلوچ شاعروں نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے ہم موطنوں کو بلوچستان کی آزادی اور خودمختاری کو لاحق خطرات کے متعلق آگاہ کیا۔ بلوچی شاعری، نوآبادیاتی مخالف اور جذبہ حب الوطنی کے گیتوں سے بھرپور ہے۔

قومی شاعری کی ابتدا

انیسویں صدی میں پرتگیزیوں کی جگہ انگریز حملہ آوروں نے لے لی جو اب بلوچستان کی آزادی اور خودمختاری کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ یہ بلوچوں کے تاریخ کا نہایت ہی نازک دَور تھا کیوں کہ ان کا دشمن جنگی صنعت کے لحاظ سے نہ صرف طاقتور بلکہ وہ سازشیں کرنے میں بھی ماہر تھا۔ مثال کے طور پر انگریز بہت سے بلوچ سرداروں کو رشوت دینے میں کامیاب رہے۔

انیسویں صدی کی شاعری، برطانوی استعمار اور اس کے ایجنٹوں کے علاوہ انگریزوں کے حمایتی سرداروں کے خلاف مزاحمتی اور احتجاجی شاعری تھی۔ اس لیے، انیسویں صدی کی شاعری، استعمار مخالف اور سرداروں کے خلاف تھی۔ بلوچی شاعری، بلوچ عوام میں قوم پرستی اور حب الوطنی کا جذبہ ابھارتی ہے۔ لہٰذا، بلوچی شاعری کے باعث نہ صرف بلوچوں میں بیداری اور شعور پیدا ہوا بلکہ ان میں قوم پرستی کے جذبے نے بھی جنم لیا۔

1839ء میں برطانویوں نے بلوچستان پر حملہ کر دیا اور خان میر مہراب اپنے وطن کا دفاع کرتا ہوا مارا گیا۔ بلوچ شاعروں نے اس کے حوصلے کی داد دینے اور ان غداروں کی مذمت کرنے میں بخل سے کام نہ لیا جنہوں نے جنگ سے راہِ فرار اختیار کی۔ یہ امر نہایت دلچسپی کا باعث ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی جو ایک اہم واقعہ تھی، کی طرف ہندوستانی شعراء نے توجہ مرکوز نہیں کی۔ بلوچ شاعر اپنے ملک کی آزادی اور خودمختاری کے ضمن میں بہت زیادہ حساس تھا اور اس نے گیت لکھے اور اپنے ہم وطنوں کو قائل کر لیا کہ وہ نوآبادیاتی غلامی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ہیتو رام نے اس قسم کی نظموں کو اپنی کتاب ''تاریخ بلوچستان'' میں اکٹھا کیا ہے جو 1907ء میں شائع ہوئی۔ ان میں سے ایک نظم میں، ملا محمد رئیسانی نے بلوچوں اور ان کے ملک کی آزادی کے لیے میر مہراب خان کی قربانیوں کی تعریف

Scanned by CamScanner

کی۔اس نے ان بلوچ سرداروں کے کردار پر تنقید کی جنہوں نے استعمار مخالف جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور بلوچستان کے دشمن بن گئے۔ شاعر ملا محمد، بلوچستان کے ہندوؤں کے کردار کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہے جنہوں نے 1839ء میں قلات کے دفاع کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ اس نظم میں بغیر کسی مذہبی امتیاز کے بلوچ جذبہ حب الوطنی کی نمائندگی کی گئی ہے اور بلوچ عوام سے کہا گیا ہے کہ وہ برطانوی استعمار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔[38]

1845ء اور 1848ء میں، برطانویوں نے خان گڑھ (بعدازاں جیکب آباد)، ڈیرہ غازی خان (پنجاب) اور ڈیرہ اسماعیل خان (خیبر پختونخواہ) بلوچ علاقے سمیت سندھ اور پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ یہ برطانویوں کا بلوچ عوام یا بلوچستان سے پہلا رابطہ تھا۔ بالائی سندھ کے اضلاع میں بہت سے بلوچ قبائل برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ بلوچ شعراء نے اس بغاوت کے رہنماؤں اور ''سرمچاروں'' (آزادی کے لیے لڑنے والے) کو نہایت ہی پُروقار مقام دیا۔ بلوچ شعرا نے جذبہ حب الوطنی پر مبنی گیت لکھے اور برطانویوں کے حمایتی عناصر کی مذمت کی اور انہیں غدار کے نام سے پکارا۔[39]

جنرل نیپئر (General Napier)، فاتح سندھ جنرل جان جیکب (General John Jacob)، کرنل مرویدر (Col Merwether)، ہنری گرین (Henry Green)، میجر ایڈورڈ (Major Edward)، کیپٹن منشن (Capt.Minchin) اور سر رابرٹ سنڈیمن (Sir Robert Sandeman) سمیت برطانوی ناظمین، ''سرمچاروں'' (جنگ آزادی لڑنے والے) کو غارت گر، مجرم، ڈاکو اور چور سمجھتے تھے۔

بلوچ شعراء نے ان کے موقف سے اختلاف کیا اور ''توسیع پسندی پر مبنی حکمت عملی'' کو مداخلت، بے ایمانی اور جرم کی حیثیت سے تعبیر کیا۔ انہوں نے برطانوی فتوحات کو بلوچ سرداروں کی غداری کا نتیجہ قرار دیا۔ بالائی سندھ یا سندھ کے بلوچ علاقوں میں بلوچوں کی برطانوی مخالف قربانیوں کو بلوچ، سندھی اور سرائیکی زبانوں میں محفوظ کیا گیا ہے۔ بگٹی، خیری اور ڈومکی قبائل کی خاتون شعراء کے علاوہ چانڈیا قبیلوں نے بھی برطانوی حکومت کے خلاف ''غارت گروں'' کے کردار کو سراہا۔[40] پہلی جنگ عظیم (1914-1918) کے دوران جب مغربی اور مشرقی بلوچستان میں کئی ایک قبیلے فرنگی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو رحمت علی مری، میر چاکر بزدار اور مست توکلی جیسے بلوچ شاعروں نے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ استعمار مخالف نظمیں تخلیق کیں اور ان لوگوں کو سامنے لے کر آئے جنہوں نے

Scanned by CamScanner

برطانویوں کی معاونت کی۔ مثال کے طور پر مری قبیلے کے سربراہ، سردار خیر بخش مری اوّل نے برطانوی فوج کے لیے بلوچوں کو بھرتی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس، بہت سے دیگر قبائلی سرداروں کے علاوہ خان قلات، میر محمد دوم نے فرنگیوں کی مدد کی اور انہیں رقوم بھی مہیا کیں۔[41] شعراء نے اس غداری کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور غدار سرداروں کی مذمت کی۔ میر رحم علی نے 1200 سطور پر مشتمل بہادری کے کارناموں پر مبنی ایک طویل رزمیہ نظم لکھی جو برطانوی حکمت عملی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے متعلق معلومات مہیا کرتی ہے۔ بلوچ شعراء نے بلوچ عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ لادنے کے ذریعے بلوچستان میں غربت پھیلانے کے ضمن میں برطانوی حکومت کی مذمت کی۔[42]

بلوچ قبائلی شعراء کے علاوہ، مولانا درخانی کی سرکردگی میں مذہبی گروہ نے بھی بلوچی ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی میں مسیحی مبلغین بلوچستان میں بہت فعال سرگرمیوں میں مصروف تھے اور لوگوں کو مسیحیت میں شامل کر رہے تھے۔ اس پریشان کن اور مشکل صورتِ حال کے توڑ کے لیے مولانا درخانی نے درخان میں ایک مدرسہ (مذہبی تعلیمات کی تدریس کے لیے سکول) قائم کیا تاکہ بلوچوں کو اسلامیات کی تعلیم دی جائے۔ مولانا نے بہت سی عربی مذہبی کتب کا بلوچی میں ترجمہ کیا اور انہیں شائع بھی کیا۔ انہوں نے سب سے بڑی اور اہم خدمت یہ انجام دی کہ قرآن پاک کو بلوچی اور بروہی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ مولانا کی وفات کے بعد ان کے جانشین، مولانا حضور بخش نے ان کا یہ مشن جاری رکھا۔ انہوں نے بھی بہت سی کتب بروہی میں شائع کیں۔ اگرچہ مذہبی علما نے بلوچوں کو ''جہاد'' (مقدس اسلامی جنگ) کے فلسفے کی تبلیغ کی[43] لیکن علما کی مذہبی تعلیمات نے صرف شہری اور دیہاتی آبادی کو متاثر کیا اور خانہ بدوش ان کے اثرات سے باہر رہے۔ اگرچہ جہاد کے تصور کا علم نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے لیکن یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس فلسفے کی دو اقسام ہیں:

(i) جارحانہ جہاد

(ii) دفاعی جہاد

جہاد کی پہلی قسم، اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں غیر مسلموں کو اسلام کے دائرے کے اندر لانے کے لیے، اسلامی علاقوں میں توسیع کرنے یا اسلامی ممالک کی سرحدوں کو پھیلانے اور اسلامی ممالک کے خزانوں کو بھرنے کے لیے جاری رہی۔ جارحانہ جہاد میں بلوچوں کی شرکت بہت ہی محدود نوعیت کی رہی ہے لیکن اس ضمن میں ایک استثنائی مثال عظیم ناصر خان کی ہے جس نے بلوچوں کو پنجابی

Scanned by CamScanner

سکھوں اور ہندوستان کے مرہٹوں کے خلاف متحرک کیا۔ دفاعی جہاد کا مقصد، یورپی استعماریت سے اسلامی اقوام کو آزادی دلوانا تھا۔ 1920ء میں باکو کے مقام پر ''کانگریس آف دی پیپل آف دی ایسٹ'' میں سوویت روس کے کمیونسٹ رہنماؤں کی تعریف کی،[44] لیکن انیسویں صدی کے دوران اور بیسویں صدی کے اوائل میں جہاد کی یہ قسم بلوچوں میں بہت زیادہ مقبول ہو چکی تھی۔[45] جہاد کی یہ قسم انیسویں صدی، خاص طور پر پہلی جنگ عظیم (1914-1918) کے دوران لکھی گئی شاعری پر غالب رہی۔ لہٰذا، دفاعی جہاد، جو ظالموں اور غاصبوں کے خلاف حق خودارادیت یا قومی آزادی کی جنگ کی حمایت کرتا ہے، بلوچی ادب میں بہت مقبول ہو گیا۔ مولانا درخانی، جتوئی کی مذہبی تبلیغ اور دفاعی جہاد کے تصور نے برطانوی استعماریت کو للکارا اور برطانوی مبلغ تہذیبی وثقافتی اور مذہبی محاذ پر پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔[46]

جو شاعر استعمار مخالف جدوجہد میں شامل تھے، قبائلی معاشرے کے ارکان تھے اور انہیں یہ ادراک نہیں ہوا کہ سیاسی شکست کی اصل وجہ، قبیلہ پرستی ہے، جو قومی محاذ کی تشکیل کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے علاوہ یہ شاعر، بلوچ عوام کی سماجی پسماندگی اور اس کی وجہ جاننے میں ناکام رہے لیکن میر رحم علی اور چغابزدار استثنائی نوعیت کے حامل ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں اپنے معاشرے کی سماجی پسماندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور استعمار و سرداری نظام کے گٹھ جوڑ کی نشاندہی کی۔[47] لیکن وہ بھی کوئی متبادل حل تجویز کرنے میں ناکام رہے۔ بہرحال، استعمار مخالف شاعری نے بلوچ عوام میں غیر ملکی حکومت کے خلاف لڑنے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کر دیا۔ اس شاعری کے ذریعے ان میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ جنگ میں فتح کے حصول کی خاطر اور غاصبوں یعنی فرنگیوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کے لیے متبادل ذرائع تلاش کریں۔

جدید ادب

ترکی میں کمال اتاترک کے انقلاب، 1917ء میں سوویت انقلاب اور افغان نیشنل انقلاب کے علاوہ، سوویت یونین میں افغانی انقلابیوں اور ہندوستانی قومی تحریک نے بلوچ عوام پر قابل ذکر اثرات مرتب کیے۔ بلوچ دانشور، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی، جمہوریت اور قوم پرستی جیسے نئے مغربی افکار سے متاثر ہوئے۔

Scanned by CamScanner

زبان وادب نے قوم پرستی کے ترقی کے ضمن میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ 1929ء میں جب بلوچ نیشنل موومنٹ کی قیادت مگسی قبیلے کے پاس تھی تو بلوچی زبان بلوچستان یا برطانوی ہند کے بلوچ علاقوں میں ذریعہ تعلیم نہ تھی۔ بلوچستان بھر میں چند ہی سکول تھے، نیز بلوچستان کے مغربی حصے میں مغربی نظام کی طرز پر کوئی بھی سکول موجود نہ تھا۔ اس سے پہلے ذریعہ تعلیم فارسی تھی جس کی جگہ ایک اور غیر ملکی زبان اردو نے لے لی۔ اردو، ذریعہ تدریس اس لیے بن گئی کیوں کہ اساتذہ کی اکثریت پنجابی تھی جن کا تعلق برطانوی ہند سے تھا۔ یہ اساتذہ، نہ صرف بلوچی زبان میں تدریس کے نااہل تھے بلکہ انہیں یہ زبان سیکھنے میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلوچستان کے سکولوں میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کا نصاب رائج تھا اور امتحانات کا انعقاد بھی پنجاب یونیورسٹی کے تحت کیا جاتا تھا۔

یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس میں بلوچ قوم پرستی کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ اپنے افکار و نظریات کے اظہار کے لیے اردو زبان کا سہارا لیا جائے۔ اس لیے پہلی قومی تحریر، یوسف علی مگسی کی طرف سے اردو زبان میں ایک مضمون بعنوان، ''فریادِ بلوچستان'' کے حیثیت سے لکھی گئی اور یہ لاہور کے ''روزنامہ مساوات'' میں 1929ء میں شائع ہوئی۔ یہ بلوچ قوم پرستی کے فروغ دینے کے ضمن میں پہلی ادبی دستاویز تھی۔[48] اس مضمون میں بلوچوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ بلوچستان کی آزادی اور اتحاد کے لیے خود کو منظم کریں۔ مگسی کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں ان کی انقلابی سرگرمیوں کے باعث سزا دی گئی۔ دسمبر 1932ء میں بلوچستان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا انعقاد جیکب آباد میں ہوا۔ اس کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان میں اخبارات پر سینسر شپ ختم کی جائے اور ''بلوچ پریس'' کا قیام عمل میں لایا جائے۔[49]

1933ء میں سکولوں کے کئی نوجوان اساتذہ اور سماجی کارکنوں نے یوسف علی خان مگسی کی اپیل پر اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیا اور بلوچستان پریس کی بنیاد رکھی جس کے لیے مالی وسائل مگسی نے مہیا کیے تھے۔ کراچی سے مندرجہ ذیل اہم ہفتہ وار جرائد شائع ہونے لگے، مثلاً البلوچستان، بلوچستان، اتحادِ بلوچستان، ان کے علاوہ ایک ہفتہ وار جریدہ الحسیف، جیکب آباد سے شائع ہوتا تھا۔[50] جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے، بلوچ پریس نے اپنا آغاز، ایک غیر ملکی زبان اردو کے ذریعے کیا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بلوچ طلبہ اور دانشوروں کی حصولِ تعلیم کا ذریعہ اردو تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اہل ہند کو بلوچستان کے مسئلے سے باخبر کرنا چاہتے تھے، نیز وہ ہندی قوم پرستوں کا

Scanned by CamScanner

تعاون حاصل کرنے کے خواہاں تھے اور اس کے علاوہ ہندوستانی متوسط طبقے کی ہمدردیوں کے حصول کے بھی خواہش مند تھے۔

بلوچ پریس نے بلوچ قوم پرستی، استعماریت، آزادی اور سماجی و ثقافتی مسائل کے حوالے سے مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا تا کہ شعور بیدار کیا جائے۔ سب سے زیادہ اہم مصنف مگسی تھے جنہوں نے اردو اور فارسی زبانوں میں تصنیفات کیں۔

مگسی نے جمال الدین اور افغانستان کے تارزی کی مانند مندرجہ ذیل اصولوں کو اپنانے کی بنیاد پر بلوچ عوام کی آزادی کا خواب دیکھا:

(i) قوم پرستی

(ii) سوشلزم

(iii) ترقی پسند اسلام

اپنے مضامین، نظموں اور نجی خط و کتابت (1929-1935) میں انہوں نے اپنے قارئین کو بتایا کہ افغانستان اور ایران کی مانند بلوچ ایک علیحدہ قوم ہیں اور اس ضمن میں بلوچوں کی جداگانہ تاریخ اور تہذیب و ثقافت کا حوالہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم کے ذریعے قوم پرستی کو فروغ دیا جا سکتا ہے، نیز انہوں نے اپنے گاؤں جھل میں ایک نجی سکول قائم کیا۔ اس سکول کے تعلیمی نظام کی بنیاد بلوچ جغرافیائی حیثیت اور اس کی تاریخ تھی۔ انہوں نے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں اسی قسم کے سکول قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ 1935ء میں جب وہ برطانیہ کے دورے پر تھے، انہوں نے بلوچ طلبہ کے لیے ایک ہوسٹل تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تا کہ انہیں مفت رہائش مہیا کی جا سکے۔[51] اپنے دوستوں کے نام اپنے کچھ نجی خطوط (کچھ خطوط 1935ء میں ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے اور باقی خطوط ابھی تک شائع نہیں ہوئے) میں بلوچوں کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا، جس کے ذریعے ان کے خیال کے مطابق بلوچ، بلوچستان کا سماجی و سیاسی نظام تبدیل کرنے کے قابل ہو جاتے اور بلوچ قانون سے بھی آشنا ہو جاتے۔[52]

اس دَور کے دیگر مسلمان قائدین، مثلاً افغانی اور سندھی کی مانند، مگسی کی بھی خواہش تھی کہ بلوچستان میں سماجی انقلاب برپا کیا جائے۔ انہوں نے ترقی پسندانہ اسلام کی تعلیمات کی حمایت کی۔ ان کے موقف کے مطابق، بلوچ معاشرے کے سماجی و معاشی مسائل کا حل صرف اور صرف مارکس ازم

اور لینن ازم ہی میں مضمر تھا۔[53]

افغانی، ترزی اور سندھی کی مانند، مگسی نے برطانوی استعمار کی مذمت کی۔ سماجی انقلاب پر مبنی اپنے فلسفے میں، انہوں نے یہ کہتے ہوئے مکمل آزادی اور بلوچ خواتین کو تعلیم فراہم کرنے کا مطالبہ کیا کہ بلوچ خواتین کی شرکت کے بغیر آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی۔[54] مگسی نے کھلے عام اسلامی مذہبیت کی مخالفت کی اور اسلام کی آفاقیت کی حمایت کی۔ مثال کے طور پر، سماجی انقلاب کے موضوع پر ان کی تحریروں میں مارکس اور لینن کی تعلیمات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انہوں نے اس شرط پر اسلام کی حمایت کی کہ اسے قوم پرستی کے تصور کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ان کے سیاسی نظریات کو پاکستان میں موجود بہت سے پنجابی اساتذہ نے غلط طور پر پیش کیا جو مگسی کو سر محمد اقبال کا شاگرد اور پیروکار سمجھتے ہیں۔ درحقیقت، مگسی اور اقبال کے درمیان قوم پرستی کے تصور کے ضمن میں بہت زیادہ اختلاف موجود ہے۔ ہندی مسلمان رہنماؤں مودودی اور جناح کی طرح، اقبال اسلام میں قوم پرستی کے تصور کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے جب کہ مگسی کے نزدیک قوم پرستی اور حب الوطنی کے نظریات، قرآن وسنت کی تعلیمات میں موجود ہیں۔ افغانی، سندھی اور ترزی کی مانند، انہوں نے آزادی کے حصول کے لیے انقلابی جدوجہد کی حمایت کی۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے سرسید احمد خان پر برطانوی حکمت عملی کے حامی کی حیثیت سے تنقید کی۔[55]

بلوچ سیاسی کارکنوں کے علاوہ بلوچ مصنفین پر مگسی کے نہایت ہی شدید اثرات موجود تھے۔ میر مٹھا خان مری نے ایک نظم بعنوان ''شاعر اور قوم'' لکھی جو 1933ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں ایک مظلوم اور ستم رسیدہ معاشرے میں شاعر کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔ مٹھا خان لکھتا ہے کہ ایک سچا شاعر عوام کے احساسات اور جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ مٹھا خان نے زور دیا کہ کون ہے وہ شخص جو لوگوں کو آزادی دلائے۔

مگسی کے ایک قریبی رفیق محمد حسین عنقا نے سیاسی محاذ پر بے لوث اور سچی خدمت کی۔ اس کی شاعری، قوم پرستی اور مارکس ازم ولینن ازم کے اصولوں پر مبنی ہے۔[56] اپنی نظموں میں اس کا مرکزی موضوع بلوچوں کا اتحاد ہے۔ عنقا نے بلوچ قبیلہ پرستی اور قبائلی سردارزم کے خلاف لکھا۔ اس نے نوآبادیاتی حکمرانی کو بلوچوں کی پسماندگی کی ایک وجہ قرار دیا۔ کئی دیگر بلوچ مصنفین نے ''آزادیٔ بلوچستان''، ''انقلاب'' اور ''پیغامِ عید'' جیسے عنوانات کے تحت مضامین اور نظمیں تحریر کیں۔[57] ان تمام

Scanned by CamScanner

مصنفین کا کم وبیش ایک ہی مقصد تھا کہ بلوچستان کو آزاد کرایا جائے۔

بلوچ مصنفین نے پاکستان کی تحریک یا ہندو مسلم اختلاف کے بارے میں کبھی نہیں لکھا۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے مقصد کی حمایت کی اور انہیں بلوچستان کی آزادی کے لیے ان کی حمایت کی امید تھی، نیز انہوں نے ہندوستانی قوم پرستی کی بجائے بلوچ قوم پرستی پر زور دیا۔ اگرچہ انہوں نے ہندوستانی سیاست میں شرکت سے احتراز کیا لیکن انہوں نے ہندوستان کے قومی رہنماؤں کے ساتھ تعاون کی حمایت کی۔

1935ء میں مگسی نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور بلوچ پریس اپنے اہم ترین مالی معاون سے محروم ہوگیا۔ بہرحال، خانِ قلات، میر احمد یار خان، میر شہباز خان نوشیروانی، محمد امین کھوسہ، جام مقبول اور سندھ، ڈیرہ جاٹ اور قلات کے متوسط بلوچ طبقے کی معاونت کے ذریعے مالی وسائل بحال ہوگئے۔ اکتوبر 1937ء میں محمد حسین عنقا نے بلوچی زبان میں اپنی پہلی نظم شائع کی اور بلوچ مصنفین سے درخواست کی کہ وہ بلوچی زبان میں لکھیں۔ انہوں نے لکھا، ''حقیقی تعلیم، صرف اور صرف مادری زبان ہی میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ اس لیے بھی اہم تھا کہ بلوچی ادب کو شائع کیا اور اسے فروغ دیا جائے۔''

مزید برآں، انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ہمیں امید ہے کہ ہمارے بلوچ شاعر یہ اہم ضرورت پوری کرنے کے لیے بلوچ نظمیں لکھیں گے۔''[58] ان کی پہلی نظم بعنوان ''ہمارے اچھے دن کب آئیں گے'' نے قومی زبان اور تہذیب وثقافت کو فروغ دیا۔

بلوچی میں پہلی قومی نظم کی اشاعت کے بعد بہت سے بلوچ شعرا اور مصنفین نے بھی نظمیں تخلیق کیں۔ 8 اپریل 1947ء کو عنقا نے قومی ترانہ شائع کیا اور بلوچوں کو سامی النسل قرار دیا۔

''ہم بلوچ ہیں جن کا ماضی نہایت ہی شان دار ہے،
ہم حلب (Aleppo) کی معزز نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔''[59]

اس نظم میں بلوچستان کی نسلی حدود کو دریائے سندھ کے قریب واقع ڈیرہ جاٹ سے افغانستان میں گارمسر اور دریائے حب سے سیستان تک بیان کیا گیا۔ شاعر اپنے ملک کی تقسیم کو مسترد کردیتا ہے اور اعلان کرتا ہے: ''ہم نے وہ تمام علاقے فتح کرلیے ہیں جو اب ہمارا وطن ہیں۔ یہ حقیقی اور اصل بلوچستان ہے۔

اگر ہم علیحدہ ہوجاتے ہیں اور ہماری حدود کی نشاندہی کی جاتی ہے تو پھر کیا ہوا، یہ عارضی تقسیم

Scanned by CamScanner

ہےاور ہماری روح ایک ہے۔

ہم ان دیواروں کو گرادیں گے۔ ہم بارش اور طوفان کی مانند ہیں۔''[60]

• 1940ء کی دہائی میں عنقا اور نظامانی نے کراچی میں بلوچ لٹریری اکیڈیمی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ تہذیبی شعور کو فروغ دیا جائے، نیز بلوچی ادب کی اشاعت شروع کی۔ اکیڈیمی نے بلوچ تاریخ کے موضوع پر چند کتب شائع کیں۔ عنقا نے بلوچی زبان کے فروغ کی طرف بہت زیادہ توجہ دی اور بلوچ بچوں کی تعلیم کے لیے بہت سی کتب شائع کیں۔[61] اس اکیڈیمی کی کوششیں بلوچستان کے محکمہ تعلیم پر کسی بھی قسم کے مثبت اثرات مرتب نہ کرسکیں جو غیر مقامیوں کے ہاتھ میں تھا کیوں کہ بلوچی زبان ان کے مفادات اور حاکمیت کے لیے خطرہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ بلوچوں اور بلوچی زبان کو ''جنگلی'' سمجھتے تھے۔[62] اس دَور میں پہلا بلوچی ماہنامہ کراچی اور کوئٹہ سے شائع ہونا شروع ہوا لیکن اس کی اشاعت زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ 1946ء میں ایس ہاشمی نے انجمن اصلاحِ بلوچاں کی بنیاد رکھی۔

1947ء اور 1948ء میں ان صحافیوں اور تنظیموں کے باعث بلوچی زبان کو مزید فروغ حاصل ہوا، یہی وجہ ہے کہ آج تحریری زبان پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ترقی کر چکی ہے۔ محمد حسین عنقا، عزت جمالدینی اور گل خان نصیر اور عطا شاد سرکردہ بلوچ مصنف اور شاعر ہیں۔[63]

Scanned by CamScanner

باب4

مذہب اور سماجی روایت

کچھ اقوام کی ترقی اور افزائش میں مذہب نے اہم کردار ادا کیا ہے جب کہ کچھ دیگر اقوام میں مذہب کو اتحاد کی بنیاد کی حیثیت سے مسترد کر دیا گیا ہے۔ بلجیم اور آئرلینڈ کے قوم پرستوں نے مذہبی معاملات کو بالترتیب ہالینڈ اور برطانیہ سے علیحدگی کے لیے استعمال کیا جب کہ 1947ء میں برطانوی ہند کو مذہبی بنیادوں پر دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے برعکس، عرب قوم پرستوں نے عثمانی ترکوں کی سربراہی میں مذہبی خلافت کو مسترد کر دیا۔ (خلافت ایک مذہبی اور سیاسی ادارہ تھا جس نے ملت، یعنی مسلم امہ کو 1918ء تک ایک واحد سیاسی نظریے کے تحت متحد رکھا)۔ عرب قوم پرستی، مذہب کی بجائے عمومی جغرافیائی محل وقوع، تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے ذریعے خود کو تقویت بخشتی ہے۔ 1971ء میں بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے دو قومی نظریہ کو مسترد کر دیا جس کی بنیاد مذہب پر تھی اور اپنے لیے ایک علیحدہ وطن قائم کر لیا۔

مذہبی ریاست کے حوالے سے بلوچ عوام کا نقطہ نظر، پنجاب، سندھ اور ہندوستانی مسلمانوں کے موقف سے مختلف ہے۔ بلوچوں کے نزدیک مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے۔ اس باب میں ہم مذہب کے حوالے سے بلوچ تصور اور سماجی روایات کا جائزہ لیں گے۔

اسلام کی آمد سے قبل، یہ سمجھا جاتا تھا کہ بلوچوں کی اکثریت مزدکی (Mazdaki) اور زرتشی (Zoroastrians) ہے۔ آج بلوچوں کی اکثریت مسلمان اور سنی العقیدہ ہے جو عرب دنیا میں غالب حیثیت کا حامل فرقہ ہے۔ بہر حال، قدیم رزمیہ نظموں میں یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ بلوچ، خلیفہ حضرت علیؓ کے پیروکار ہیں اور اس لیے وہ بنیادی طور پر اہل تشیع ہیں۔

''ہم سچے عقیدے کے امام، حضرت علیؓ کے غلام ہیں۔''[1]

Scanned by CamScanner

ایک روایت کے مطابق بلوچ، یزید کے خلاف حضرت امام حسینؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد بلوچوں کو شام اور عراق سے بے دخل کر کے ایران کی طرف دھکیل دیا گیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ انہوں نے سنی عقیدہ کیوں اختیار کیا۔ جب ایرانیوں نے سنی عقیدہ اختیار کیا تو بلوچ شیعہ ہوگئے، اور جب ایرانیوں نے شیعہ عقیدہ اختیار کیا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ ان کے مخالف فقہ اہل سنت میں چلے گئے۔ مغربی بلوچستان میں اہل سنت نے بلوچ قوم پرستی کی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے جب کہ بلوچوں کے ساتھ شیعہ ایران کے تعلقات ہمیشہ خراب ہی رہے۔ انیسویں صدی میں مغربی بلوچستان پر ایرانیوں کے قبضے کے ساتھ ہی سنی مذہبی پیشواؤں کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ بلوچستان کے خوانین نے شیعہ ایران کے خلاف ترکی کے سنی العقیدہ حکمرانوں، ہندوستان کے مغلوں اور افغانستان کے ساتھ اتحاد قائم کرلیا۔ اٹھارہویں صدی میں عظیم ناصر خاں نے سنی العقیدہ افغانوں کی حمایت میں ایرانیوں کے خلاف کئی مہمات میں حصہ لیا۔[2]

1928ء میں جب رضا شاہ نے مغربی بلوچستان پر حملہ کیا تو بلوچ مزاحمتی تحریک کچل دی گئی۔ کئی ہزار بلوچ اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے مشرقی بلوچستان اور افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ ایک بلوچ وفد نے شیعہ ایران کے خلاف حکومت افغانستان سے مدد کی درخواست کی تاکہ وہ اپنے مذہب کی حفاظت کرسکیں لیکن افغان حکومت نے انہیں ایرانی مذہبی اور سیاسی استحصال سے بچانے کے لیے ان کی اس درخواست کا مثبت جواب نہ دیا۔[3]

پہلوی حکومت کے تحت اہل تشیع کے غلبے کے ردِعمل میں بلوچوں میں سنی عقیدہ بہت ہی مقبول ہوگیا۔ بلوچ اپنے بچوں کو سنی عقیدہ کی تعلیمات سے آگاہ کرتے اور انہیں یہ تعلیمات دینے کی خاطر بہت سے قصبوں اور شہروں میں مذہبی سکول (مدرسے) کھل گئے۔ 1928ء کے آغاز میں بہت سے بلوچ طلبہ نہایت ہی باقاعدگی کے ساتھ برصغیر میں دیوبند جیسے سنی تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے جاتے۔ اسلام کے سنی عقیدے کے باعث، ایران کی حاکمیت کے خلاف بلوچ قوم پرستی کو بہت زیادہ تقویت حاصل ہوئی۔[4]

مشرقی بلوچستان میں بلوچوں کی مکمل اکثریت، عربوں، ترکوں، پشتونوں، کردوں اور افغانیوں کی مانند سنی العقیدہ تھی لیکن اسلام کے متعلق بلوچوں کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ سر رابرٹ سنڈیمن (Sir R.Sandeman) نے یوں تبصرہ کیا، ''دونوں جنگجو، منتقم اور ظالم ہیں لیکن جب کہ افغانی ہٹ دھرم اور

Scanned by CamScanner

متعصب ہیں، بلوچ سیدوں (رسول اکرم حضرت محمد ﷺ کی اولاد) یا مولویوں (مسلمان مذہبی پیشواؤں) کو بہت کم قابل احترام سمجھتے ہیں۔"[5] ای اولیور (E.Oliver) نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ "بلوچ ذہنی طور پر خدا کے تصور کے قریب ہیں نہ ہی فطرت کے اعتبار سے شیطان کے قریب ہیں۔" اس کے مطابق، "افغان ایک خطرناک جنونی ہے جب کہ بلوچ اپنی نمازوں کو خالصتاً اپنا معاملہ سمجھتا ہے۔"[6]

مذہب کے حوالے سے بلوچوں کے نقطہ نظر کی وضاحت کے سلسلے میں ایک دلچسپ حکایت یوں ہے: ایک مرتبہ ایک بلوچ سے پوچھا گیا کہ اس نے رمضان کا روزہ کیوں نہیں رکھا؟ بلوچ نے جواب دیا کہ اس نے روزہ اس لیے نہیں رکھا کہ اس کے سردار نے اس کی بجائے روزہ رکھ لیا۔

ایک اور دلچسپ حکایت کے مطابق جب ایک مسلمان نمازِ مغرب سے فارغ ہوا تو ایک بلوچ نے اس سے پوچھا، "تم نماز کیوں پڑھتے ہو؟" مسلمان نے جواب دیا، "خوفِ خدا کے باعث!" بلوچ نے جواب میں کہا، "میرے ساتھ پہاڑوں میں چلے آؤ، یہاں ہمیں کسی کا خوف نہیں۔"[7] ایک بلوچ محاورہ ہے، "اللہ تعالیٰ اس شخص سے کبھی خوش نہیں ہوگا جو غارت گری نہیں کرتا اور لوٹا کھسوٹا نہیں۔"

یہ حکایتیں واضح کر دیتی ہیں کہ بلوچ اپنے ہمسایوں، مثلاً پشتونوں اور پنجابیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ انیسویں صدی میں جب برطانوی حکام نے بلوچوں اور پشتونوں سے یہ پوچھا کہ ان کے دیوانی مقدمات کا کس طرح فیصلہ کیا جائے تو بلوچ نے جواب دیا: "ہماری رسوم ورواج کے مطابق!" جب کہ پشتونوں نے جواب دیا، "اسلامی قوانین (شریعت) کے مطابق۔"[8]

1947ء میں جب برصغیر پاک وہند میں ہندو مسلم فسادات جاری تھے تو اس وقت صرف بلوچ معاشرہ ہی تھا جہاں ہندو اقلیت کو کبھی چھیڑا نہیں گیا اور ہندو وہاں مکمل امن کے ساتھ رہتے رہے؛ مزید برآں، بلوچ اپنے ہمسایوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔ بلوچوں کی مکمل تاریخ کے دوران بلوچوں نے کبھی بھی ہندوستان کے خلاف مذہبی جنگ نہیں لڑی لیکن عظیم ناصر خان کی مثال استثنائی نوعیت کی حامل ہے کیوں کہ ہندوستان پر ناصر خان اعظم کے حملے کے پیچھے موجود عناصر مذہبی کی بجائے زیادہ تر معاشی اور سیاسی تھے۔

ذکری اور ہندو

سنی العقیدہ مسلمانوں کے علاوہ ایک اور چھوٹا سا فرقہ "ذکری" یا "دیئس" کہلاتا ہے جس کا

Scanned by CamScanner

مرکز مکران ہے۔ یہ جنوب مشرقی جھلاوان اور لسبیلہ تک پھیلا ہوا ہے جب کہ مغربی بلوچستان (ایران) میں بھی ذکریوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس فرقہ کی بنیاد پندرہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں جوآن پور کے سید محمد نے رکھی۔

سید محمد خود کو مہدی کہتا تھا۔ یہ فرقہ بلوچستان میں کیسے آیا، کیا ہندوستان سے براہ راست یا پھر ایران کے ذریعے بلوچستان آیا، اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ مزید برآں، یہ بھی معلوم نہیں کہ اس فرقہ کے آغاز میں اس نئے فرقے کا بانی کون تھا۔ بہرحال بلوچستان میں ملا مراد اس فرقے کا پہلا روحانی پیشوا تھا جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔[9]

لفظ ''ذکری'' کا ماخذ ''ذکر'' (اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا) ہے۔ ذکری، اہل سنت سے مختلف ہیں جنہیں وہ نمازی (اہل صلوٰۃ) کہتے ہیں۔ ذکریوں کا موقف ہے کہ قرآن میں لکھا ہے کہ نماز کی بجائے ذکر کیا جائے، ''میرا ذکر کرو اور میں تمہارا ذکر کرتا ہوں''، اور پھر ''بلاشبہ ہم نے ذکر نازل کیا اور بلاشبہ ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''[10]

ذکریوں کو "Dahi" یا "Dai" کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ "Dahi" کے پیروکار ہیں جو "Dah" (بلوچی زبان میں ''انتباہ'') کا پیغمبر تھا۔ اس کے برعکس، یہ لوگ قرآن کو "Dai" (''انتباہ'') کہتے ہیں۔

موجودہ دَور میں ذکری فرقہ ''حقیقی'' اسلام سے متصادم ہے۔ مثال کے طور پر ان کا عقیدہ ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور مہدی (محمد جوآن پوری) (نعوذ باللہ) اللہ کے رسول ہیں''، اسلام کے سنی اور شیعہ مسلک کے عقیدے ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' کے بالکل متضاد ہے۔ ذکریوں کا قرآن پر تو ایمان ہے لیکن وہ اس کے روایتی مفہوم کو نہیں مانتے۔ حج (مکہ کے حج) کی بجائے وہ اسلامی مہینے، ذوالحج کی 9 تاریخ کو کوہِ مراد (کیچ مکران میں تربت شہر سے چند میل کے فاصلے پر) کے حج کو جاتے ہیں۔ مزید برآں، زکوٰۃ (مال کا 1/40 حصہ بطور خیرات) ادا کرنے کی بجائے وہ اپنے مال کا دسواں حصہ بطور خیرات ادا کرتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہ کو ''ذکرانہ'' کہا جاتا ہے جو شیعوں یا سنیوں کی ''مسجد'' کے بالکل برعکس ہے۔

ذکریوں کے اہل سنت کے ساتھ تعلقات عمومی طور پر دوستانہ اور پُرامن ہی رہے، سوائے ناصر خان اعظم کے دَور کے، جب انہوں نے اٹھارہویں صدی میں مکران کی ذکری بلوچ ریاست پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ بہرحال، افسانوی اور غیر حقیقی بنیادوں پر قائم ان کے عقیدوں کے

Scanned by CamScanner

باوجود، ذکری (بظاہر) سادہ اور بے ضرر لوگ ہیں۔[11] رہنما، ذکری فرقے کو بلوچوں کا مذہب سمجھتے ہیں کیوں کہ یہ بلوچستان میں پھلا پھولا اور صرف اس خطے میں ہی اس کے پیروکار موجود ہیں۔

مسلمانوں کے سنی اور ذکری فرقوں کے علاوہ، بھی اس خطے میں بہت سی دیگر مذہبی اقلیتیں، مثلاً ہندو، آتش پرست، یہودی اور اسماعیلی خوجہ موجود رہیں اور اب بھی ہیں۔

بلوچ معاشی زندگی میں نمایاں مقام رکھنے کے باعث بلوچ معاشرے میں ہندوؤں کو دوستانہ حیثیت حاصل ہے۔ خانیت کی تاریخ میں وزارت داخلہ کا سربراہ ایک مقامی ہندو تھا اور اس امر کی مثالیں موجود ہیں کہ کسی ہندو نے صوبے کے گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ قلات کے محاصرے (1839) کے دوران، وزیر خزانہ دیوان مل ہندو تھا، جس نے اپنے آقا، میر مہراب خان کی معیت میں قلات کے دفاع کے لیے اپنی زندگی قربان کردی۔[12] ہندو اور دیگر اقلیتیں، بلوچ سیکولر معاشرے کی دوستانہ حکمت عملیوں سے مستفید ہوتی رہیں۔ بلوچستان میں ہندو معاشرے پر بلوچ تہذیب وثقافت کے بارے میں ڈینس برے (Bray) لکھتا ہے:

''ہندوؤں کو ان کے تمام رسوم ورواج منانے کی اس طرح اجازت دے گئی ہے کہ ان پر مسلمانوں (یا بلوچوں) کا رنگ نظر آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہندو، مرحوم مسلمان مذہبی پیشواؤں کے مزاروں پر منتیں ماننے جاتے ہیں اور وہ بہ وقت ضرورت خوشی خوشی مسلمان ملاؤں سے تعویذ بھی لیتے ہیں۔ عام طور پر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے روزے بھی رکھتے ہیں اور محرم کے علاوہ دیگر اسلامی تہواروں میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ جس طرح مسلمان نہایت عقیدت کے ساتھ مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں، ہندوؤں کو بھی اس عقیدت کا اظہار کرنے میں کم ہی مشکل پیش آتی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو گھرانے، کھانے کے کمروں کی صفائی، گھریلو استعمال کے لیے باہر سے پانی لانے، کھانے پینے کے برتنوں کے علاوہ کھانا پکانے کے برتن دھونے کے لیے مسلمان خادم اور خادماؤں کو رکھنے میں کوئی اخلاقی عار محسوس نہیں کرتے۔ نہ صرف وہ بلکہ برہمن ہندو بھی مسلمان ماشکیوں کے مشکیزوں سے بلا روک ٹوک پانی پیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنی نجس شدہ چیزوں کو پاک کرنے کے لیے یہی پانی استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی رسوم اپناتے ہیں، ان کے ہاں ذات پات کا کوئی تصور نہیں بلکہ وہ صرف خود کو ہندو، برہمن اور مسلمان سمجھتے ہیں۔ ماضی میں تو ہندوؤں اور برہمنوں نے اپنے ہم مذہبوں کو مسلمان بیوی رکھنے کی بھی اجازت دے دی تھی اور وہ ابھی تک طلاق جیسی رسم کو اپنائے

Scanned by CamScanner

ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب ہندومت خود کو اس قدر مقدس ومحترم سمجھتا ہے تو کیا وہ مسلمانوں کی مانند اپنے اندر اخوت اور بھائی چارہ پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو اس فرد کے لیے خوشگوار اہمیت کا حامل ہے جس پر فیصلہ کرنے کی ذمہ داری بمشکل ہی ڈالی جا سکتی ہو۔"[13]

سیاست

1947ء میں جب بلوچ خانیت کے آئین کے تحت ایک آزاد اور خودمختار ریاست بن گئی تو ایوانِ زیریں یعنی دارالعوام کے لیے انتخابات منعقد ہوئے۔ مسلم بلوچ اکثریت نے خانیت کے ایوان زیریں کے لیے پانچ ہندو ارکان منتخب کیے۔[14]

بلوچوں کے برعکس، افغان قدامت پسند مسلمان ہیں۔ کابل کے امیر، امیر عبدالرحمٰن کے دورِ حکومت میں کافر (یا کیلاش قبائل) کو زبردستی مسلمان بنایا گیا اور ان کے ملک کا نام بدل کر نیا نام "نورستان" (روشنی کی سرزمین) رکھ دیا گیا۔ ایرانیوں نے کبھی بھی بابیوں یا بہائیوں اور سنیوں کو برداشت نہیں کیا۔ برصغیر پاک وہند میں اورنگزیب جیسے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے لیے متعصب اور جنونی رویہ اختیار کیا۔ 1947ء میں تحریک آزادی کے دوران، پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے ہندوؤں کا ان کے مسلمان ہمسایوں نے قتل عام کیا۔

بہرحال بلوچ علاقوں میں رہنے والے ہندو امن وآشتی سے رہتے تھے اور سرحدی علاقوں میں بلوچ ان کی حفاظت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب ڈیرہ اسماعیل خاں میں ایک ہندو گاؤں پر غلزئی پشتونوں نے حملہ کیا تو یہ بلوچ سردار، سردار عبدالرحمٰن خان، بھائی کولاچی (کولاچی قبیلے کا سربراہ) ہی تھا جس نے ان ہندوؤں کو "باہوٹ" (Bahut) قرار دیا۔ بلوچ غیرت کے ضابطہ اخلاق کے مطابق "باہوٹ" (Bahut) ان افراد کو کہتے ہیں جنہیں کسی بلوچ نے پناہ دی ہو اور ان کی حفاظت محافظوں کے مقدس فرض میں شمار ہوتی ہے۔ بہت سے گھرانوں کو اس منظم قتل عام سے بچا لیا گیا اور پھر یہ گھرانے بالآخر 1947ء اور 1948ء میں ہندوستان ہجرت کر گئے۔[15]

غیر مسلموں کے لیے بلوچ حکمت عملی کے برعکس، ایرانیوں، پشتونوں اور برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے ہمیشہ ہی بنیاد پرستی یا قدامت پرست اسلام پر مبنی حکمت عملی اپنائی۔ مذہبی جذبات ابھارنے کے لیے پشتونوں میں "ملا" کو ہمیشہ ہی زبردست حیثیت حاصل رہی۔ مثال کے طور پر برصغیر پر افغانوں کے حملوں کے پیچھے ملاؤں کا ہاتھ تھا۔ سکھ اور برطانوی حکومت کے دوران، سید احمد، اسماعیل

Scanned by CamScanner

شہید، ہادی ملا، حاجی ترنگ زئی اور ملا پاوندا کے علاوہ فقیر ایپی جیسے مسلمان مذہبی قائدین نے ہندوؤں اور برطانوی ہند کے خلاف پشتونوں کے جہاد (اسلامی مقدس جنگ) کی قیادت کی۔ انہوں نے ایک اسلامی ملک کے قیام کے لیے ہندو گاؤں اور دیگر غیر مسلم آبادیوں پر حملے کیے۔ اسی مقصد کے لیے مذہبی رہنماؤں نے ہندی مسلمانوں کی قیادت کی۔ موخرالذکر میں ممتاز ترین مذہبی رہنماؤں میں احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ شامل تھے۔

جب 48-1947ء میں پاکستانی حکومت نے اس بنا پر خانیت کے اپنے ساتھ الحاق کا مطالبہ کیا کہ اسلام یہاں کا مشترک مذہب ہے تو حکومت پاکستان کے اس قدم کے ساتھ شدید مخالفت کا اظہار کیا گیا اور خانیت کی پارلیمان نے اسے مسترد کر دیا۔ میر غوث بخش بزنجو نے پاکستان کی مذہبی قوم پرستی کے خلاف بلوچ عوام کی آواز بن کر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

''یہ درست ہے کہ ہم مسلمان ہیں لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور صرف اس لیے دوسری اقوام میں ضم ہو جائیں کہ ہم اسلامی عقیدہ کے حامل ہیں۔ اگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے پاکستان کے ساتھ ہمارا الحاق اس قدر ضروری ہے تو پھر افغانستان اور ایران کے اسلامی ممالک کو بھی پاکستان میں ضم ہو جانا چاہیے۔''

درحقیقت، جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہے، بلوچوں کے نزدیک مذہب ایک فرد کا نجی معاملہ ہے۔ بلوچ عوام کی اکثریت مذہبی پیشواؤں کے مزاروں اور خانقاہوں میں عافیت ڈھونڈھتی ہے اور بلوچ عوام روحانی پیشواؤں، پیر، ولی اور مرشد (روحانی پیشواؤں کے مختلف نام، ترکی میں انہیں درویش کہا جاتا ہے) کی عزت اور پیروی کرتے ہیں۔ دنیاوی امور کے ضمن میں بلوچ عوام اپنے سیکولر رہنماؤں، سردار اور خان، سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ماضی میں ان سرداروں اور خانوں کو ولی (مذہبی بزرگ) سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر میر ناصر خان اعظم کی قبر کو مزار کی حیثیت حاصل ہے۔[16] مری قبیلے کے سربراہ، سردار خیر بخش خان اوّل اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں کولاچی قبیلے کے سربراہ سردار رب نواز خان کو ان کے قبیلے کے افراد ولی سمجھتے ہیں۔ انہیں قدرت کی طاقتوں کا حامل اور موسم کے اچھے یا برے ہونے کے ضمن میں ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ جب بلوچ عوام کو غذائی قلت کا سامنا کرنا پڑتا تو یہ لوگ خان کی طرف دیکھتے کہ وہ اپنی روحانی قوت استعمال کرے اور بارش برس جائے۔ پھر خان، اپنے نفیس لباس اتار کر ایک ''بازگر'' (کسان) کا اونی لبادہ پہنتا اور بارش سے محروم کھیتوں میں بیل گاڑی

Scanned by CamScanner

میں بیٹھا چکر لگاتا۔ برطانوی بتاتے ہیں کہ بارش برسانے کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر خان دوم اور میر خداداد خان بھی یہ رسم ادا کرتے تھے۔[17]

کئی دیگر قبیلوں کے سربراہوں کو یہ قوتیں حاصل تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جھلاوان کے زہری سربراہ نے بارش برسانے کی کوشش کی لیکن وہ مکمل طور پر ناکام رہا حالانکہ اس نے صبح سے شام تک کھیت جویا تھا۔ اس موقع ایک قبائلی نے کہا، ''پھر اسے سردار ہونے کا کوئی حق نہیں۔''[18]

ایک اور دلچسپ حکایت اور مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچ، ایرانیوں، پشتونوں اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی مانند کٹر یا جنونی مسلمان نہیں۔ بلوچ عوام کے پاس کیرتھر پہاڑیوں میں جھالاوان کے مقام پر ایک ''کتے کا مزار'' موجود ہے جو اسلامی فقہ اور نظریے کے خلاف ہے۔ ''ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک کتا تھا جس نے قرض کے وعدے کے بدلے اپنے آقا بدل لیا۔ وہ اپنے نئے آقا کے ساتھ زیادہ دن نہ رہا کیوں کہ اس سے پہلے ہی رات کے اندھیرے میں چور آئے اور تمام خزانہ لوٹ لے گئے۔ لیکن اس نے چوروں کا پیچھا کیا اور ان کو اس وقت تک اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جب تک وہ جگہ نہ دیکھ لی جہاں چوروں نے خزانہ دفن کیا تھا۔ دوسری صبح وہ اتنا زور زور سے بھونکا کہ اس کا آقا جاگ اٹھا اور وہ اپنے آقا کو لیے اس مقام تک جا پہنچا جہاں چوروں نے خزانہ دفن کیا تھا۔ پھر حسب توقع اس کا آقا اپنا مال واپس ملنے پر بہت ہی خوش ہوا اور اس کتے کی گردن میں بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا ایک کاغذ لٹکا دیا کہ قرض ادا کر دیا گیا ہے اور اسی حالت میں یہ کتا اس کے پرانے آقا کے پاس واپس بھجوا دیا گیا۔ اس طرح یہ کتا نہایت ہی خوشی کے عالم میں اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ لیکن اس کا آقا اسے دیکھ کر بہت ناراض ہوا۔ چوں کہ وہ ایک ایماندار شخص تھا اور اپنے کتے سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کا کتا اس کے وعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے نئے آقا کے پاس نہیں ٹھہرا، اس نے کتے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے لیکن جب آخر میں اس نے کتے کی گردن میں لٹکے بڑے بڑے حروف لکھے ہوئے دیکھے، اور وہ سب کچھ سنا جو اس کتے نے کیا تھا تو اسے سخت افسوس ہوا۔ اس نے کتے کے ہاتھ پاؤں جمع کیے اور انہیں ایک قبر میں دفن کر دیا۔'' اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈینس برے (D.Bray) لکھتا ہے: ''اگر یہ ہاتھ پاؤں، کسی سچے مسلمان کے ہوتے اور کسی نجس جانور کے نہ ہوتے تو پھر اس نے اس کے دفن ہونے پر اس قدر ہنگامہ نہ کیا ہوتا۔'' اور پھر اسی دن سے جھالاوان کے مکین اس وفادار کتے کے قبر پر حاضری دیتے ہیں۔[19]

Scanned by CamScanner

یہ امر بہت دلچسپی کا حامل ہے کہ افغانیوں، ایرانیوں اور برصغیر پاک و ہند کے معاشروں کے برعکس بلوچ معاشرے میں مذہبی جذبہ و جوش مفقود ہے۔ برطانوی استعماریت کے دوران ناصر خان اعظم کے دَور میں مسلمان مذہبی پیشواؤں نے بلوچ معاشرے کو کٹر اور قدامت پرست اسلام کے زیر تسلط لانے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ بلوچ معاشرے میں مندرجہ ذیل دو جذبے بدرجہ اتم موجود ہیں:

I. سیکولر جذبہ جوان کے منتخب رہنماؤں یا روایتی سرداروں میں موجود ہے۔

II. روحانی جذبہ جو بزرگوں کے اندر موجود ہے۔

اس ضمن میں پاسچنر (Pastner) کے یہ الفاظ بہت دلچسپ ہیں: ''اگرچہ وہ (بلوچ) اسلامی دنیا کا ایک حصہ ہیں لیکن بلوچوں کے ایمان کا سب سے مضبوط پہلو مسلمانوں کی عظیم روایات کا حصہ نہیں جو علما کی نازک دینی مباحث کا طرۂ امتیاز یعنی قرآن پاک ہے۔ اس قسم کی نازک خیالیاں صحراؤں میں رہنے والے خانہ بدوشوں یا ساحلی گاؤں (بلوچستان) کے مکینوں کے ادراک میں نہیں آسکتیں۔''[20]

بلوچ اور دوقومی نظریہ

دوقومی نظریہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستانی مسلمانوں میں فروغ پایا۔ سرسید احمد خان، سر محمد اقبال اور ایم اے جناح، اس تصور کے پہلے بانی تھے۔ اس موضوع کے متعلق بہت سے لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے لیکن کتاب کے اس حصے میں ہم بلوچ قیادت کے رویے پر نظر ڈالیں گے۔ جن بلوچ قائدین نے اس نظریے کی مخالفت کی، ان کی قیادت بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر، عبدالکریم شورش، عبدالرحیم خواجہ خیل اور ملک فیض محمد کے ہاتھ میں تھی۔ 1947ء میں جب حکومت پاکستان نے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کے ساتھ قلات کے الحاق کا مطالبہ کیا تو پارٹی کے سربراہ، میر بزنجو نے کہا:

''مسلمان قوم یا نظریہ پاکستان کہ جس کی مخالفت کا مجھ پر الزام عائد کیا جاتا ہے، حقیقت میں کچھ نہیں، تو پھر میں کس طرح ان کی مخالفت کرسکتا ہوں؟ ''مسلمان قوم''، جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں، اپنے وجود کی نفی کے ساتھ ساتھ یہ ایک تصور کے لحاظ سے بھی ناقابل عمل ہے۔ مثال کے طور پر ہم اپنے ملک میں کسی (مسلمان) ایرانی، افغان یا عربی کو ووٹ کا حق دیتے ہیں نہ ہی انہیں اس ملک میں کوئی بڑا عہدہ دیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس، ہم پاکستان کے ہندوؤں، مسیحیوں اور پارسیوں کو

Scanned by CamScanner

ووٹ کا حق دیتے ہیں اور انہیں اکثر بڑے عہدوں پر بھی فائز کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ یہ ایک خیالی تصور ہے جس کا عملی طور پر کوئی وجود نہیں۔''[21] دراصل جن خیالات کا اظہار میر بزنجو کی جانب سے ہوا ہے، وہ مذہبی ''قوم پرستی'' اور علاقائی قوم پرستی کے حوالے سے ایک عام بلوچ کے احساسات ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مارکسٹ بلوچ رہنما سردار خیر بخش مری نے جو بلوچ حق خودارادیت پر یقین رکھتے ہیں، ''اسلامی قوم پرستی'' کی مخالفت کی اور کہا: ''ہم صدیوں سے بلوچ چلے آ رہے ہیں اور پھر ہم گزشتہ 1300 برس سے مسلمان سمجھے جا سکتے ہیں جب کہ ہم گزشتہ 30 برس سے پاکستانی ہیں۔''[22]

مری کے نقطہ نظر کے برعکس، برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی اکثریت پہلے مسلمان ہے اور پھر ہندوستانی یا پاکستانی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم سے قبل جن اہم بلوچ رہنماؤں نے دوقومی نظریے کی حمایت کی، ان میں میر احمد یار خان (خانِ قلات) اور میر جعفر خان جمالی شامل تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ حمایت ایسے ہی تھی جیسے افغانوں کی حمایت، جنہوں نے خلافت اور ہندوستانی تحریک آزادی کی حمایت کی۔ (یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ 1920ء کی دہائی میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ایک شاخ افغانستان میں موجود تھی جس کے سربراہ مولانا عبیداللہ سندھی تھے)۔[23] بہرحال، ان دونوں رہنماؤں کی طرف سے دوقومی نظریہ کی حمایت خالصتاً ذاتی بنیادوں پر تھی کیوں کہ دوقومی نظریے کے ممتاز داعی، جناح نے قلات کے خان کے قانونی مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔

رسوم و رواج اور عادات

بلوچ نہ صرف اپنی زبان، ادب، مذہب اور احساسات بلکہ رسوم و رواج اور عادات کے لحاظ سے بھی اپنے ہمسایوں سے مختلف ہیں۔

کسی قوم کی تشکیل کے ضمن میں رسوم و رواج بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عربی اسلام، ایرانیوں کو عرب رسوم و رواج میں جذب کرنے میں ناکام رہا۔ ایرانیوں نے عرب حاکمیت کے خلاف جنگیں لڑیں اور مزاحمت کی۔ اگرچہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن انہوں نے اسلام کے اندر ایک نیا فرقہ، اثنائے عشری تخلیق کیا۔ انہوں نے اپنی جداگانہ زبان، ادب اور رواج برقرار رکھے۔ ترکوں اور افغانوں نے ایرانی اسلام کی حاکمیت اور اثر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی کلیہ بلوچوں پر بھی صادق آتا ہے جنہوں نے اپنے رسوم و رواج اپنائے رکھے جو پنجابیوں، سندھیوں، ایرانیوں اور افغان

Scanned by CamScanner

مسلمانوں سے مختلف ہیں۔

جب ہم بلوچوں کی قومی رسوم و رواج کا ان کے ہمسایوں سے تقابل کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ مسلمان ہیں لیکن ان کا لباس مختلف ہے اور وہ مختلف قسم کی خوراک استعمال کرتے ہیں۔ بلوچ بغیر مرچوں کے گوشت کھاتے ہیں جب کہ برصغیر ہند کے مسلمان، اپنی خوراک میں مختلف قسم کے مصالحے استعمال کرتے ہیں۔ بلوچوں کی خاص اور عام خوراک ''بجی'' (آگ پر بھونا ہوا گوشت) ہے جو برصغیر کے مسلمان استعمال نہیں کرتے۔ درحقیقت، مسلمان پنجابیوں اور سندھیوں کا رہن سہن، ہندوستانی ہندوؤں کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے لیکن مذہب کے معاملے میں تخصیص موجود ہے۔ آگے ہم بلوچوں کی اہم رسوم ورواج کا جائزہ لیں گے اور ان کا ہمسایہ مسلم اقوام یا نسلی گروہوں کی رسوم ورواج سے تقابل کریں گے۔

حسب ونسب

عربوں کی مانند، بلوچ بھی حسب ونسب کی پاکیزگی کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ وہ شاذونادر ہی اپنی بیٹیوں کی شادیاں غیر بلوچوں میں کرتے ہیں حالاں کہ پنجاب اور سندھ کی سرحد پر رہنے والے بلوچ، کھلے عام جٹوں اور راجپوتوں کی خواتین کو اپنی بیویاں بنا لیتے ہیں۔[24] ہر قبیلے کا اپنا ایک معیار حسب ونسب ہوتا ہے۔ انہیں مکمل یقین ہے کہ وہ عربی النسل ہیں اور وہ اپنے ہمسایہ مسلم اقوام یا نسلی گروہوں سے خود کو برتر سمجھتے ہیں۔ بلوچوں کے برعکس، ایرانی، پنجابی اور سندھی، کسی ایک نسل کو اپنے آباواجداد قرار نہیں دیتے۔ میر بزنجو نے 1948ء میں اعلان کیا، ''پنجاب اور سندھ میں کوئی بڑا نسلی گروہ نہیں ہے بلکہ یہاں مختلف قسم کی ذاتیں بستی ہیں جن کا کوئی مشترک تہذیب وتمدن ہے نہ ہی کوئی مشترک رسوم و رواج ہیں۔ ہم کسی بھی صورت میں پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کے لیے تیار نہیں۔ ہم مکمل طور پر خطرے میں ہیں۔ اس سے مراد یہ ہوگی کہ ہم ایشیا میں ڈیڑھ کروڑ بلوچوں کی موت کے پروانے پر دستخط کردیں۔ ہم بلوچ قوم کے استحصال کے لیے کسی غیر بلوچ قوم کے ساتھ انضمام کرنے کے جرم عظیم کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔''[25]

بلوچوں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے جب بلوچوں نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں غیر بلوچوں میں کرنے سے انکار کردیا۔ حتیٰ کہ کئی ایک مثالیں بیان کی جاسکتی ہیں جب ایک بڑا بیٹا اس وجہ سے قبیلے کا سردار نہیں بن سکا کیوں کہ اس کی والدہ غیر بلوچ تھی۔

Scanned by CamScanner

حال(Haal) (معلومات)

ایک اہم بلوچ رسم، حال(Haal) کہلاتی ہے جس سے مراد معلومات اور حالات حاضرہ کے متعلق باہم گفتگو اور بات چیت ہے۔ اس کا استعمال یوں ہے کہ ایک مسافر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ راستے میں ملنے والے ہر شخص کو خبریں اور معلومات فراہم کرے۔ اس کے جواب میں یہ شخص اس مسافر کو خبریں اور معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ہر قسم کی خبریں اور معلومات تمام بلوچوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ضروری ہے کہ ''حال'' کو نہایت ہی منضبط طریقے سے فراہم اور وصول کیا جائے۔ یہ ''حال'' بہت سے موضوعات، مثلاً کاروبار، قبائلی اور بین القبائلی چپقلش، موسمی حالات، بارش، مویشیوں کے لیے گھاس اور دیگر اشیائے خوردنی کی دستیابی، موجودہ سیاسی حالات وغیرہ پر محیط ہوتا ہے۔ لیکن خواتین کے متعلق معلومات سے سختی سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس طرح چند ہی دنوں میں اہم خبریں اور معلومات ملک بھر میں پہنچ جاتی ہیں۔ معلومات کی ایک دوسرے کو آگاہی کی رسم کے باعث ہر قبیلہ دوسرے قبیلے اور دشمنوں کے خطرے سے خبردار رہتا ہے۔ جو شخص معلومات اور فراہم کرنے سے انکار کرتا ہے، اسے جاسوس یا پھر دشمن سمجھا جاتا ہے اور پھر اس کے مطابق ہی اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔

خبروں اور معلومات کی فراہمی کا بلوچ نظام منفرد نوعیت کا حامل ہے اور بلوچوں کے ہمسائے مثلاً ایرانی، پشتون، پنجابی اور سندھی، اس رسم سے بے خبر ہیں۔

لباس

بلوچ لباس کے لحاظ سے بھی اپنے مسلمان ہمسایوں سے مختلف ہیں۔ بلوچ، ایک لمبا لبادہ (چغہ) جو نیچے ایڑیوں تک جاتا ہے، ڈھیلی ڈھالی شلوار جس کی پیمائش 20 سے 40 گز ہوتی ہے، بہت بڑی چادر، پگڑ (پندرہ سے بیس گز) اور ڈھیلی ڈھالی قمیص پہنتے ہیں، جسے کرتہ کہتے ہیں۔

پنجابی اور سندھی، شلوار کی بجائے دھوتی پہنتے ہیں اور ان کی پگڑیاں چھوٹی ہوتی ہیں۔ لباس کے لحاظ سے پشتون اور ایرانی بھی بلوچوں سے مختلف ہیں اور ان کے لباس کا رنگ بھی مختلف ہوتا ہے۔

لباس کے علاوہ خوراک، حال اور تفریحی سرگرمیوں کے معاملے میں بھی بلوچ، پاک و ہند، ایران اور افغانستان کے مسلمانوں سے عین اسی طرح مختلف ہیں جس طرح عربی مسلمان اپنی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ایرانی مسلمانوں سے مختلف ہیں۔[26]

Scanned by CamScanner

اپنے ہیروز پر فخر

کسی بھی قوم کی مشترک ہیرو، اس قوم کے اتحاد اور یکجہتی کا باعث ہوتے ہیں۔ جدید قوم پرستی کی تاریخ میں قوم کی تخلیق اور تشکیل میں ہیرو اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر قوم کے اپنے ہیرو ہوتے ہیں، مثلاً فرانس میں چارلی میگنا اور نپولین بوناپارٹ، جرمنی میں بسمارک اور روس میں لینن۔

مشرق میں ایرانی، ایرانی سلطنت کے بانیوں، دارا اعظم اور نوشیرواں کو اپنے عظیم قومی ہیرو گردانتے ہیں۔ ترک، فاتح محمد سلطان، شہنشاہ سلیمان، خیرالدین باربروسا (ترک بحریہ کا سربراہ) اور مصطفیٰ کمال اتاترک کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستانی، سندھ میں پہلے مسلمان حملہ آور محمد بن قاسم، ہندوستان میں پہلے مسلمان حملہ آور سلطان محمود غزنوی، ہندوستان کے مغل سلطنت کے بانی ظہیرالدین بابر، شاہ ولی اللہ، پہلے مذہبی عالم جنہوں نے افغان حکمران احمد شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، سرسید احمد خان، سرڈاکٹر محمد اقبال اور ایم اے جناح کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ ہندوستانی، اشوک، پرتھوی راج، اکبر، شیواجی، تلک، گاندھی اور جواہر لعل نہرو کو اپنا قومی ہیرو سمجھتے ہیں۔

بلوچ، بابل کے نمرود، جیروفت کے ابوسعید بلوچ، میر جلال خان، میر چاکر خان رند، میر سہراب خان دودائی، میر عبداللہ خان، میر ناصر خان اعظم، میر مہراب خان دوم، میر دوست محمد، خان برانزائی، میر حمال جیئند اور میر یوسف علی خان مگسی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جن کی اکثریت پاکستان یا ایرانیوں سے ناواقف تھی یا وہ ان سے نفرت کرتے تھے۔ (مثال کے طور پر ناصر خان اعظم اور اس کا باپ عبداللہ خان کہار، جس نے ایران اور اسلامی ہندوستان پر حملہ کیا)۔ دوست محمد خان کو باغی سمجھا جاتا ہے جو ایران میں بلوچستان کی آزاد حکومت دوبارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ میر یوسف علی خان مگسی نے جدید بلوچ تحریک آزادی کی قیادت کی جو عظیم تر بلوچستان کے قیام کے لیے کوشاں تھا جس نے ایرانی اور پاکستانی قومی ریاستوں کو مسترد کر دیا تھا۔ ایران اور پاکستان کی نصابی اور تاریخ کی کتب میں بلوچ ہیروز کے کردار کو کم کر کے پیش کیا گیا یا ان کے کردار کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ بعض اوقات تو ان کے کردار کو غلط طور پر پیش کیا گیا، مثال کے طور پر میر یوسف علی مگسی کو تحریک پاکستان کے ایک کردار کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔[27]

درحقیقت، محمود غزنوی اور نوشیرواں جیسے کئی ایک پاکستانی ہیروز کو بلوچوں کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک ایران کا تعلق ہے، یہ کلیہ اس پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک قوم کا ہیرو، دوسری قوم کا دشمن

Scanned by CamScanner

ہوتا ہے۔ درج ذیل گوشوارے میں پاکستان اور ایران کے ان ہیروز کا ذکر ہے جنہیں بلوچوں کا دشمن سمجھا جاتا ہے یا بلوچوں کو جن کے کردار کا علم نہیں۔

ایرانی ہیرو	پاکستانی ہیرو
1. داراالاعظم	1. نوشیرواں
2. نوشیرواں	2. محمود غزنوی
3. محمد رضا شاہ	3. ایم اے جناح

درج ذیل بلوچ ہیرو، پاکستانیوں کے لیے اجنبی ہیں اور ایران کے دشمن سمجھے جاتے ہیں:

1. میر جلال حان	5. میر ناصر خان اعظم
2. میر چاکر خان	6. میر مہراب خان دوم
3. میر سہراب خان	7. میر یوسف علی خان مگسی
4. میر عبداللہ خان، صوبیدار	

بلوچ ضابطۂ عزتِ نفس

بلوچ غیر تحریری آئین کا اہم ترین حصہ بلوچ معیار (Baluchmayar) کہلاتا ہے جو بلوچ قومی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بلوچ مائرِ انفرادی بلوچ کی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے اور بلوچ معاشرے کا مستقبل متعین کرتا ہے۔ یہ روایات، برصغیر پاک و ہند کے علاوہ ایرانی روایات سے بھی بالکل مختلف ہیں۔ بلوچ روایات، ہر فرد کو اپنی نوجوانی کے زمانے سے ہی معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخ اور سیاست کے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بلوچ نیشنل موومنٹ کے لحاظ سے بلوچ مروّجہ اخلاقی نظام سے آگاہ ہوں اور اس امر سے بھی باخبر ہوں کہ کس طرح اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے قوانین کس طرح ایرانی اور پاکستانی قوانین سے مختلف ہیں۔

بلوچ معیار

بلوچ معیار کی بنیاد پر عزتِ نفس کے مطالبے کو لاج، غیرت، عزت اور ننگ و ناموس کہا جاتا ہے جسے ''بلوچ ضابطۂ عزتِ نفس'' کہتے ہیں۔ بعض اوقات بلوچ قومی پرست مصنف اس ضابطے کو بلوچیت بھی کہتے ہیں۔ بلوچ زندگی کے لیے بلوچ معیار کے اصول یا بلوچ ضابطۂ عزتِ نفس، رہنما نکات ہیں لیکن عزتِ نفس کسے کہتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک بلوچ رزمیہ شاعر نے غیرت کے موضوع پر

Scanned by CamScanner

مندرجہ ذیل سطور تخلیق کی ہیں:

کچھ عزت اور وقار کی خاطر اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں،
کچھ روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر زندہ رہتے ہیں،
وہ جو خود انتقام لیتا ہے،
اپنی حسین بیوی کو الوداع کہہ دیتا ہے،
جسے طاقت اور دولت کی کوئی خواہش نہیں،
یہی تو بلوچ مائر کے اہم اور بنیادی اصول ہیں۔

بیر یا حون (انتقام)

بلوچ معیار کے بنیادی اصول کا تقاضا ہے کہ خون کا انتقام لیا جائے۔ بلوچ تاریخ اور عوامی داستانیں، ''بیر'' کی کہانیوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایک بلوچ ''بَلّ'' (حکایت) انتقام کے بلوچ تصور پر روشنی ڈالتی ہے۔ جس طرح دو برس کا ہرن توانا اور تازہ دکھائی دیتا ہے، عین اسی طرح بلوچوں کی طرف سے خون کے انتقام کا تصور بھی گزشتہ دو سو برس سے توانا اور تازہ ہے۔

قتل کی صورت میں قتل کا نشانہ بننے والے فرد کے خاندان پر لازم ہے کہ وہ اس جرم کا انتقام لے۔ انتقام کا فرض اور ذمہ داری متاثرہ قبیلے یا فرد کے قبیلے کے خلاف خاندان پر یا پھر بذاتِ خود فرد پر عائد ہوتی ہے۔ اس اصول کے باعث قبائل کے درمیان خونی فساد، قبائلی ہجرت اور خاندانوں کی تباہی نے جنم لیا۔ انتقام کے اصول کو زندہ رکھنے کے لیے متاثرہ خاندان کی بڑی بوڑھی خواتین نے خود میں ہمیشہ کینہ کے جذبے کو جوان رکھا۔ اس ضمن میں ایک بلوچ شاعر نے لکھا:

''گہرے کنووں میں پتھر پانی ہو سکتے ہیں،
لیکن نفرت اور کینہ،
سچے انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے،
نہ تو پتھر پانی ہوں گے اور نہ ہی کینہ اور نفرت ختم ہوگی۔''[28]

بلوچوں کے درمیان خونی فساد کو کم کرنے کے لیے، میر ناصر خان اعظم اور بعد ازاں برطانوی حکومت کی طرف سے متعدد اقدامات کیے گئے جب انہوں نے ''خان کے نام پر'' بلوچستان کا انتظام سنبھالا۔ گل خان کے مطابق، ناصر خان اعظم نے خون کے بدلے معاوضہ کے لیے ایک ایسا نظام

Scanned by CamScanner

متعارف کرایا جسے بلوچ روایتی قانون سے اخذ کیا گیا تھا۔ قبائلی سرداروں اور خانانِ بلوچستان کے معززین کو مزید تحفظ فراہم کرنے کی خاطر معاوضہ دگنا کر دیا گیا جو ایک قبائلی فرد کے لیے قابل ادائیگی تھا۔ بعدازاں سرداروں نے اس سہولت کا دائرہ اپنے خاندانوں تک وسیع کر لیا۔ ناصر خان اعظم کے دورِ حکومت میں عمومی نرخ -/2700 روپے تھا لیکن اس کے ساتھ ایک سو روپے بھی دینے پڑتے جو خانان بلوچستان کو ادا کر دیئے جاتے۔ لیکن اقلیتی رعایا، مثلاً ہندوؤں، یہودیوں اور لوریوں جیسے غلام قبائل کے لیے خون کے انتقام کے بدلے معاوضہ کے ضمن میں سہولت میں بہت اضافہ کر دیا گیا۔ خون کا معاوضہ -/14,000 سے -/20,000 روپے تھا۔ یہ معاوضہ ان کے استعمال کے لیے دیا جاتا تھا۔[29] کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ بلوچ قبائلی نے کسی اور کے علاوہ اپنے سیال (Sial) یا مٹ (Mat) (ہم حیثیت شخص) کو قتل کیا ہو۔ نقد معاوضہ شاذ و نادر ہی دیا جاتا اور اس کی بجائے عام طور پر زمین، لڑکیاں، اونٹ، بھیڑیں، بکریاں اور اسلحہ دیا جاتا۔ سب سے زیادہ توہین آمیز مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ ملزم اور اس کے ایک دو قریبی رشتہ دار قبائلی اکٹھ میں ہتھیار پھینک دیں، اس رسم کو مُکھ (Mukh) کہا جاتا ہے۔ (ڈیرہ جات اور مری رگبتی قبائل کے ہاں ہتھیار ڈالنے کی یہ رسم موجود نہیں)۔

انیسویں صدی کے دوران، سردار یا سردار کھیل کے خون کے معاوضے کی رقم تقریباً بیس ہزار اور دو لاکھ روپے کے درمیان ہوتی تھی۔ بلوچ قبائلیوں کے خون کا معاوضہ صرف پندرہ سو روپے مقرر کیا گیا تھا۔[30]

محکوم اقوام کی پہلی حیثیت تو قائم نہیں رہی تھی اور ان کے خون کے معاوضے کی رقم صرف دو سو روپے مقرر کی گئی تھی۔ 1947ء تک قتل کے مقدمات کا فیصلہ تعزیری قوانین اور برطانوی تشکیل کردہ "Frontier Crime Regulations" کے تحت کیا جاتا تھا حالاں کہ لوگ خون کا بدلہ خون کے قانون کے قائل تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ بلوچوں کی قدیم رزمیہ نظموں میں وحشیانہ انتقام کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ اس ضمن میں محمد سردار خان لکھتا ہے:

''چاکری (Chakarian) دورِ حکومت میں ایک بہت ہی معزز شخص بجار کو بلیدی قبیلے کے ایک شخص نے قتل کر دیا اور اس کی پسلیوں کو بھون کر اس کا گلا سڑا گوشت پرندوں کی خوراک بننے کے لیے باہر پھینک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مقتول شخص کے رشتہ داروں نے بلیدی قبیلے کے سردار، ہیبت خان کو جا پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے ڈھلانی بلند چٹان پر لے گئے تا کہ اپنی وحشیانہ انتقامی رسم انجام

Scanned by CamScanner

دی جائے، پھر انہوں نے اس کا سر قلم کر کے اس کی کھوپڑی کا پیالہ بنایا اور جیتنے والے کو پینے کے لیے اس پیالے میں مشروب پیش کیا جاتا۔ یہ رسم بجار کے خاندان میں عرصے تک رائج رہی۔"[31]

عرب جغرافیہ دان المقدسی، اس سے پہلے 98 عیسوی میں بلوچوں کے ظالمانہ اور بربرانہ انتقام کے بارے میں تحریر کر چکا تھا۔ اس ضمن میں محمد سردار خان نے بر (Ber) کے ایک معاملے کا احوال تحریر کیا جو سولہویں صدی میں گشکوری اور لاشاری قبائل کے درمیان پیش آیا۔ واقعہ یہ تھا کہ گشکوری قبیلے کے ایک فرد نے بطور انتقام لاشاری قبیلے کے ایک سو افراد کو قتل کر دیا اور کہا:

"میں تمام دنیا کو ذبح نہیں کر سکتا اور کسی طرح بھی امن بحال نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میرے دشمن مسقط (سمندر پار) پرواز کر جائیں۔"

انفرادی اور قبیلے کے درمیان فساد کے باعث بلوچوں میں نا اتفاقی پیدا ہو گئی۔ اٹھارہویں صدی میں میر ناصر خان اعظم نے سندھ کی بلوچ ریاست کے خلاف فوجی مہم میں افغانستان کے تیمور شاہ کی مدد کی جس کے باعث بلوچ ریاستوں کے درمیان سیاسی دشمنی کا آغاز ہو گیا۔ 1839ء میں جب میر مہراب دوم کو قتل کر دیا گیا اور قلات پر برطانوی حملہ آوروں نے دھاوا بول دیا تو تالپور بلوچوں کے شاہی خاندان نے قلات کی کوئی مدد نہ کی۔ 1843ء میں تالپور بلوچ سندھ سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ان کا آخری سردار شیر محمد خان، بلوچستان میں کسی طرف سے فوجی امداد کی تلاش میں تھا تو میر ناصر خان دوم (میر مہراب خان کا بیٹا) اپنے مشترکہ دشمن، یعنی برطانویوں کے خلاف تالپور بلوچوں کی مدد کو نہ آیا۔

جب سے بلوچوں کے درمیان قوم پرستی کے عنصر نے جنم لیا ہے، اس وقت سے بلوچ قبیلوں کے درمیان فساد کی حوصلہ شکنی کی جاتی رہی اور اس کی تعلیم یافتہ بلوچوں نے مذمت بھی کی۔ امن اور ہم آہنگی کی ضرورت کے لیے کام کرنے کے حوالے سے متعدد نظمیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ درحقیقت چاہیے کہ انتقام کے اصول کو دشمن ممالک کے خلاف استعمال کیا جائے۔

باہوٹ (Bahut) (پناہ/امان)

بلوچ مائر کے دوسرے عظیم ستون کو باہوٹ (Bahut) (پناہ/امان) کہا جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت ہر بلوچ پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس شخص کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے جسے امان دی گئی ہو خواہ وہ دشمن، دوست یا کوئی اجنبی ہو۔ بلوچ رزمیہ نظمیں اور عوامی داستانیں ان افراد کی کہانیوں سے بھری پڑی ہیں جنہوں نے باہوٹ (Bahut) کے دفاع اور تحفظ کے لیے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔

Scanned by CamScanner

درج ذیل بلوچ عوامی داستان میں بلوچ معیار اور اس کی باہوٹ (Bahut) کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس کہانی کو امریکی ماہر بشریات، ایل ڈُپری (L.Dupree) نے تحریر کے ذریعے محفوظ کیا۔[32]

''خیمے نصب کر دیئے گئے اور خواتین نے رات کا کھانا تیار کیا۔ جیسے ہی صبح کا دھندلکا پھیلا، صحرا سے ایک گھڑسوار برآمد ہوا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا سیدھا خان کے خیمے تک پہنچا اور اس کے گھوڑے کے آگے خود کو گرا دیا۔ وہ خان کے پیروں سے لپٹ گیا اور پھر کہا کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ بہت سے گھڑسوار اس کا پیچھا کر رہے ہیں جن کے ساتھ اس کے خاندان کا خون کا جھگڑا ہے۔ بوڑھے خان نے جو اپنی عمر کے باعث نہایت عقلمند تھا اور اپنی سفید داڑھی کی مانند پاکیزہ نظر آتا تھا، درخواست گزار کو امان بخش دی۔ اس شخص کو اس خیمے میں لے جایا گیا جو مہمانوں کے لیے مخصوص تھا، وہاں اسے کھانا کھلایا گیا اور کہا گیا کہ وہ شام کے لیے تیار ہو جائے۔

تبھی خان کا چھوٹا بیٹا اپنے باپ کے پاس آیا اور چلا چلا کر کہنے لگا، ''اوہ میرے ابا جان، یہ تو بادشاہ گل ہے جس نے دو ماہ قبل میرے بھائی اور آپ کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔''

''میرے بیٹے، تم بالکل درست کہتے ہو لیکن یہ اب ہمارا مہمان ہے۔ اس نے ہم سے امان طلب کی ہے اور ہم نے اسے پناہ دے دی ہے۔ میرے بیٹے، یاد رکھو! اگر ایک سو سال بھی لگ جائیں تو تمہارے بھائی اور میرے بیٹے کا انتقام لیا جائے گا۔''

چھوٹا بیٹا اشتعال کے عالم میں اپنے والد کے خیمے سے باہر نکلا، اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ رینگتے ہوئے مہمان کے خیمے میں داخل ہوا اور مہمان کے سینے میں اس طرح خنجر گاڑ دیا جس طرح مہمان نے دو ماہ قبل اس کے بھائی کے سینے میں خنجر گاڑا تھا۔''

اگلی صبح، چیخوں اور ماتمی آوازوں کے درمیان مہمان کی لاش برآمد کی گئی۔ اشتعال کے عالم میں اپنے کپڑوں کو پھاڑتے اور اس کی پگڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بوڑھا خان چلا چلا کر کہنے لگا، ''یہ کس کی حرکت ہے؟ کس نے ہمارے خاندان پر بدنامی کا داغ لگایا ہے؟ اس بے عزتی کے لیے بلوچ ہمیشہ ہماری مذمت کرتے رہیں گے!'' یہ سن کر چھوٹا بیٹا اپنے باپ کے پاؤں پڑ گیا اور یہ کہتے ہوئے معافی کا درخواست گزار ہوا کہ انتقام نے اسے اندھا کر دیا تھا اور وہ خاندان کی بے عزتی کا باعث بنا ہے۔ بوڑھے خان نے وہی خنجر اٹھایا جس سے مہمان کو قتل کیا گیا تھا اور اسے اپنے بیٹے کے سینے میں گھونپ دیا۔

Scanned by CamScanner

یہ بلوچ خاندان مہمان کے خیمے میں قتل کی داستان کو ابھی تک بیان کرتا ہے لیکن اس کا انداز فخریہ ہوتا ہے۔"

سولہویں صدی میں باہوٹ کے اصول کے باعث اس اصول کے ماننے والے قبائل پہلی بلوچ اکائی میں بندھ گئے لیکن پھر ان کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تیس برس تک جاری رہی جس کے باعث اس اکائی کا خاتمہ ہوگیا اور بلوچ برصغیر ہند کی طرف کوچ کر گئے۔ جب برطانویوں نے ان "باغیوں" یا ان افراد کی واپسی کا مطالبہ کیا جنہوں نے برطانوی ہند میں قتل وغارت کا بازار گرم کیا تھا تو بہت بلوچ قبائل کے درمیان فساد اور جھگڑے کا مسلسل ذریعہ بنا رہا۔ برطانوی اور پاکستانی حکومت کے تحت پناہ/امان کے اصول کے باعث ایک تو بلوچوں میں قوم پرستی نے جنم لیا اور دوسرے یہ بلوچوں اور برطانویوں، ایرانیوں اور پاکستانیوں کے درمیان مسلسل تنازع کا باعث ثابت ہوا۔

مثال کے طور پر 1957ء میں مغربی بلوچستان (ایران) میں بلوچ باغی گروہ جس کی قیادت احمد شاہ کے ہاتھ میں تھی، نے مشرقی بلوچستان کے ضلع مکران میں پناہ حاصل کی جہاں پاکستانی حکام نے اس باغی گروہ کو گرفتار کرلیا۔ بلوچ عوام نے پاکستانی حکام کے اس اقدام کو بلوچ ضابطہ عزتِ نفس کی خلاف ورزی قرار دیا۔ اس باغی گروہ کے تحفظ کے لیے ایک درخواست ایک نوجوان سرکاری ملازم جمعہ خان نے کراچی (پاکستان) کی ہائی کورٹ میں داخل کی۔ باہوٹ کے تحفظ کی یہ کوشش ناکام رہی۔[33] عدالت اور حکومت پاکستان نے بلوچ باغی گروہ کی ایران جلاوطنی کی حمایت کی جہاں تہران میں احمد شاہ کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے نتیجے میں بلوچستان میں بے چینی پیدا ہوگئی اور بالآخر بغداد میں بلوچستان لبریشن فرنٹ کی بنیاد رکھ دی گئی۔

مہمانی (مہمان نوازی)

بلوچ معیار کا تیسرا عظیم ستون، ہر مہمان کی مہمان نوازی اور حفاظت ہے۔ بلوچ قبائلی مہمان نوازی کے ضمن میں انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہیں جسے غریب بلوچ گھرانوں میں بھی انتہائی اہم ذمہ داری اور فرض سمجھا جاتا ہے۔ کھانے کے اوقات میں گھر میں موجود ہر شخص کو کھانے میں شریک کیا جاتا ہے۔ مہمان نوازی کے لیے گھر کا سربراہ یا قبیلے کا سردار اپنی آمدنی کا بہت زیادہ حصہ خرچ کرتا ہے۔ جو بھی قبائلی یا اجنبی اُوطاق (Utak) مہمان خانہ یا گیدان (Giddan)، مہمانوں کے لیے مخصوص خیمے میں پہنچتے ہیں، انہیں سربراہ کا مہمان تصور کیا جاتا ہے۔ مہمان نوازی سے انکار سے مراد بلوچ معیار

Scanned by CamScanner

کی خلاف ورزی تصور کیا جاتا ہے جس کی سزا کے طور پر قبائلی جرگے کی طرف سے پچاس سے پانچ سو روپے تک جرمانہ کیا جاتا ہے۔ مہمان کی رخصتی یا میزبان کی علاقائی ذمہ داری سے مہمان کے باہر نکلنے کے باوجود مہمان نوازی میں مہمان کی حفاظت بھی شامل ہے۔ مہمان کی مہمان نوازی اور حفاظت کو بلوچوں میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ مہمان کی توہین یا قتل کی صورت میں، مہمانی کا تقاضا ہے کہ میزبان اس کا انتقام لے جو میزبان یا میزبان قبیلے کی مقدس ذمہ داری ہوگی۔ مہمانی کی روایت نے بلوچ سیاست پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں۔ شمال مغربی سرحد کے ایک برطانوی سیاسی اہلکار، آر ٹمپل (R.Temble) نے مہمان نوازی کی اہمیت کے متعلق لکھا، ''وہ (قبائلی) مہمان کے ساتھ غداری کے سوا تقریباً ہر قسم کا سلوک روا رکھیں گے۔''

1976ء میں، ایک بلوچ سرکاری ملازم کا پاکستانی قوانین اور بلوچ معیار کے ساتھ اختلاف ہوگیا۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک شام دو بلوچ طلبہ مہمان کی حیثیت سے اسلام آباد میں اس کی رہائش گاہ پہنچے۔ وہ ''ملک دشمن سرگرمیوں'' میں ملوث تھے۔ ایک بلوچ کی حیثیت سے اس نے بلوچ معیار کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا اور انہیں پناہ دینے کے علاوہ ان کی بحفاظت روانگی کا بھی انتظام کر دیا۔ اس کا نتیجہ حکومت پاکستان کی طرف سے بلوچ سرکاری ملازم کی گرفتاری کی صورت میں برآمد ہوا۔

میڑھ (Meir)

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی جرم کی معافی کے حوالے سے ملزم کے خاندان کی خاتون سے مداخلت کے لیے درخواست کی جائے اور خاتون کو اس کی عزت کی علامت کے طور پر لباس عطا کیا جائے لیکن آبروریزی کی وجہ سے قتل کا معاملہ تخصیص کا حامل ہے۔ بلوچوں میں یہ روایت عام طور پر موجود ہے کہ ملزم کے خاندان کی خاتون کی مداخلت کے باعث بلوچ انتقام نہیں لیتے۔ بلوچوں کی تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جب خواتین کی طرف سے مداخلت کے باعث بلوچ قبائل کے درمیان امن قائم ہوگیا۔ مختلف قبائل یا افراد نے جب بھی خاتون کی طرف سے مداخلت سے انکار کیا، انہیں بلوچ معاشرے کی طرف سے مذمت کا سامنا کرنا پڑا۔

1974ء میں بلوچ خاندانی سلطنت کے آخری حکمران نواب نصرب خاں ہوت نے جسکانی قبیلے کے ایک معزز شخص کو گرفتار کرلیا۔ اس کی ماں اپنے بیٹے کو رہا کرانے کے لیے ڈیرہ اسماعیل کی

Scanned by CamScanner

عدالت میں حاضر ہوئی۔ جسکانی قبیلے کے معزز شخص کی والدہ کی عزت کرنے کی بجائے نواب نصرت خاں نے اس خاتون کو بے آبرو کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ جسکانی قبیلے کی خاتون نے اپنی عزت بچانے کی خاطر خودکشی کر لی۔ بلوچ معیار کی خلاف ورزی کا نتیجہ اس سلطنت کے زوال کی صورت میں برآمد ہوا۔ ڈیرہ جاٹ کے سرداروں نے حکمران کے خلاف بغاوت کردی اور افغانستان کے حکمران، زمان شاہ کو ملک پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔[34]

1974ء میں بلوچستان میں فوجی کارروائی کے دوران، خواتین کی آبروریزی کی گئی اور انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ جب یہ خبر بلوچستان کے دارالحکومت، کوئٹہ پہنچی تو بلوچ خواتین، اپنی تاریخ میں پہلی بار اکٹھی ہوئیں اور انہوں نے صوبے کے گورنر، اکبر خان بگتی (بگتی قبیلے کے سربراہ) کے مائر کے طور پر گورنر ہاؤس کی طرف مارچ کیا اور مطالبہ کیا کہ صوبے سے پاکستانی فوج کو واپس بھیجا جائے۔ بہرحال گورنر، میئر (Meir) کا مطالبہ پورا کرنے میں ناکام رہا جس کے باعث بگتی قبیلے کے سربراہ کے خلاف نفرت پھیل گئی اور اس کا سیاسی زوال شروع ہوگیا۔ بعد میں اس کا بیٹا، جو قومی اسمبلی کا امیدوار تھا، انتخابات ہار گیا کیوں کہ اس کے باپ نے میئر (Meir) کی خلاف ورزی کی تھی۔[35]

سیاہ کاری (زنا کاری/بدکاری)

بلوچ معیار کے اہم اصول کو سیاہ کاری (زنا کاری/بدکاری) کہا جاتا ہے اور زانی کے علاوہ زانیہ کو بھی موت کی سزا دی جاتی ہے۔ زانی اور زانیہ کو کالا (Kala) اور کالی (Kali) کہا جاتا ہے۔ زنا کاری کی صورت میں اگر زانی فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر اس کے دیگر رشتہ داروں کی آبروریزی نہیں کی جاتی کیوں کہ مجرم ہی وہ واحد شخص ہے جس پر تمام الزام عائد ہوتا ہے۔ بلوچ روایت کے مطابق زنا کاری میں ملوث شخص باہوٹ (Bahut) کا مستحق نہیں۔

ابتدائی طور پر سیاہ کاری کا اصول اپنی موجودہ صورت میں بلوچ معیار کا حصہ نہیں تھا۔ پندرھویں اور سولہویں صدی کی رزمیہ شاعری کے مطابق سیاہ کاری، طلاق کے قانون کے تحت قابل سزا تھی۔ بہت سے بلوچ رزمیہ شاعر زنا کاری میں ملوث تھے جو رزمیہ نظموں سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ پندرھویں اور سولہویں صدی کا بلوچ معاشرہ، یورپی معاشروں کی مانند تھا۔

''شہوانی عشق کی جذبات کے لحاظ سے پہلی تاریخی صورت بنی نوع انسان (کم از کم اگر ان کا تعلق حکمران طبقات سے ہو) کے لیے فطری نوعیت کی حامل ہونے کے علاوہ شہوانی جذبے کی

Scanned by CamScanner

اعلیٰ ترین صورت بھی ہے، اور یہی اس کی منفرد خصوصیت ہے۔ انفرادی شہوانی عشق کی پہلی صورت، ازمنہ وسطیٰ کی پاکیزہ محبت، کسی بھی طرح ازدواجی تعلقات کی مانند نہیں۔ اس کے قطعی برعکس فرانس کے سابق جنوب مشرقی صوبے کے افراد میں مروج شہوانی عشق، سیدھا سیدھا زناکاری ہے اور عشقیہ شاعری کرنے والے شاعر اس زناکاری سے حظ اٹھاتے ہیں۔ شہوانی عشق کا پھول جرمنی اور ٹیگلیڈیر میں صبح کے گیت کہلاتا ہے۔ ان گیتوں میں رنگین انداز میں بتایا جاتا ہے کہ کس طرح نائٹ (knight) اپنی معشوقہ کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے اور اس کی بیوی کسی دوسرے نائٹ (knight) کے ساتھ ہم بستری کرتی ہے جب کہ باہر پہریدار کھڑے ہوتے ہیں جو صبح کی پہلی کرن کی آمد سے پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں تاکہ یہ نائٹ (knight) کسی کی نظروں میں نہ آئے۔ جدائی کا منظر اس نظم کا عروج ہوتا ہے۔ شمالی فرانسیسیوں کے علاوہ معزز جرمنوں نے بھی پاکیزہ محبت کے انداز کے ساتھ ساتھ اس قسم کی شاعری اپنائی تھی۔''[36]

سولہویں صدی کے اواخر میں بلوچ قبائل کی ایک بڑی تعداد نے وادیٔ سندھ کی طرف ہجرت کی جہاں انہیں افغانیوں اور ترکوں کے علاوہ ''کم ذات'' جٹوں اور ہندوؤں سے واسطہ پڑا۔ خون کے اس ''خالص پن'' اور شناخت کو محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے زانی اور زانیہ کے لیے موت کی سزا متعارف کروائی۔

ناصر خان اعظم کے دورِ حکومت میں سیاہ کاری کے معاملات سے ریاستی قانون کے تحت طے کیے گئے لیکن انیسویں صدی میں قبائلیوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور معمولی شہادتوں کی بنا پر بہت سے افراد کا قتل کر دیا گیا۔ اس قتل عام کو روکنے کے لیے، برطانوی دورِ حکومت کے دوران سرداروں کی نگرانی میں متعدد اقدامات کیے گئے۔

مثال کے طور پر اگر زانی اور زانیہ، دونوں کو قتل کر دیا جائے تو کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔ اگر یہ دونوں بچ نکلتے ہیں تو پھر خاتون کو طلاق دے دی جاتی ہے۔ اکثر قبیلوں میں معاوضے کا کوئی مقرر نرخ نہیں جو عمومی طور پر ایک یا زیادہ لڑکیوں اور تقریباً نقد بارہ سو روپے پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر معاملے کے مطابق اس کا تعین کیا جاتا ہے۔[37] ایک ''باہوٹ'' یا ہمسایہ، جو زناکاری کا مرتکب ہوتا ہے، وہ موت کی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ ہمسایہ سے مراد ہے:

1. وہ شخص جو جرم کرنے کے بعد اپنا قبیلہ چھوڑ دیتا ہے اور کسی دوسرے قبیلے میں پناہ حاصل

کر لیتا ہے۔

2. وہ شخص جس پر زنا کاری کا الزام عائد کیا جاتا ہے، وہ اپنا قبیلہ چھوڑ کر دوسرے قبیلے کے پاس پناہ حاصل کر لیتا ہے۔

3. وہ شخص جو اپنے نجی معاملات کی بنا پر کسی دوسرے قبیلے کی پناہ میں جاتا ہے۔

جو کوئی بھی دوسرے قبیلے میں جا کر کاشتکاری کرتا ہے، اپنی جانوروں کو چرنے کے لیے بھیجتا ہے، یا پھر دوسرے قبیلے کا مختصر دورہ کرنے یا روزی کمانے کے لیے وہاں جاتا ہے، اسے ہمسایہ نہیں سمجھا جاتا۔

اب ہم ایک زانی یا ہمسایہ کو حاصل ہونے والی ''سہولیات'' پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔ اگر ایک سیاہ کار بچ نکلتا ہے اور ایک دوسرے قبیلے کے پاس پناہ حاصل کر لیتا ہے کیوں کہ وہ اپنے قبیلے میں نہیں رہ سکتا، تو اس کا میزبان قبیلہ اس کے تمام افعال کا ذمہ دار ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر ''الف'' کا تعلق میزبان قبیلے سے ہو اور وہ بگتی قبیلے کے پاس پناہ حاصل کر لے، یہاں وہ زنا کاری کا مرتکب ہو اور اس وجہ سے مارا جائے، تو اس کے وارث کسی بھی قسم کا معاوضہ وصول کرنے کے حق دار نہیں ہوں گے۔ اس کی موت کے بعد اس کے رشتہ دار اس کی بیوی اور بچے کو واپس لانے کے حق دار ہیں۔

اگر ایک سیاہ کار کسی دوسرے قبیلے کے پاس پناہ گزیں ہو جائے اور اسے اس کا اپنا قبیلہ ہی قتل کر دے تو پھر میزبان قبیلہ اس کا انتقام لینے کا حق دار نہیں۔ بلوچوں کا عام اصول یہ ہے کہ وہ ''کالا اور کالی'' کا قتل کر دیتے ہیں: یہ کبھی کبھار ہی ''ہمسایہ'' کی حیثیت کر پاتے ہیں۔

کمزور و لاچار طبقہ

بلوچ معیار کا تقاضا ہے کہ کمزور و لاچار لوگوں کی عزت کی جائے اور قبائلی انہیں قتل کرنے سے باز رہیں۔ مندرجہ ذیل افراد کو کمزور و لاچار سمجھا جاتا ہے:

1. زال یا زن (عورت)۔
2. 17 برس سے کم عمر لڑکا یا جس لڑکے نے شلوار نہ پہنی ہو۔
3. مذہبی اقلیتوں، مثلاً ہندوؤں کے ارکان۔
4. کم تر اقوام مثلاً غلام، ڈوم اور بھانڈ (موسیقار، گائیک اور ماہرین حسب و نسب)، اور نقیب (وہ افراد اور سرداروں کو آگ جلانے کی لکڑی فراہم کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں یا پھر قبیلے کی حدود میں

Scanned by CamScanner

ڈاک یا پیغام لے جاتے ہیں)۔

5. وہ شخص جو کسی مسجد یا خانقاہ میں پناہ گزیں ہو اور جب تک وہ مسجد یا خانقاہ میں موجود رہے۔

علاوہ ازیں، یہ بھی ضروری ہے کہ لڑائی اس وقت بند ہو جائے جب کسی خاتون، کسی روحانی پیشوا یا پھر وہ شخص جس نے قرآن پاک اٹھایا ہو، ثالثی کرے۔

1958ء میں بلوچ بغاوت کے دوران زہری قبیلے کے سربراہ، نواب نوروز خان کی قیادت میں باغیوں کے ایک گروہ نے پاکستانی فوج کے خلاف مزاحمت جاری رکھی جس کا اختتام بالآخر قرآن پاک کی مدد کے ذریعے بلوچ معیار کے اصول کے اطلاق کے ذریعے ہوا۔ لیکن معاہدے کے برعکس، جنرل ٹکا خان نے نواب نوروز خان کو ان کے سات قریبی رفقا کے ہمراہ گرفتار کر لیا اور ان پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا گیا۔ نواب نوروز خان قید میں فوت ہوئے جب کہ دیگر سات افراد سبزل خان، مستی خان، غلام رسول، بہاول خان، بٹے خان، جمال خان اور ولی محمد کو حیدر آباد اور سکھر کے قید خانوں میں 5 جولائی 1960ء کو پھانسی دے دی گئی۔ پاکستانی فوج کی جانب سے بلوچ معیار کی خلاف ورزی کے باعث مری، بگتی اور مینگل قبائل کی طرف سے بغاوت کا آغاز ہوا اور بالآخر بلوچ پیپلز فرنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ یوں بلوچ معیار، نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی رسوم سے مختلف ہے بلکہ ایرانی اور پاکستانی مملکتوں کے قوانین کو للکارتا ہے اور بلوچ قوم پرستی کو فروغ دیتا ہے۔

اعتبار/امانت (بھروسا)

بلوچ معیار کے ایک اور اصول کو امانت یا اعتبار کہا جاتا ہے۔ اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہر بلوچ ہر امانت کی آخری دم تک حفاظت کرے۔ مغربی بلوچستان (ایران) میں تعینات برطانوی سفارت کار میجر پرسی سائیکس (Major Percy Sykes) نے لکھا: ''بلوچ انتہائی ایمان دار ہیں، اور اگر ان کے پاس قیمتی اشیا یا خطوط رکھوائے جائیں، وہ ان کی حفاظت اپنی زندگیوں سے زیادہ کریں گے، اس کے علاوہ وہ انتہائی اخلاقی اقدار کے حامل ہیں اور اپنی خواتین سے کم و بیش برابری کا سلوک کرتے ہیں۔ درحقیقت، وہ ایک ضابطہ عزت نفس کے حامل ہیں اور عمومی طور پر وہ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کی ایمان داری کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ اگر محکمہ ٹیلی گراف کے ملازمین کی تنخواہوں سے بھرا ہوا تھیلا ملازمین کے ہاتھ لگے تو وہ اپنی اپنی تنخواہ نکال لیں گے اور باقی رقم کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔ صرف ایک مرتبہ اس اعتبار کا غلط استعمال کیا گیا لیکن چور کو ملک چھوڑنا پڑا

Scanned by CamScanner

جوایک بلوچ کے لیے سب سے بڑی سزا ہے۔[38]

قول (وعدہ)

بلوچ ضابطہ عزتِ نفس کا تقاضا ہے کہ ایک بلوچ اپنے الفاظ یا وعدے سے وفادار رہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ہندی ہمسایوں (پنجابی اور سندھی) اور ایرانیوں سے مختلف ہیں جہاں قول کو ایک انفرادی عمل کہا جاتا ہے جس کے متعلق ایک برطانوی افسر نے کہا، ''ایرانیوں پر بھروسا مت کرو۔''[39]

افغانیوں (پشتونوں) میں بھی قول کا اصول ایک انفرادی عمل ہے۔ 1939ء میں برطانوی فوج نے نہایت حیرانی سے قلات پر قبضہ کرلیا اور بلوچستان کے حکمران، مہراب خان کو قتل کردیا۔ برطانوی سازشوں کے باعث بلوچ قبائل میں بغاوت کا عنصر پیدا ہوگیا۔

1940ء میں مری بلوچوں کو زیرنگیں کرنے کے لیے برطانوی فوج بھیجی گئی۔ مریوں اور برطانیوں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں برطانویوں نے مکمل طور پر ہتھیار پھینک دیئے اور اس کے بدلے انہیں بحفاظت واپس جانے کا موقع دیا گیا۔ بلوچ اپنے معاہدے کی شرائط پر قائم رہے اور اس طرح انہوں نے برطانوی فوج کی عزت کی بلکہ ان سے مہربانی پر مبنی سلوک کیا۔

بلوچوں کے برعکس پہلی افغان جنگ (1839-41) کے دوران، کابل کے امیر دوست محمد کے بیٹے اکبر خان نے کابل میں برطانوی سفیر میک ناٹن (MacNaghten) کو ایک معاہدے کی دعوت دی۔ بجائے اس کے کہ برطانوی بحفاظت نکل جانے کے اپنے وعدے کو پورا کرتے، میک ناٹن نے محمد اکبر کو گرفتار کر کے اسی پستول سے قتل کردیا جو اس نے اس سے پہلے محمد اکبر کو خیر سگالی کے جذبے کے تحت تحفہ کے طور پر دیا تھا۔[41]

شغان (Shigan) (طعن وملامت)

یہ بلوچ معیار کا آخری اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ان افراد پر کڑی نظر رکھی جائے جو بلوچ معیار کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے مہمانوں کا قتل کردیتا ہے یا باہوٹ کے ساتھ غداری کرتا ہے وغیرہ، اور کبھی بھی اپنا انتقام نہیں لیتا۔ بلوچ شاعری اور عوامی داستانیں شغان (Shigan) سے بھری پڑی ہیں کہ کس طرح کسی بزدل یا مایوس شخص کو انتقام لینے کے لیے اکسایا گیا۔ ایک شخص جو انتقام لینے کی اپنی ذمہ داری سے غفلت برتتا ہے، اسے ہمیشہ بے غیرت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اصول بلوچوں کو بلوچ معیار کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی یاد دلاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

بلوچ معیار اور حکومتیں

ایرانیوں اور پاکستانیوں کی نظروں میں بلوچ معیار محض ایک تہذیبی روایت ہے، نیز پاکستانی اور ایرانی حکام اسے ایک باقاعدہ قانون تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بلوچ معیار کے باعث پیش آنے والی مشکلات سے نمٹنے کے لیے برطانوی حکام نے "Blochistan Code and Frontier Crime Regulation" کے علاوہ وہ بدنامِ زمانہ برطانوی قوانین ایجاد کیے جن پر ابھی تک حکومت پاکستان عمل کر رہی ہے، جن کا مقصد بلوچستان میں ترقی کی بجائے بلوچوں کا استحصال ہے۔ جب سے بلوچوں میں قوم پرستی نے جنم لیا ہے، بلوچ معیار کا تصور ذاتی یا قبائلی سطح سے تبدیل ہو کر قومی سطح کی صورت میں ڈھل چکا ہے جس کا مقصد ہے کہ بلوچوں کے لیے حق خود ارادیت کا مطالبہ۔

Scanned by CamScanner

باب5

بلوچ قوم پرستی اور تاریخ

جب کچھ افراد اپنے ماضی کی تاریخ کی مشترک یادوں، کامیابیوں، حاصل کردہ فتوحات اور جدوجہد کے وارث ہوتے ہیں تو وہ خود کو ایک قوم سمجھنے لگتے ہیں۔ یوں ماضی کے مشترک تاریخی واقعات وحالات ایک قوم کو جنم دیتے ہیں۔ برطانوی حکومت کے آخری دَور میں جب نوآبادیوں میں جدید تعلیم یافتہ اشرافیہ کی آمد شروع ہوئی اور جب جدید یورپیوں نے نوآبادیوں میں دخل دینا شروع کیا تو تخیل آمیز اور افسانوی تاریخ مقبول ہوگئی۔[1] لہٰذا، روایتی اور پُرشکوہ کامیابیوں، جن کے متعلق نئے نئے دعوے (اکثر غلط طور پر) کیے گئے، نے ایک علیحدہ قوم کے مطالبے کو تقویت بخشی ہے۔

چالدی (Chaldean) دورِ حکومت یا بابلی تہذیبیں، پہلی بلوچ اکائی، مکران میں ملک اور بلیدی کی سلطنت، ڈیرہ جاٹ کی دودائی اکائی اور خانیت کی حکومت، بلوچ قومی تاریخ میں اہم ادوار گردانے جاتے ہیں۔ ریاست قلات کی نیشنل پارٹی (1936-1948) کے منشور کے مطابق بلوچ، بابل کے مکینوں کی قدیم ترین تہذیب کی نسل سے ہیں۔[2] مصنفین نے چالدی حکمرانوں کو بلوچ آباواجداد کی حیثیت سے پُروقار حیثیت دی ہے حالاں کہ یہ دعویٰ محض مبہم روایات پر مبنی ہے۔

اس باب میں ہم بلوچ روایتی تاریخ اور سیاسی اداروں کے علاوہ بلوچوں کی طرف سے ایک علیحدہ وطن کے مطالبے کے ضمن میں ان دو عناصر کے کردار کے متعلق مختصر ذکر کریں گے۔

قدیم تاریخ

پروفیسر رالنسن (Professor Rawlinson) ہی وہ مفسر تھا جس نے اپنے مقالے میں تفصیل سے یہ بتایا کہ بلوچ، چالدی النسل ہیں۔ جی رالنسن[3] (G.Rawlinson) کے مطابق لفظ بلوچ کا ماخذ ''بلوس'' (Balus) ہے جو بابل کا بادشاہ تھا، جسے نمرود (Nimrod) یا نبروڈز (Nebrodes) کہا جاتا

Scanned by CamScanner

تھا، کش (Kush) کا بیٹا، Holy Writ کا بیٹا اور وہ چلدی (Chaldean) خاندانی سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے تقریباً 2400 قبل مسیح میں حکومت کی اور بابل کا شہر تعمیر کیا۔ آشوری (Assyrians) یا شامی، نمرود کو اپنا سردار اور چالدی (Chaldean) بادشاہ اور آمرانہ قوت کی بنیاد پر فوجی ریاست کے نظریے کا بانی سمجھتے تھے۔[4] بابل (Babylon) کے علاوہ اس نے نینوا (Nineveh)، کالدہ (Caldah)، رہوبوتھ (Rohoboth) اور ارندریسم (Irand Resem) کی بنیاد رکھی۔

میجر سائیکس (Major Sykes) نے بغیر کسی تبصرے[5] کے پروفیسر رالنسن کے مقالے کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچ قوم پرست مصنفوں سردار خان بلوچ، میر خدا بخش بجارانی بلوچ (بلوچستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس)، میر عالم رقیب اور میر گل خان نے بھی اس مقالے کو ہی درست سمجھا ہے۔[6]

سردار خان کے مطابق لفظ ''بلوچ''، بابل کے دیوتا ''بیل'' (Bel) سے اخذ کیا گیا ہے، نیز اس نے قدیم لفظ ''بلوس'' (Belus) کو ''لارڈ'' (Lord) (آقا) کے معنی میں لیا ہے یعنی عزت واحترام پر مبنی نمرود کا نام۔ سردار خان لکھتا ہے کہ بابل کی فوجی اشرافیہ ''بیل'' کو پوجتی تھی۔ یوں سردار خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بلوچوں کا تعلق چالدی کے ''شاہی خاندان'' سے تھا جس نے میدیا (Media) اور ایرانی (Persian) تہذیبیں متعارف کروائیں:

''چالدی (Chaldean) کا دارالحکومت، بابل انسانی ہاتھ سے تعمیر شدہ کئی ایک پُرشکوہ تعمیرات سے مالا مال تھا اور یہ اس دور کے ایک نہایت ہی اہم شہر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت تجارت، فن، صنعت اور ادب اپنے عروج پر تھے۔ علم ہیئت کے سبب میں بہت سی نئی دریافتیں عمل میں آئیں اور آج کے ماہرین فلکیات اسی اندازِ فکر کے زیر اثر ہیں۔ اس پُرشکوہ قوم نے دنیا کو پیغمبر، دینی پیشوا، دانشور، فلسفی، عالم، مؤرخ اور ماہرین تحریر، فنکار اور خودنوشت سوانح نگار دیئے۔ چوں کہ میدیاؤں (Media)، آشوریوں اور ایرانیوں نے چلدیا (Chaldea) ہی سے طریقہ تحریر اپنایا تھا، اس لیے وہ انتظامیہ اور حکومت، فنون اور تعمیرات، ادب اور سائنس کے عمومی تصورات کے حصول کے ضمن میں اسی ملک کے احسان مند ہیں۔[7]

سردار خان کا دعویٰ ہے کہ بلوچوں کا ایک ایسی قوم کی حیثیت سے عزت وتوقیر کرنی چاہیے، ''جو اپنی تہذیب اور شان وشوکت کے بلندترین نقش آب سے زوال پذیر ہوئی ہے''، لیکن ''یہ قوم پہلی

Scanned by CamScanner

تھا، کش(Kush) کا بیٹا، Holy Writ کا بیٹا اور وہ چلدی(Chaldean) خاندانی سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے تقریباً 2400 قبل مسیح میں حکومت کی اور بابل کا شہر تعمیر کیا۔ آشوری(Assyrians) یا شامی، نمرود کو اپنا سردار اور چالدی(Chaldean) بادشاہ اور آمرانہ قوت کی بنیاد پر فوجی ریاست کے نظریے کا بانی سمجھتے تھے۔[4] بابل(Babylon) کے علاوہ اس نے نینوا(Nineveh)، کالدہ(Caldah)، رہوبوتھ (Rohoboth) اور ارندریسم(Irand Resem) کی بنیاد رکھی۔

میجر سائیکس (Major Sykes) نے بغیر کسی تبصرے[5] کے پروفیسر رالنسن کے مقالے کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچ قوم پرست مصنفوں سردار خان بلوچ، میر خدا بخش بجارانی بلوچ (بلوچستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس)، میر عالم رقیب اور میر گل خان نے بھی اس مقالے کو ہی درست سمجھا ہے۔[6]

سردار خان کے مطابق لفظ ''بلوچ''، بابل کے دیوتا ''بیل'' (Bel) سے اخذ کیا گیا ہے، نیز اس نے قدیم لفظ ''بلوس'' (Belus) کو ''لارڈ'' (Lord) (آقا) کے معنی میں لیا ہے یعنی عزت واحترام پر مبنی نمرود کا نام۔ سردار خان لکھتا ہے کہ بابل کی فوجی اشرافیہ ''بیل'' کو پوجتی تھی۔ یوں سردار خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بلوچوں کا تعلق چالدی کے ''شاہی خاندان'' سے تھا جس نے میدیا(Media) اور ایرانی (Persian) تہذیبیں متعارف کروائیں:

''چالدی (Chaldean) کا دارالحکومت، بابل انسانی ہاتھ سے تعمیر شدہ کئی ایک پُرشکوہ تعمیرات سے مالا مال تھا اور یہ اس دور کے ایک نہایت ہی اہم شہر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت تجارت، فن، صنعت اور ادب اپنے عروج پر تھے۔ علم ہیئت کے سبب میں بہت سی نئی دریافتیں عمل میں آئیں اور آج کے ماہرین فلکیات اسی اندازِ فکر کے زیر اثر ہیں۔ اس پُرشکوہ قوم نے دنیا کو پیغمبر، دینی پیشوا، دانشور، فلسفی، عالم، مؤرخ اور ماہرین تحریر، فنکار اور خودنوشت سوانح نگار دیئے۔ چوں کہ میدیاؤں(Media)، آشوریوں اور ایرانیوں نے چلدیا(Chaldea) ہی سے طریقہ تحریر اپنایا تھا، اس لیے وہ انتظامیہ اور حکومت، فنون اور تعمیرات، ادب اور سائنس کے عمومی تصورات کے حصول کے ضمن میں اسی ملک کے احسان مند ہیں۔[7]

سردار خان کا دعویٰ ہے کہ بلوچوں کا ایک ایسی قوم کی حیثیت سے عزت وتوقیر کرنی چاہیے، ''جو اپنی تہذیب اور شان وشوکت کے بلندترین نقش آب سے زوال پذیر ہوئی ہے''، لیکن ''یہ قوم پہلی

Scanned by CamScanner

عظیم تہذیب اور انسانی فلسفے کی بانی تھی۔''

جسٹس بجارانی لکھتے ہیں کہ ''یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کیا درحقیقت بلوچ، بابل کی سلطنت کے بانی تھے کیوں کہ بعض مؤرخین کا یہی موقف ہے، لیکن یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اُس دَور کے واقعات میں حصہ لیا۔''[8] جسٹس بجارانی، پروفیسر رالنسن اور دیگر افراد کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ لفظ ''بلوچ'' نے بابل میں جنم لیا اور اس کے ماخذ کو ایرانیوں، ہندوستانیوں یا کسی دیگر ذرائع سے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ شمال میں نینوا اور جنوب میں بابل کے درمیان دریائے دجلہ کا عمومی علاقہ، بلوچوں کا اصل وطن ہے۔

538 قبل مسیح میں آخری چالدی (Chaldean) حکمران، بشازر (Beshazzar) کو ایرانی حکمران اور ایرانی سلطنت کے بانی، سائرس اعظم کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اس طرح چالدی (Chaldean) سلطنت کا اختتام ہوا۔ سردار خان لکھتا ہے کہ بابل کے زوال کے بعد بلوچوں کے آباواجداد (اہل چلدی یا اہل بابل) کو ایرانی حکمرانوں نے زبردستی ان کے آبائی علاقوں سے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا تا کہ ان کے آبائی مذہب اور منفرد سماجی تہذیب کو اکھاڑ کر وہ اپنی تہذیب کو فروغ دے سکیں۔[9] یہ لوگ اس علاقے میں آباد ہو گئے جسے آج آرمینیا اور کردستان کہا جاتا ہے۔

خواہ ماہرین اس قابل ہو سکیں یا نہیں کہ وہ میسوپوٹامیا میں بلوچ قوم کے مخرج اور ماخذ کو تلاش کر سکیں، بلوچ اور غیر بلوچ علما میں زیادہ سے زیادہ اتفاقِ رائے موجود ہے کہ بلوچ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں بحیرۂ کیسپین کے جنوبی ساحلوں پر رہتے تھے۔ اس اخذ شدہ نتیجے کی بنیاد بہت حد تک اس لسانی ثبوت پر ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلوچی زبان نے اس گمشدہ زبان سے جنم لیا جس کا تعلق پارتھی (Parthian) یا میڈیائی (Median) تہذیب سے تھا جسے کیسپین اور اس کے ملحقہ علاقوں میں فروغ حاصل ہوا۔[10]

تاریخ اور مزاحمت

سردار خان کا کہنا ہے کہ ایرانی حکومت کے دَور میں بلوچوں کو بحیرۂ کیسپین کے ساحلوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا، نیز بلوچ یہاں آباد ہو گئے اور انہوں نے ایرانیوں کی افواج کی اشرافیہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ سردار خان اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لیے کوئی ثبوت فراہم کرتا ہے اور نہ ہی بتاتا ہے کہ دونوں اقوام کے درمیان دشمنی کس طرح دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

Scanned by CamScanner

ایرانی حکومت کے دَور میں بلوچوں کی تاریخ مبہم نوعیت کی حامل ہے اور اسے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ فردوسی کی رزمیہ شاعری کی تاریخی یادداشتیں ہیں جس نے اپنی کتاب ''شاہنامہ'' 400ء میں مکمل کی۔[11] ''شاہنامہ'' کا ابتدائی حصہ زیادہ تر ایرانی اسطور اور روایت پر مشتمل ہے۔ بلوچ اس وقت متعارف ہوئے جب وہ ایرانی بادشاہوں کیکوس اور کیخسرو کی افواج کا حصہ بنے۔ ایرانیوں اور بلوچوں کے درمیان تعلقات زیادہ واضح نوعیت کے نہیں اور نہ ہی ایک قاری کو ایران میں بلوچوں کی آئینی حیثیت کے بارے میں بتایا گیا۔ ''شاہنامہ'' کے ذریعے یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ بلوچ، ایرانیوں کے ہاتھ ظلم وستم سہنے اور بابل میں شکست کھانے کے بعد کیوں اور کیسے ایرانیوں کے دوست بن گئے۔ ہمیں تو محض یہ بتایا گیا کہ کیکوس، ''فارس، کیچ اور بلوچوں کے جنگجو'' بھرتی کرتا ہے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچ، کیخسرو کی حمایت میں شاہ توران، افراسیاب کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

''گستہام کے بعد اشکاش آیا۔۔۔اس کی فوج جو کوچ اور بلوچ آوارہ گردوں پر مشتمل تھی، جنگ پر آمادہ تھی۔۔۔۔اس جس کی مقبولیت کی زمانے بھر میں ثانی نہ تھا اور نہ ہی ان کے بدن کا کوئی حصہ اسلحہ کے بغیر تھا۔۔۔اس کے جھنڈے پر چیتے کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔''[12]

بہرحال، ایرانی فوج نے بلوچوں کی پہاڑیوں کا محاصرہ کرلیا اور نوشیرواں نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ عمر اور جنس کے امتیاز کے بغیر ہر بلوچ کو قتل کردیا جائے۔ فردوسی نے نوشیرواں کے احکامات کے متعلق یوں بیان کیا ہے: ''کہ پہاڑوں میں کوئی بلوچ باقی رہنے پائے نہ ہی ان کے ظلم اور سازشیں موجود رہیں۔''[13]

بہرحال، بلوچوں کو ختم کردیا گیا۔ فردوسی کہتا ہے، ''ان کی شکست کے بعد انہیں ایرانی فوج میں شامل ہونے پر مجبور کیا گیا۔ فردوسی کا بیان، بلوچوں کی طرف سے مزاحمت کی تصدیق کرتا ہے حالاں کہ بلوچوں کی طرف سے ایرانی حکومت کے خلاف بغاوت کی وجوہ کے متعلق اس کے بیان سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔

بہرحال، ایرانی تاریخ میں اردشیر اور نوشیرواں وہ پہلے افراد تھے جو بلوچوں کے قتل عام کے ذمہ دار تھے۔ نوشیرواں کے دورِ حکومت ہی سے دونوں اقوام کے درمیان تاریخی دشمنی موجود ہے۔ ایرانی، بلوچوں کو وحشی سمجھتے ہیں جب کہ بلوچ، ایرانیوں کو ظالم اور بدعہد جسے بلوچ اصطلاح میں گجار (Gajar) کہا جاتا ہے۔ گجار (Gajar) کی یہ اصطلاح انیسویں صدی میں ایرانیوں کے لیے اس وقت

Scanned by CamScanner

مشہور ہوئی جب کرمان کے گورنر نے نصیرالدین شاہ قاچار کے احکام پر 1891ء میں بلوچستان کا دورہ کیا اور یہ پختہ عہد کیا کہ وہ کسی کو قید نہیں کرے گا لیکن اس عہد کو توڑ دیا گیا اور بلوچ رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس دَور میں ایرانیوں کے لیے بلوچ اصطلاح ''گجار'' بہت مشہور ہوگئی جس کے لیے کرزن نے انگریزی کا لفظ "cudgel" استعمال کیا۔[14]

عرب مسلمان کے حملے اور 651ء میں عربوں کے ہاتھوں شکست فاش کے بعد یزدگرد سوم کے قتل کے بعد ساسانی (Sassanid) خاندانی سلطنت کا اختتام ہوگیا۔ ایرانی قومی شاعر اور مؤرخ بہار نے ایرانیوں اور عربوں کے درمیان جنگ کے واقعات کو اپنا موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ اپنے بیان میں اس نے ایرانی فوج میں بلوچ کمانڈر سیاسوار بلوچ کو ایرانی شکست کا ذمہ دار قرار دیا کیوں کہ سوار بلوچ نے عربوں کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کردیا تھا۔

سیاسوار کے کردار کا دفاع کرتے ہوئے مولانا فریدی نے لکھا کہ سیاسوار نے ایرانی حکمرانوں کے جرائم کے ردِعمل میں اپنی قوم کی خاطر یہ قدم اٹھایا۔[15]

سیاسوار نے اپنے قبیلے السوارہ سمیت اسلام قبول کرلیا اور عرب فوج میں شامل ہوگئے۔ مولانا فریدی کا موقف ہے کہ بلوچ قبیلے ''زٹ'' (Zat) اور ''جدگل'' (Jadgal) بھی اموی خلفا کی فوج میں شامل ہوگئے۔[16] دمشق اور بغداد کے عرب حکمران، بلوچوں کی خودمختاری کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور صدیوں سے عربوں اور بلوچوں کے درمیان تعلقات باہمی نیک خواہشات، تعاون اور عدم مداخلت پر قائم تھے۔

دسویں صدی میں ایرانی النسل بوواحدی برادران، علی بن بوواحدی اور ابوالسان بن احمد بن بوواحدی، اصفہان اور فارس صوبوں کے حکمران بن گئے۔ انہوں نے جیرفٹ (Jiruft) اور کرمان (Kirman) کے بلوچ علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں بلوچ قبائل کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچوں اور ایرانیوں کے درمیان تنازع نصف صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ بوواحدی ایرانی خاندانی سلطنت کے خلاف بلوچ مزاحمتی تحریک کا مستند احوال بوواحدی حکمرانوں معزالدولہ، رکن الدولہ اور عادل الدولہ کے دربار کے ایک اعلیٰ اہلکار نے تحریر کیا۔

بوواحدی ایرانی خاندانی سلطنت کی بلوچوں کے حوالے سے حکمت عملی بیان کرتے ہوئے ابن مشکواہی نے بلوچوں کے خلاف عدل الدولہ کے سلوک اور رویے پر تنقید کی۔ مشکواہی، بلوچوں کے

Scanned by CamScanner

خلاف عدل الدولہ کی فوجی مہم کے بارے میں لکھتا ہے، ''جب اس نے ملک کو ان سے پاک کرنے کے لیے کرمان کے اندر تک چڑھائی کی تو اسے مطلع کیا گیا کہ ان میں کچھ بلوچ ایک پہاڑ (جبل القفص) کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں اور ان تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک درہ ہے جس کے ذریعے صرف ایک چھوٹا سا گروہ، ایک بڑی فوج کی مزاحمت کر سکتا ہے۔ جب وہ طاقت کے بل پر ان تک نہ پہنچ سکا تو پھر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے انہیں اس قسم کا پیغام بھیجا کہ وہ انہیں اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک وہ ان سے خراج وصول نہیں کر لیتا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اسے دینے کے لیے ان کے پاس کوئی رقم نہیں۔ اس نے کہا کہ تم شکاری ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ہر خیمے کے لیے ایک کتا موجود ہو۔ انہوں نے اس پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا، اس لیے اس نے اپنا ایک اہلکار ان کے پاس بھیجا تا کہ وہ خیمے شمار کرے اور ان کے مطابق ان کے لیے کتے بلے جائے۔ قدرتی طور پر کتے کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ جاتا ہے، اس کی طرف دیکھ کر اپنی دم ہلاتا ہے، اس کے ساتھ اپنا جسم رگڑتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے اور پھر اپنی عادت کے مطابق خواہ وہ میلوں ہی دور گیا ہو، واپس اپنے آقا کے پاس آ جاتا ہے۔ عدل الدولہ نے حکم دیا کہ ان کی گردنوں میں آتش گیر روغن باندھ دیا جائے تا کہ جب کتے درّے میں جمع ہو جائیں تو اس آتش گیر روغن کو آگ لگا دی جائے۔ تمام کتے ایک ساتھ آگے آگے چلتے گئے اور فوج بھی ان کے پیچھے پیچھے پہنچ گئی۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ یہ کتے ان (بلوچوں) کی طرف دوڑتے ہوئے آئے لیکن بلوچ تو اس دھوکے میں تھے کہ فوج ابھی کافی فاصلے پر ہے۔ اب ہر کتا آگ سے بچنے کے لیے اپنے آقا کے ساتھ اپنا بدن رگڑنے لگا تو یہ آگ اس شخص تک بھی پہنچ گئی۔ لوگوں نے اب درّہ خالی کرنا شروع کر دیا لیکن انہیں آگ نے بھی نہیں چھوڑا اور ان میں سے کئی ایک آگ سے جل کر مر گئے۔ جو بچ گئے تھے، انہیں آنے والی فوج نے تلواروں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[17]

ایرانی دربار کے ایک درباری ابن مشکوا ہی نے ایرانی حکمرانوں کے اس غیر انسانی اور بزدلانہ اقدام کی مذمت کی۔ ''اگر یہ کہانیاں سچی ہیں تو پھر جن لوگوں نے یہ کام کیا، کوئی بھی نیک اور پرہیزگار شخص اور ایک طاقت ور شہزادہ ان کے اس کام کو ناپسندیدہ قرار دیتا۔ مذہبی پیشوا اسے ایک خوفناک جرم کی حیثیت سے دیکھیں گے اور شہزادہ اس کارروائی کو روکنے میں اپنی نا قابلیت کا اعتراف ہی کرے گا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں بے گناہوں کو سزا دی گئی تھی۔''[18]

Scanned by CamScanner

گیارہویں صدی میں وسطی ایشیا کے ایک مشہور حکمران، محمود غزنوی نے بلوچوں کو اپنے زیر تسلط لانے کی کوشش کی۔ اپنی ناکام کوششوں کے بعد اس نے عدل الدولہ کے طریقے پر عمل کیا۔ اس نے بلوچستان/سیستان کے راستے مکہ لے جانے کے لیے زہریلی مٹھائیاں اونٹوں پر لاد کر ایک قافلے کی صورت روانہ کیں، اسے علم تھا کہ بلوچ اس قافلے کو روک کر اس پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ بلوچوں نے ایسا ہی کیا اور بہت سے لوگ یہ زہریلی مٹھائیاں کھانے سے ہلاک ہو گئے۔[19]

بارہویں اور تیرہویں صدی میں مغلوں کے حملے کے باعث بلوچ برصغیر ہند کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ محمد تغلق (1326-27) کے دورِ حکومت کے دوران بلوچوں کی موجودگی کے متعلق معصومی تمام حالات کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔[20] بہت سے بلوچ قبیلے کرمان سے سیستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ بارہویں صدی میں ایران کے حکمرانوں کی ظالمانہ پالیسی کے باعث 44 قبیلے سیستان سے مکران کی طرف ہجرت کر گئے۔

ایران میں بلوچوں کی تاریخ، غیر ملکی غلبے اور حاکمیت کے خلاف مزاحمت کا احوال ہے۔ انہوں نے ایرانی تسلط کے خلاف عربوں کے ساتھ اتحاد کیا۔ عرب ان کی خود مختاری کا احترام کرتے تھے اور انہوں نے بلوچوں سے کبھی خراج کا مطالبہ نہیں کیا۔ ایرانی دورِ حکومت کے دوران، بلوچ اپنی ریاست کے قیام کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہے۔ ان میں بہت سے کوششیں پھل دی گئیں لیکن بارہویں صدی کے اواخر میں بلوچوں نے مکران پر قبضہ کر لیا اور میر جلال حان (حان، ترکی میں خان کا مترادف ہے) کی قیادت میں پہلا بلوچ وفاق قائم کر لیا۔

پہلے بلوچ وفاق کی تشکیل

پہلے بلوچ وفاق کی تاریخ واضح نہیں کیوں کہ اس ضمن میں مناسب اور کافی تاریخی مواد موجود نہیں، اس لیے ہمیں بلوچ روایات اور بلوچ قوم پرست مصنفین کی تحریروں پر ہی انحصار کرنا ہوگا۔

بارہویں صدی میں میر جلال حان کی قیادت میں 44 قبیلوں کو سیستان سے مکران ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مکران میں بلوچوں نے ایک مقامی مسلمان حکمران ہارین یا ہارون کے خلاف جنگ کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکران کے اصلی قبیلے زیادہ تر جاٹ (Jat) (عرب مؤرخین انہیں زٹ (Zatt) کہتے ہیں) ہیں، اس کے علاوہ کچھ عرب آبادکار بھی ہیں۔ ان میں سے کچھ قبائل کو برطانوی حملہ آوروں نے تباہ کر دیا یا انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ بلوچ رزمیہ شاعری میں میر جلال حان کو تمام

Scanned by CamScanner

بلوچوں کا حکمران ظاہر کیا گیا ہے۔ اس نے چار بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی جن کے نام رند، لاشار، کورائی، ہوت اور جاتو بی بی تھے۔ ان چاروں کو بلوچوں کے پانچ عظیم قبیلوں کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ بعض رزمیہ نظموں میں مزید دو قبیلے، بلو اور علی بھی شامل کیے گئے ہیں۔ بلو کی نسل سے بلیدی تھے اور علی کے بیٹے عمر اور غزن، عمرانی اور غزنی قبیلوں کے بانی تھے۔[21]

یہ بھی ممکن ہے کہ نئے مفتوح ملک، مکران میں بلوچ پانچ بڑے قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ انہوں نے جلال خان کی سربراہی میں پہلا بلوچ وفاق قائم کر لیا جس کا حکمران (امیر) جلال خان تھا۔ (بلوچ رزمیہ نظموں میں تفصیلی طور پر جو کچھ بھی درست بتایا گیا ہو، اس امر کا واضح ثبوت میسر ہے کہ بہت سے بلوچ کرمان اور سیستان ہی میں رہے)۔ قلات کا آخری خان، میر احمد یار خان کہتا ہے کہ بلوچوں کے تین بڑے قبیلے تھے۔ ایک قبیلہ سیستان، ایک بڑا قبیلہ مکران اور بروہی نامی تیسرا قبیلہ میرو کی قیادت میں قلات میں آباد ہو گیا جس نے خانیت کی بنیاد رکھی۔[22]

مصنفین نے بلوچ قوم کے بانی میر جلال خان کو عظیم ترین خراجِ تحسین پیش کیا ہے جس نے بلوچستان کے موجودہ علاقے میں پہلے بلوچ وفاق کی بنیاد رکھی۔[23]

بلوچ رزمیہ نظموں اور روایتوں سے میر جلال خان اور اس کی انتظامیہ کی حکومت کے مستقبل کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔[24] میر جلال خان کی وفات کے بعد بلوچوں کی قبائلی تقسیم میر جلال خان کے بیٹوں کی رسوم تجہیز و تکفین کے نتیجے میں ایک روایت کے مطابق ہوئی۔ میر رند کو پگ (شاہی پگڑی) کا جانشین چنا گیا لیکن اس کے چھوٹے بھائی میر ہوت نے اس کی مخالفت کی جس نے دارالحکومت کیچ (مکران) کا انتظام سنبھال لیا اور ''اشروک'' (ashrok)، (تخت شاہی کے چھتر کی یادگار) کی رسم ادا کی جب کہ میر رند نے وفاق کے سربراہ کی حیثیت سے یہ رسم شہر سے باہر ادا کی۔ میر رند کے ایک اور بھائی میر ہوت نے بھی وفاق کے ارکان میں سے میر رند کی طرف سے منعقدہ ''اشروک'' میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔[25] اس ضمن میں ڈیمز (Dames) کا موقف یہ ہے کہ اس دَور میں پانچ اہم قبیلوں کی تقسیم مشہور رہنماؤں کے تحت ہوئی اور یوں یہ پانچ قبیلے، اپنے بانیوں کی عرفیت، رند، ہوت، لاشار، کورائی اور جتوئی کے طور پر مشہور ہو گئے۔

مکرانی اور قلاتی وفاقوں کے درمیان تعلقات

پندرہویں صدی کے وسط میں مکران اور قلات کی دو ریاستوں کے درمیان تعلقات خراب

ہو گئے جس کا نتیجہ قلات اور مکران کے درمیان جنگ کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس تنازع کے باعث بعد کی بلوچ تاریخ پر مکران کے رند قبیلے اور قلات کے بروہی قبیلے کے درمیان اندرونی چپقلش حاوی ہے۔

قلات کا مرحوم خان، میر احمد یار خان لکھتا ہے کہ قلات اور مکران کے بلوچ حکمرانوں کے درمیان اگر اتحاد اور دوستی ہوتی تو پھر ان کی متحدہ قوت کے باعث جنوبی ایشیا کے کسی علاقے میں بلوچ سلطنت قائم ہوگئی ہوتی۔ دونوں ریاستوں کے درمیان چپقلش کی نوعیت ذاتی کی بجائے معاشی تھی۔ چونکہ مکران کا وفاق پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو گیا تھا اور اس نے اپنی سرحدوں کو وسیع کرنا شروع کر دیا تھا، اس نے کچھی اور سبی کی زرخیز زمینوں پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش مکران اور قلات کے درمیان جنگ پر منتج ہوئی۔ قلاتیوں کو شکست ہوئی اور ان کا سربراہ میر عمر مارا گیا، میر چاکر نے خاران، قلات اور لسبیلہ کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ قلات کے قبیلوں پر اس کی فوجی فتح کے باعث 1487ء کے لگ بھگ ایک متحد بلوچ ریاست قائم ہوگئی جس کا دارالحکومت سوی (سبی) تھا۔[26]

اکثر بلوچ مصنفین چاکر خان کے دورِ حکومت کو بلوچوں کا سنہرا دور اور اسے عظیم بلوچ سمجھتے ہیں۔ جسٹس مری کا کہنا ہے کہ میر چاکر خان کی فوج 40,000 افراد پر مشتمل تھی جب کہ بابر نے ہندوستان کو محض 12,000 فوجیوں کے ساتھ فتح کیا تھا۔ وہ بلوچوں کی فوجی طاقت کی بھی تعریف کرتے ہیں: ''بلوچ نہایت ہی منظم اور نظم وضبط کے پابند لوگ تھے جن کا تعلق واحد سردار کی سربراہی میں ایک مشترک نسل سے تھا۔'' ان کا اندازہ تھا کہ اضافی طور پر میر چاکر خان کے پاس فوج میں مزید دو لاکھ سے تین لاکھ وفادار فوجی موجود ہونے چاہئیں تھے۔ بلوچ مصنف سردار خان بلوچ نے لکھا کہ چاکر کی فوجی صلاحیتیں بابر سے کہیں کم نہ تھیں اور اس کی فوج بابر کی فوج میں شامل ازبکوں سے کم تربیت یافتہ نہ تھی۔ چاکر خان کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس سیاسی سمجھ بوجھ سے عاری تھا جو اس کے قبائلی وفاق کو کہیں زیادہ متحد سیاسی وفاق میں بدلنے کے لیے درکار تھی۔ ''کمزور وفاق کے باعث کوئی مستقل اور مستحکم مملکتیں قائم نہ ہو سکیں۔ اگرچہ ہندوستان پر بلوچ حملے کے باعث وادیٔ سندھ کی آبادی پر کافی اثرات مرتب ہوئے لیکن تاریخی طور پر اس حملے کو تقریباً نظرانداز کر دیا گیا جب کہ گینگش خان، تیمور اور ناصر خان کے حملوں کے باعث آبادی پر چنداں اثرات مرتب نہ ہوئے لیکن پھر بھی ان حملوں کو تاریخ میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔[27]

خانہ جنگی اور ہندوستان کو ہجرت

ایک متحد بلوچ ریاست کے قیام کے تھوڑی ہی دیر بعد رند اور لاشار جیسے طاقتور قبائل کے

Scanned by CamScanner

درمیان کچھی اور سبی کی زرخیز زمینوں کی تقسیم کے معاملے پر خانہ جنگی شروع ہوگئی جو بیس برس (کچھ روایتوں کے مطابق یہ مدت تیس برس تھی) جاری رہی جس کے باعث بالآخر میر چاکر اور میر گوہرام کو 1500ء میں بلوچستان سے نکل کر ہندوستان میں پناہ لینی پڑی۔ پنجاب میں میر چاکر کی پیش قدمی کو رزمیہ نظموں میں نہایت فخر سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ وہ پنجاب میں بلوچ حکومت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے ملتان کے لنگاہ سلطانوں کی فوجی ملازمت میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن ملتان کے بلوچ وزیراعظم ملک سہراب دودائی کی مخالفت کے باعث ناکام رہا جو میر چاکر کی فوجی قوت سے خوف زدہ تھا۔ بعدازاں اس نے مغل حکمرانوں بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں کے ساتھ رابطہ کیا جنہوں نے اسے اور اس کے بیٹوں کو خوشاب، ساہیوال اور ملتان میں جاگیریں عطا کر دیں۔ سولہویں صدی کے وسط میں، جب ہمایوں دہلی کی حکومت واپس لینے کے لیے ایران سے لوٹا تو میر چاکر کا بڑا بیٹا، میر شہداد خان، سوری افغانوں کے خلاف مغل فوج میں شامل ہوگیا۔ فتح کے بعد ہمایوں نے میر چاکر خان کے رشتہ داروں کو دہلی کے قریب دو جاگیریں عطا کیں جنہیں فرخ نگر اور بہادر گڑھ کہا جاتا تھا۔ دیگر کئی سرداروں کو متحدہ صوبوں میں زمین دی گئیں۔ میر چاکر خان کی اولاد نے پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہونے تک حکومت کی۔ بہادر گڑھ اور فرخ نگر کے بلوچ حکمرانوں نے 1857ء تک حکومت کے مزے لوٹے جب مغلوں کی حمایتی ہونے کی بنا پر ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔[28]

میر چاکر خان، ایک ناکام حکمران کی حیثیت سے ست گڑھا (پنجاب) میں جلاوطنی میں انتقال کر گیا کیونکہ وہ اپنی مدبرانہ صلاحیتوں کے فقدان کے باعث بلوچوں کو کسی بحران سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ سولہویں صدی میں پہلے بلوچ وفاق کے زوال کے بعد بلوچستان مندرجہ ذیل تین ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔

(i) ریاستِ مکران

(ii) ڈیرہ جات کا دودائی وفاق

(iii) وفاقِ قلات یا بلوچ خانیت

(i) ریاستِ مکران

میر جلال خان کی وفات کے بعد اس کے سب سے چھوٹے بیٹے میر حقت نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ہوت کی حکومت سولہویں صدی کے وسط تک قائم رہی۔ اس کے بعد ملک خاندانی حکمرانی کا

Scanned by CamScanner

سلسلہ قائم ہوگیا لیکن ملک خاندانی حکمرانوں کی نسلی وقومی شناخت کے متعلق قطعی علم نہ ہوسکا۔ بہرحال مارکوپولو (Marco Polo) نے مکران میں ایک آزاد و خودمختار ملک خاندانی سلطنت کا ذکر کیا: ''کیسمکوران(Kesmacoran)، (کیچ مکران) ایک ایسی سلطنت ہے جس کا اپنا بادشاہ اور اپنی انفرادی زبان ہے۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بلوچ وفاق کے قیام کے ساتھ ہی ملک حکمرانوں نے بلوچوں کی برتری قبول کرلی تھی جو سولہویں صدی کے وسط تک جاری رہی۔ مکران کے ملک خاندانی سلطنت کے ممتاز حکمرانوں میں ملک سعید، ملک تاج الدین، ملک بدر، ملک زاہد، ملک دینار، ملک جلال الدین، ملک مظفر اور ملک کچکو شامل تھے۔ ریاستِ مکران کی سرحدیں مشرقی ایران میں مناب کے قریب ملک شدق (Malik Chedaq) تک پھیلی ہوئی تھیں۔ روس(Ross) نے لکھا کہ ملک خاندانی حکمرانوں کے دَور میں مکران کو بہت عروج حاصل ہوا، اس کی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور اس کی تہذیب نے بہت زیادہ ترقی کی۔ سترہویں صدی میں ملک حکمرانوں کی بجائے بلیدی قبیلہ مکران میں برسراقتدار آ گیا۔ بلیدی قبیلے کی حکومت کی تاریخ معلوم نہیں لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ بلیدی قبیلے نے مطلق العنان شہنشاہیت کے تحت حکومت کرنے کی بجائے جمہوری قبائلی روایات کے مطابق حکومت کی۔ بلیدی حکمرانوں نے ملک کو مکران کے بلوچ قبائل میں تقسیم کردیا اور ان کے سربراہ کو ملک (ملک، عربی میں بادشاہ کو کہتے ہیں) کے خطاب کے ساتھ وفاق کا سربراہ مقرر کردیا۔[29]

کیپٹن ای جی روس(Capt.E.G.Ross) نے 1868ء میں شائع کردہ "Memorandum on Makran" میں وادیٔ کیچ کے بلیدی حکمرانوں اور خاص طور پر شاہ بلار، جس نے 1729ء میں مکران پر حکومت کی، کے مزاروں پر کندہ تحریروں کا ذکر کیا ہے۔ آخری حکمران شاہ قاسم (شاہ بلار کا بھتیجا) تھا جسے گچکی قبیلے کے سربراہ ملک دینار نے قتل کردیا تھا۔ اس کے بعد ذکری مسلک (تفصیل کے لیے تیسرا باب ملاحظہ فرمایئے) کے پیروکار، گچکی قبیلے نے مکران پر قبضہ کرلیا۔ گچکی قبیلے کے دورِ حکومت میں مکران پر ایران کا نادرشاہ حملہ آور ہوا جس نے مکران فتح کرنے کے لیے جنرل تکی خان کو بھیجا۔ بھاری نقصانات اور شدید مزاحمت کے باوجود، ایران کی برتر فوج، مکران پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی لیکن ایرانی زیادہ دیر تک مکران پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے۔ 1747ء میں نادرشاہ کی وفات کے بعد، خان میر مہابت نے مکران کو وفاقِ قلات میں شامل کرنے کے مقصد کی خاطر اس (مکران) پر حملہ کردیا۔[30]

Scanned by CamScanner

(ii) ڈیرہ جات (Derajat) کا بلوچ وفاق

پندرہویں صدی میں مکران میں زیادہ چراہ گاہیں نہیں تھیں، نیز آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ قبائلیوں کی اندرونی لڑائیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ نتیجے کے طور پر شکست خوردہ قبائل کے سامنے صرف دو راستے تھے کہ وہ فاتح قبیلے کے سامنے سرنگوں کر لیں یا پھر نئی زمینوں کی تلاش میں کسی دوسری جگہ ہجرت کر جائیں۔ باہمی جھگڑوں کے باعث ان کی قبائلی تنظیم زوال کا شکار تھی جس کے باعث ان کے درمیان آہستہ آہستہ مگر مستقل رفتار سے مثبت اور تعمیری قوتیں تشکیل پا رہی تھیں۔[31]

پندرہویں صدی کے وسط میں دودائی (میرانی)، کولاچی (یا کولانچی)، گورچانی، یعنی بوت) اور جسکانی (لشاری قبیلے کی ایک شاخ) جیسے بہت سے بلوچ قبیلے ڈیرہ جاٹ ہجرت کر گئے اور ڈیرہ جاٹ کی بلوچ ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس عرصے کے دوران، بلوچ قومی جاگیرداری نظام کی تشکیل کا آغاز ہوا کیوں کہ بلوچ قبائل مفتوح زمینوں پر آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان آبادیوں کے باعث قبائلی تعلقات میں کمی واقع ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ رشتہ داری کی بنا پر قائم اتحاد کی بجائے علاقائی اتحاد وجود میں آنے لگے۔ گینگو وسکی کے الفاظ میں، جب بلوچوں نے بہترین چراگاہوں اور زرخیز زمینوں پر قبضہ کیا اور مقامی وغریب آبادی کے علاوہ آزاد منش خانہ بدوشوں کو بھی کھیتی باڑی پر لگا دیا تو بلوچ قبائل کی مطلق العنان فطرت آہستہ آہستہ جاگیردارانہ فطرت میں تبدیل ہونے لگی۔ قبیلے کے سربراہ یا اس کی شاخوں کی قوت کو سلب کر لیا گیا جس کے باعث تمام تر طاقت وقوت سربراہ کے خاندان میں مرتکز ہو گئی۔ ہمسایہ ریاست ملتان اور مغل ہند کی طاقت ور اور مضبوط فوجی قوت اور جدید جاگیردارانہ فطرت نے بلوچوں کو جاگیردارانہ ریاست کو وسیع کرنے اور اسے استحکام بخشنے میں مدد فراہم کی۔

اورنگزیب کا ایک ہم عصر سوجن رائے، بلوچ مملکت کے سماجی حالات اور فوجی قوت کے متعلق بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دودائی حکومت کے تحت مملکت خوش حال اور دولت مند تھی۔ ملک میں غربت اور چوری چکاری کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس کے پاس اسّی ہزار فوجیوں اور پچاس ہزار گھڑسواروں پر مشتمل ایک مضبوط فوج موجود تھی۔[32]

مضبوط فوجی طاقت اور مستحکم معاشی حالت نے دودائی حکمرانوں کی اس خواہش کو تقویت بخشی کہ بلوچوں کا ایک خودمختار ملک قائم کیا جائے۔ شہنشاہ اکبر اور اورنگزیب کے دورِ حکومت میں انہوں نے اپنی مکمل خودمختاری کا اعلان کر دیا اور مغل تسلط قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن انہیں مغل فوج نے

شکست دی اور بالآخر وہ مغل حکومت کے تابع ہوگئے۔ مغلوں نے ان کی اطاعت کو قبول کیا اور انہیں لباسِ فاخرہ اور گھوڑے انعام میں دیئے۔[33]

اورنگزیب کی وفات کے بعد جب سلطنت مائل بہ زوال تھی تو دودائی حکومت نے دہلی کے تسلط سے آزاد ہو کر خودمختاری حاصل کر لی۔ بہرحال ان کی خودمختار حیثیت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی۔ 1717ء سے 1795ء تک اس کے حکمران بلوچ خانیت کے ماتحت رہے جس کی سربراہی میر عبداللہ خان کے ہاتھ میں تھی۔ دودائی اپنی آزادی اور خودمختاری قائم رکھنے میں کیوں ناکام ہوئے؟ اس سوال کا جواب دودائی وفاق کے آئین میں موجود ہے۔[34]

دودائی وفاق، ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ فتح خان اور بھکر لیہ، نامی تین نیابتوں (صوبوں) میں تقسیم ہوگیا۔ ہر ''نیابت''، ایک خاندانی سربراہ کے ہاتھ میں تھی جسے ''نواب'' کہا جاتا تھا۔ یہ سربراہ اپنی اپنی ''نیابتوں'' کے آزاد حکمران تھے۔ ایک روایت کے مطابق، وفاق کی قیادت خاندانی نہ تھی اور وفاق کے سربراہ کو چاروں نیابتوں (صوبوں) کے نواب منتخب کرتے تھے۔ وفاق کے سربراہ کی مدت کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نیابتوں کے سربراہوں کے درمیان علاقائی جھگڑوں نے جنم لیا جس کے باعث اندرونی تنازعات پیدا ہوگئے۔ 1795ء میں جب افغانستان کے حکمران زمان شاہ نے ملک پر حملہ کیا تو بلوچ سردار، افغانیوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے میں ناکام ہوگئے حالاں کہ ان کے پاس مضبوط باقاعدہ فوج موجود تھی۔ مزید برآں، خانیت نے بھی ان کی مدد نہیں کی، اس طرح یہ وفاق 1795ء میں افغانیوں کے زیر تسلط آ گیا۔[35]

بالائی ڈیرہ جات کے بلوچ سردار، نواب نصرت خان نے 1797ء میں افغان حکومت کے خلاف بغاوت کر دی لیکن افغان فوج نے یہ بغاوت کچل دی۔ نصرت خان، خانِ قلات، میر محمود اوّل سے فوجی مدد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

ڈیرہ جات کے بلوچ وفاق کے زوال کے بعد ملک افغان حکمرانوں (1797-1818)ء کے براہ راست انتظام کے تحت آ گیا اور بعدازاں سکھوں نے بھی اس ملک پر قبضہ کرنے کی متعدد کوششیں کیں۔ افغان حکمرانوں کے دورِ حکومت میں بلوچوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا اور انہیں شدید مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک افغان مؤرخ، منشی عبدالکریم کے مطابق شاہ زمان نے ہوتکی قبیلے سے تعلق رکھنے والے اپنے سسر کو ڈیرہ جات کا گورنر مقرر کیا۔ یہ افغان گورنر ظالم ثابت ہوا جس نے عوام پر

Scanned by CamScanner

بھاری ٹیکس لگادیئے۔[36] قبائل نے کئی مرتبہ افغان حکمرانوں کے خلاف جنگیں لڑیں لیکن اندرونی جھگڑوں کے باعث ناکام رہے جس کے باعث وہ ظالم افغانی گورنروں کے خلاف اتحاد قائم نہ کر سکے۔ Chiefs and Families of Note in Punjab کے مصنفین لکھتے ہیں کہ افغان حکمرانوں کے دور میں نہریں خشک ہوگئیں اور گاؤں ویران ہوگئے اور آج بھی کچھ علاقوں میں اس تباہی اور ویرانی کے آثار ملتے ہیں۔[37]

1818ء میں ڈیرہ اسماعیل کے افغان گورنر نواب شیر محمد نے سکھ حکومت کو خراج دینا قبول کرلیا۔ 1819ء میں ڈیرہ غازی خان پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کرلیا۔ بلوچ قبیلوں نے سکھ حکومت کے خلاف مزاحمت کی۔ مزید برآں، بلوچ قبیلے نوتکانی، کولاچی، قیصرانی، کھوسہ، بزدار (نوتکانی رند قبیلے کے سردار اسد خان کی قیادت میں)، مزاری، گورچانی، لند، کھیتران، خانِ قلات میر مہراب خان کے علاوہ مجاہدین کی مدد و معاونت سے سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔[38] اس بغاوت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سکھ ڈیرہ جات پر حکومت نہ کر سکے اور ان کی حکومت محض شہروں اور قلعوں تک محدود ہوگئی۔ ڈیرہ جات میں سکھ حکومت کا دور ایسا تھا جب بلوچوں نے مسلسل بغاوتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ واحد قبیلہ لغاری تھا جس نے سکھوں کی اس لیے حمایت کی کیوں کہ کھوسہ قبیلے کے ساتھ ان کی دشمنی تھی۔ سکھوں کے خلاف بلوچوں کی بغاوت اور مزاحمت کے باعث درحقیقت برطانویوں کو فائدہ پہنچا۔ جب مول راج نے بغاوت کی تو بلوچ قبیلے، ملتان کے محاصرے کے دوران میجر ایڈورڈ کی قیادت میں برطانوی فوج کے ساتھ آن ملے۔[39]

(iii) بلوچ خانیت

بلوچ تاریخ کا اہم اور نمایاں ترین باب، بلوچ خانیت کی تشکیل ہے۔ پہلے بلوچ وفاق بے سروسامانی پر مبنی اپنی خصوصیت کے باعث قائم نہ رہ سکا۔ ڈیرہ جاٹ کی بلوچ ریاست جاگیردارانہ نوعیت کی تھی لیکن ہندوستان میں مغل حکومت پر انحصار کے باعث اس کی سرحدیں پھیل نہ سکیں۔ مکران نے اپنی خودمختار حیثیت برقرار تو رکھی لیکن ایرانی حملوں اور ہمسایہ بلوچ ریاست، قلات کے ساتھ اندرونی اختلافات کے باعث اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے میں ناکام رہا۔

اس لیے خانیت وہ پہلی بلوچ ریاست تھی جس میں تمام بلوچ علاقے، مثلاً مکران، مغربی بلوچستان، ڈیرہ جاٹ، سیستان اور لسبیلہ شامل تھے اور ان علاقوں نے خود کو ایک مرکزی حکومت کے تحت

Scanned by CamScanner

مضبوط حیثیت دے لی تھی۔ بلوچ خانیت نے نہ صرف بلوچوں کو اتحاد اور حب الوطنی کا تصور بخشا بلکہ انہیں ایک غیر تحریری آئین (رواج یا دستور) بھی دیا جو ان کے لیے ایک ''مقدس'' دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس باب میں، ہم خانیت اور اس کے سیاسی نظام کی تشکیل اور پرداخت پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے جو بلوچ قوم پرستوں کے لیے وجہ افتخار ہے۔

بلوچ خانیت کے قیام کی ابتدائی تاریخ کچھ زیادہ واضح نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس کی بنیاد چودھویں یا پندرھویں صدی کے اوائل میں رکھی گئی۔ جن اہم عناصر کے باعث خانیت کا قیام ممکن ہوا، اس میں سے ایک اہم عنصر ماحولیات تھا۔ مثال کے طور پر ایک ماہر بشریات، نینا سوئنڈلر (Nina Swindler) کا موقف ہے کہ خانیت کے قیام کے ضمن میں ماحولیات کے عنصر نے اہم کردار ادا کیا۔ کچھی کی آبادی کی اکثریت کو قلات کے میدانی علاقے درکار تھے لیکن اس کے بلند و بالا مقامات سال کے دوران کسی بھی وقت مزید لوگوں کا سہارا نہیں بن سکتے تھے۔ اگرچہ قبائل کی اکثریت کو موسم سرما میں اپنے جانوروں کو خوراک مہیا کرنے کے لیے زیریں علاقوں میں جانا پڑتا تھا لیکن قبائلی آبادی میدانی علاقوں میں مستقل قیام نہ کر سکتی تھی کیوں کہ موسم گرما کی شدت ان کے جانوروں پر مضر اثرات مرتب کر سکتی تھی۔ ماحولیاتی عنصر نے بلوچ قبائل کے اتحاد میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ موسم سرما میں جانوروں کو خوراک مہیا کرنے کی خاطر زیریں (میدانی) علاقوں کے انتخاب کی ضرورت کے باعث پندرھویں صدی میں مکران اور قلات وفاقوں کے درمیان بہت سی جنگیں ہوئیں۔ ماحولیاتی ذرائع پر مسابقانہ دباؤ کے باعث بہت سے بلوچ قبائل کچھی کے میدانی علاقوں میں آباد ہو گئے اور قلات کے وفاق میں شامل ہو گئے۔

وفاقِ قلات کا بانی میر وقمبرانی تھا جس نے جاتا (Jata) کو جھالاوان سے نکال دیا تھا۔ اس کے بیٹے، میر عنر کا قندھار کے ارغیونوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ قندھار کے ارغیونوں اور قلات کے درمیان تعلقات کے متعلق کچھ علم نہیں۔ گل خان کے مطابق، قلات کی فوج نے قندھار کی افواج کو شکست دی اور اپنی آزادی برقرار رکھی۔ پندرھویں صدی کے وسط میں جب وفاقِ مکران کے سربراہ معاشی اور ماحولیاتی وجوہ کی بنا پر پانی اور چراگاہوں کی تلاش کی خاطر اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے میر چاکر خان کی قیادت میں قلات پر حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں قلات کا حکمران، میر عمر خان مارا گیا اور اس کی بیوی مستونگ میں دہوار (تاجک) قبیلے میں اپنے ننھے بچے میر بجار کے ساتھ ''باہوٹ'' بن گئی۔ کچھ وقت بعد جب میر چاکر کو ہندوستان کی طرف ہجرت پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے اپنے سسر

Scanned by CamScanner

مندوخان کو قلات کا ''نائب'' (گورنر) مقرر کر دیا مگر جلد ہی مندوخان، قلات کے قبیلوں جن کی قیادت میر بجار کے ہاتھ میں تھی، کے ہاتھوں مارا گیا۔ میر بجار نے وہ تمام ساز و سامان برآمد کر لیا جو قلات سے لوٹا گیا تھا اور میر چاکر خان کے سابق وفاداروں کو زیر نگیں کر لیا۔ بروہی رواج کے مطابق، جیسے ہی وہ بڑا ہوا، وہ مکہ حج کے لیے چلا گیا اور اس نے واپسی پر بلوچ مجلس (منتخب سرداروں کی قبائلی پارلیمنٹ) کی حمایت میں استعفیٰ دے دیا جسے متعلقہ قبائلی علاقوں کے لحاظ سے خودمختاری دی گئی تھی۔[40]

اس وقت مغل سلطنت، بلوچستان کی مشرقی سرحد تک پھیل چکی تھی اور دودائی سرداروں نے باج گزار ریاست کی حیثیت قبول کر لی تھی۔ قلات بھی بلاواسطہ طور پر مغل ہند کے زیر نگیں آ گیا مگر دور دراز علاقوں پر اس کی عملداری محض نام کو تھی۔ شاہ جہاں کے دورِ حکومت، 1650ء میں مغلوں کو قندھار میں بلوچ قبائل نے شکست دی جن کی قیادت میر ابراہیم قمبرانی کے ہاتھ میں تھی اور یوں قندھار مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ نیز گوہرام نے مغلوں کا تسلط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ قبائلی اسمبلی نے میر حسن بروہی کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔[41] دہلی سے طویل فاصلے اور مواصلاتی نظام کی مشکلات کے علاوہ ایران کے صفویوں کے زوال کے باعث، قلات کو اپنی آزادی اور خودمختاری برقرار رکھنے کا موقع مل گیا۔

1666ء میں میر حسن کا انتقال ہوا اور قبائلی اسمبلی نے میر احمد کو اپنا خان منتخب کر لیا۔ خانیت کی آزادی کے دَور کا آغاز میر احمد کے انتخاب کے ساتھ ہی ہوا اور اس نے اس وفاق کی سرحدیں وسیع کیں۔ بلوچ خانیت کی تاریخ نے ایک واضح اور صاف شکل اختیار کر لی۔ نیز اس کا عرصۂ حکومت متعین کیا جا سکتا تھا۔[42] میر احمد وہ پہلا شخص تھا جس نے ایک آزاد اور خودمختار حکمران کی مانند قلات پر حکومت کی۔ اپنے تمام دورِ حکومت میں وہ بلوچ حکومت کو وسعت دینے کی خاطر بیروزئیوں (افغانوں)، سندھ کے کلہوڑوں اور مغلوں سے لڑتا رہا۔ وہ بہت بہادر تھا اور اس نے اپنی بہادری سے قبیلوں کو بہت متاثر کیا اور ان میں حکومت و اقتدار کی امنگ پیدا کر دی۔ اس نے اپنی موت سے پہلے انہیں جنگ کے فن میں طاق کر دیا اور ایک روشن مستقبل کی طرف ان کی رہنمائی کی۔[43]

احمد نے ہندوستان کے طاقت ور شہنشاہ اورنگزیب کے ساتھ ایک دوستانہ حکمت عملی اپنائی کیوں کہ وہ شیعہ ایران کے خلاف اس کا مضبوط حلیف تھا اور اسے بیروزئی افغانوں، سبی کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کے ساتھ نمٹنے کی آزادی حاصل تھی۔

اس نے ان کے علاقوں پر 18 حملے کیے اور ایک فوجی مہم میں اس کی بہن، مائی بیبو جو کیات

Scanned by CamScanner

(Kaiat) فوج کی کمانڈر تھی، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بہر حال، اسے افغانیوں پر فتح حاصل ہوئی اور اس نے کناہ، چاکو، کوئٹہ اور پشین پر قبضہ کرلیا۔ میر احمد خان اوّل کی وفات کے بعد میر مہراب خان اوّل کو خان منتخب کیا گیا۔ اس نے اپنے پیشروؤں کی پالیسی جاری رکھی۔ اس نے سندھ کے کلہوڑا سرداروں پر حملہ کیا جنہوں نے مغل حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس کی فوج نے سندھیوں کو شکست دی اور کلہوڑا سرداروں کو گرفتار کرلیا لیکن مہراب خان اوّل اپنی ہی فوج کی گولی سے ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد میر سمندر، خان مقرر ہوا اور اس کے دورِ حکومت میں سندھی سرداروں کو معافی دے دی گئی اور اس شرط پر انہیں رہا کردیا گیا کہ وہ سالانہ -/40,000 روپے خراج دیں گے۔ اورنگزیب نے اس کی دوستی کو سراہا اور ایک سمندری بندرگاہ، کراچی، میر مہراب خان اوّل کے خون بہا کے طور پر قلات کے حوالے کردی۔ اس کے دورِ حکومت میں ایرانی جنرل طہماسپ کی قیادت میں ایرانی فوج نے مغربی بلوچستان پر قبضہ کی خاطر بلوچستان پر حملہ کیا لیکن اس فوج کو شکست ہوئی اور طہماسپ مارا گیا۔ مغل شہنشاہ نہ صرف اس کے اس کارنامے سے خوش ہوا اور تعریف کی بلکہ ایرانی جارحیت کے خطرے سے نمٹنے کے لیے اسے دو لاکھ روپے سالانہ بھی دیئے۔[44]

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں، میر سمندر کی جگہ میر احمد دوم نے جگہ لی جسے اقتدار کی ہوس میں مبتلا اس کے چھوٹے بھائی میر عبداللہ خان نے قتل کردیا۔ اس دَور میں، جب کہ مغل اور صفوی سلطنتیں مائل بہ زوال تھیں، میر واعظ اور اس کی بیٹوں کی قیادت میں افغان، ایران میں افغانی حکومت کو مضبوط کرنے کی جدوجہد کررہے تھے۔ اس سیاسی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر عبداللہ خان نے بلوچستان پر مغلوں کی طرف سے کسی بھی قسم کی برتری قبول کرنے سے انکار کردیا۔[45]

میر عبداللہ، وہ پہلا خان تھا جس نے ایک پرچم کے نیچے بلوچستان کو متحد کیا۔ اس نے خانیت کی سرحدوں کو جنوب مغرب میں بندر عباس تک، مشرق میں ڈیرہ جات اور شمال مشرق میں قندھار کے نزدیک سے کیچ اور لسبیلہ تک وسیع کرلیا۔ اس کی فتوحات کے باعث، افغان حکمران اشرف شاہ گلزئی کے ساتھ اس کی فوجی چپقلش شروع ہوگئی جس نے سندھی سرداروں کے ساتھ اتحاد کیا ہوا تھا۔ بعدازاں، اس نے افغان علاقوں پر حملہ کیا اور افغان حکمران کو قتل کردیا۔ اس نے کچھی پر قبضہ کرنے کے لیے اس کی معاشی اور سٹریٹجک اہمیت کی خاطر سندھ پر بھی حملہ کیا۔ پھر اس نے کلہوڑوں کو شکست دی لیکن جنگ میں مارا گیا۔ اسے ایک آزاد اور خودمختار بلوچستان کے بانی کی حیثیت سے یاد رکھا جاتا ہے

Scanned by CamScanner

جس نے زیادہ تر بلوچ علاقوں کو متحد کر دیا۔[46] مزید برآں وہ پہلا حکمران تھا جس نے Land-tenure system کے تحت خود کو ایک مطلق العنان سردار کی حیثیت سے پیش کیا جسے بعد میں اس کے بیٹے، میر ناصر خان اعظم نے حتمی شکل دی۔

میر عبداللہ کی حکومت کے آخری ایام میں کچھی، بلوچستان کے ساتھ منسلک تھا جو پھر اس کے جانشین، مہابت خان کے ہاتھوں تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ خان کی ذاتی جائیداد کے طور پر مختص کر دیا گیا، دوسرے حصے کو شاہی زمینیں قرار دے دیا گیا جسے بعد میں فوجی خدمت کی شرط پر قبائلیوں کو بخش دیا گیا، اور زمین کا تیسرا حصہ مندرجہ ذیل قبیلوں میں بطور تحفہ تقسیم کر دیا گیا جنہوں نے سندھ پر حملے میں حصہ لیا تھا:

	قبیلے کا نام	علاقے
.1	رئیسانی	مٹھڑی
.2	روڈیدی	برج
.3	شاہوانی	ہرنائی
.4	میر حسنی	گوگرو
.5	لاہری	ہنہی
.6	مہد شاہی	زردار
.7	بنگلوئی	چندرا

خان کے انتقال کے بعد، اس کے بیٹا، خان منتخب ہو گیا لیکن سرداروں نے اسے "مند" سے ہٹا دیا جنہوں نے اس کے چھوٹے بھائی میر التزاز خان کو منتخب کر لیا۔ نو منتخب میر التزاز خان، خانیت پر حکومت کرنے میں ناکام رہا، اس لیے سرداروں نے دوبارہ مہابت خان کو منتخب کر لیا۔ 1736ء میں نادر شاہ افشار کی فوج نے بلوچستان پر حملہ کیا۔ جب بلوچ فوج کو دو مرتبہ شکست ہوئی تو خان نے مستونگ کے قلعہ میں خود کو گولی مار لی۔ سرداروں سے مشاورت کے بعد، خان نے ہتھیار پھینک دیئے اور نادر شاہ کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا۔[47] گل خان لکھتا ہے کہ یہ بلوچستان کی تاریخ کا پہلا موقع تھا کہ کسی بااختیار ایرانی کی عملداری قبول کر لی گئی جو 1747ء تک جاری رہی۔ میر مہابت خان کے دورِ حکومت میں، خانیت کی حکومت مکران تک پھیل گئی۔ 1747ء میں مہابت خان کے قتل کے بعد شاہ کے فوجی کمانڈر احمد شاہ نے

Scanned by CamScanner

افغان سلطنت کی بنیاد رکھی۔ میر مہابت خان نے افغان برتری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ اس کے سوتیلے بھائی میر ناصر خان، احمد شاہ کے دوست نے سنبھال لی۔[48]

میر ناصر خان، خانیت کے عظیم ترین اور طاقتور ترین حکمرانوں میں سے تھا۔ وہ پہلا خان تھا جس نے بلوچ خانیت کے فوجی اور انتظامی اداروں کی بنیاد رکھی۔ اس نے بلوچستان پر ایک منتخب سربراہ اور ایک جاگیردار بادشاہ، دونوں کی حیثیت سے حکومت کی۔ وہ 1757ء تک افغانستان کے حکمران احمد شاہ کی اطاعت کرتا رہا۔ 1758ء میں اس نے اعلانِ آزادی کر دیا جس کے باعث افغانستان اور بلوچستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

جو واقعات و حالات، افغانستان اور بلوچستان کے مابین جنگ کا باعث بنے، انہیں دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

ہتو رام اور دیگر بلوچ روایات کے مطابق، احمد شاہ نے مکران پر ناصر خان کی طرف سے فوجی مہم کی مخالفت کی تھی۔ اس مداخلت کے باعث خان پریشان ہو گیا جس نے پہلا موقع ملتے ہی شاہ کے احکامات کی بجا آوری سے انکار کر دیا۔ دریں اثنا، آخری خان، میر مہابت خان کے بیٹے میر حاجی خان نے بغاوت کر دی اور قندھار فرار ہو گیا۔ احمد شاہ نے اس سے وضاحت طلب کی اور خان نے بطور ماتحت اپنی حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ اس نے اپنی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے اور شاہ کو بلوچستان کی آزادی میں مداخلت نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے بغاوت کر دی۔ اس کے علاوہ، خان کے حوالے سے افغان سیاحوں اور سوداگروں کا رویہ توہین آمیز تھا۔ اخوند محمد صدیق کے مطابق، افغانیوں کی وجہ سے خان بہت پریشان ہوا۔ اگر کوئی افغانی قدرتی موت مر جاتا تو افغانی، خان کے پاس پہنچتے اور یہ الزام تراشی کرتے ہوئے اس کا دیت (خون بہا) طلب کرتے کہ اس کے قتل کے ذمہ دار بلوچ ہیں (اس حوالے سے وہ حکومت قندھار کو جھوٹی اور مبالغہ آمیز اطلاعات مہیا کرتے)، نیز خان سے وضاحت بھی طلب کرتے۔

گل خان کے مطابق، خان اپنی ماتحت حیثیت کو ہمیشہ اپنے اور بلوچ قوم کے لیے توہین آمیز سمجھتا تھا اور وہ عرصہ دراز ہی سے آزاد خانیت کا خواب دیکھ رہا تھا۔[49] مکران کو فتح کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خانیت کے اختیار کو وسیع کیا جائے اور خلیج فارس میں خانیت کے معاشی، تجارتی اور فوجی مفادات کا تحفظ کیا جائے۔

1758ء میں بلوچ فوج نے افغان فوج کو شکست سے دوچار کیا لیکن جلد ہی احمد شاہ نے

Scanned by CamScanner

بہت بڑی فوج اکٹھی کی اور خانیت کے دارالحکومت قلات پر حملہ کر دیا۔ افغان حکمران، خان کو زیر نگیں کرنے میں ناکام رہا۔ بالآخر دونوں فریقوں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جو معاہدہ قلات یا معاہدہ عدم مداخلت کہلاتا ہے۔[50]

معاہدۂ قلات (1758ء) یا معاہدہ عدم مداخلت

جنوب مغربی ایشیا کی تاریخ میں یہ امر نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے کہ افغانستان کی درّانی سلطنت کے حکمران نے بلوچستان کی خودمختاری کو تسلیم کرلیا۔ بدقسمتی سے افغان مؤرخین اور مغربی دانشوروں نے اس معاہدے کی اہمیت کو نظرانداز کیا۔ یہ معاہدہ بلوچستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات اور بلوچستان کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔ تاریخ میں اس کی اہمیت کے علاوہ بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے اس کی ممتاز حیثیت کے باعث ہم معاہدہ قلات (1758)ء کا خلاصہ فراہم کر رہے ہیں جس پر میر ناصر خان اعظم اور احمد شاہ درانی نے دستخط کیے:

1. خان بلوچستان میر ناصر خان، آئندہ افغان کے شاہ (بادشاہ) کو خراج ادا نہیں کرے گا۔
2. خان بلوچستان، احمد شاہ کو فوجی امداد فراہم نہیں کرے گا لیکن بیرونی دشمنوں کے خلاف جنگ کی صورت میں خان، مدد کی ایک علامت کے طور پر اس شرط پر ایک فوجی دستہ فراہم کرے گا کہ افغانی بادشاہ سالانہ ایک لاکھ روپے اور فوجی ہتھیاروں کے علاوہ انعام کے طور پر فوج کے لیے اخراجات بھی فراہم کرے۔
3. خانِ بلوچستان، سدوزئی کے باغی شہزادوں یا افغان سرداروں کی کسی بھی قسم کی مدد یا پناہ فراہم نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس، افغانستان کا بادشاہ، قلات/احمدزئی کے شہزادوں یا شاہی خاندان کو بھی کوئی مدد یا پناہ فراہم نہیں کرے گا۔
4. شاہ افغانستان آئندہ بلوچستان کے اندرونی معاملات، جھگڑوں اور دیگر امور میں مداخلت نہیں کرے گا۔
5. خانِ بلوچستان کے جو بھی علاقے شاہ افغانستان کے قبضے میں ہیں، آج خانِ بلوچستان کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

معاہدۂ قلات کے بعد بلوچ خانیت نے اپنے ہمسایوں، ایران، افغانستان، اومان اور عثمانیہ ترکی کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے شروع کر دیئے۔ خلیفۂ اسلام کی حیثیت سے عثمانی

Scanned by CamScanner

سلطان نے ناصر خان کو "Beyglar Beygi" (بیگلر بیگی، ترکی زبان میں ''سرداروں کا سردار'') کے خطاب سے نوازا۔[51]

معاہدۂ قلات یا معاہدہ عدم مداخلت کے باعث خان کے لیے ممکن ہوگیا کہ اندرونی طور پر استحکام اور نظم وضبط' پیدا کرے، نیز اس ملک کی سرحدوں کو وسیع کرے اور اس علاقے کو دوبارہ متحد کرے جسے بلوچ قوم پرست بلوچ علاقہ سمجھتے ہیں۔ اس دَور میں، خاران، سیستان کا حصہ (ایران۔ افغانستان)، ایرانی بلوچستان، ڈیرہ جاٹ، کراچی، جیکب آباد، مکران، چاغی اور کوئٹہ، خانیت کا حصہ تھے۔ مزید برآں، خانیت نے اپنا اثر ورسوخ، بندرعباس، سندھ اور خورستان تک پھیلا لیا تھا۔ یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ خانیت کے اس علاقے میں کوئی بھی غیر بلوچ علاقے شامل نہ تھے اور اس ضمن میں احمد شاہ کی طرف سے پنجاب کو بلوچوں اور افغانیوں کے درمیان تقسیم کرنے کی پیشکش ٹھکرادی گئی۔ اس کے برعکس، ایرانی، افغانی اور مغل، ہوس ملک گیری میں مبتلا تھے اور اسی مقصد کی خاطر انہوں نے کئی اقوام کو زبردستی زیرنگیں بنالیا۔[52]

اس نے خورستان (1759)ء میں ایرانیوں کے خلاف افغانیوں کی مدد کے لیے کئی جنگی مہمات میں حصہ لیا، نیز اس نے پانی پت کی تیسری جنگ (1761)ء میں مرہٹوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد بھی کی۔[53]

1765ء میں اس نے سکھ پنجابیوں کے خلاف احمد شاہ کو مدد فراہم کی جو پنجاب میں افغان اور مغلوں کی مشترکہ حکومت کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔[54] اس کامیاب جنگی مہمات کی وجہ سے خزانے میں بہت اضافہ ہوا جس کے باعث وہ اپنی قوم کو ایک سیاسی نظام دینے کے قابل ہوگیا۔[55]

معاہدہ قلات (1758ء) کا مختصر جائزہ

اس سے پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ افغانی اور مغربی مصنفین نے قلات کے امن معاہدے (1758ء) کی اہمیت کی طرف بھرپور توجہ نہیں دی، اس لیے ضروری ہے کہ اس ضمن میں کچھ تاریخی ذرائع کا مختصر ذکر کیا جائے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بلوچوں اور بلوچستان کے متعلق تحقیقی عمل کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بلوچوں اور بلوچستان کی سرزمین کے متعلق ہمیں صرف تحریروں کے ذریعے ہی معلوم ہوتا ہے جن میں لازمی طور پر یک طرفہ رویہ اپنایا گیا ہے۔ بلوچستان کے متعلق ہمیشہ افغانستان یا ہندوستان یا پھر ایران کے ماہرین تاریخ نے تحقیقی کاوشیں کی ہیں۔ قلات امن معاہدے (1758ء) کے متعلق ہمیں

Scanned by CamScanner

تین ذرائع سے علم ہوتا ہے۔

1. افغان ذرائع
2. برطانوی تحریریں (مسوّدات)
3. بلوچ ذرائع

درانی عہد کی افغان تحریروں (مسودات) سے بلوچستان اور افغانستان کے درمیان 1758ء کے معاہدہ کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں جب کہ اٹھارہویں صدی کے افغانی مصنفین، مثلاً منشی محمود الحسینی اور منشی عبدالکریم کی تحریروں میں اس معاہدہ کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ افغانی مصنفین میں سے حسنی نہایت ہی اہم حیثیت کا مالک ہے۔ اس نے احمد شاہ کے سرکاری مؤرخ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اسے 54-1753ء میں منشی (سیکریٹری) مقرر کیا گیا تھا جو اپنے کارناموں کو یادگار تحریروں میں ڈھالتا تاکہ آئندہ نسلیں اس کے تجربات سے مستفید ہوں اور اس کا نام تاریخ کے صفحات میں صدیوں تک محفوظ ہو جائے۔[56] اس نے اپنی کتاب ''تاریخ احمد شاہ'' 74-1773ء میں مکمل کی۔ احمد شاہ کے عہد حکومت کے لحاظ سے اس کی یہ کتاب منفرد اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ یہ کتاب ایک عینی شاہد کے بطور شاہی ''منشی'' سرکاری ملازمت پر فائز رہتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اس عہدے کے باعث وہ سرکاری دستاویزت تک رسائی حاصل کرنے کے علاوہ اہم امور کے متعلق افغان حکام اور سرداروں کے انٹرویوز میں بھی کامیاب رہا۔ اس کی کتاب وسطی ایشیا اور مطالعہ ہندوستان کے طلبہ کے لیے نہایت ہی مفید ہے۔ اس کتاب میں احمد شاہ کے مغل ہندوستان اور ایران کے ساتھ بیرونی تعلقات کے متعلق معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں بلوچستان اور افغانستان کے درمیان معاہدہ قلات (1758ء) کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔[57]

اس کے علاوہ گلستانی اور منشی عبدالکریم بھی قابل اہمیت مصنفین ہیں جنہوں نے اپنی کتابیں تیمور شاہ اور زمان شاہ کے ادوار میں مکمل کیا۔ حسینی کی مانند، یہ مصنفین بھی اس معاہدے کا متن اپنے کتابوں میں شامل کرنے میں ناکام رہے۔[58] انیسویں اور بیسویں صدی کے افغانی مصنفین مثلاً سید جمال الدین افغانی، شیر محمد گنڈاپوری (ایک ریٹائرڈ جج)، پروفیسر ماجدا افغانی اور قاضی عطاء اللہ جان خان نے 1758ء کی جنگ اور معاہدہ قلات کے متعلق کسی بھی قسم کا ذکر نہیں کیا ہے۔[59]

عصری افغان مصنفین اور مؤرخین نے اس معاہدہ کی اہمیت پر کسی بھی قسم کی توجہ نہیں دی۔

Scanned by CamScanner

درحقیقت، افغان مصنفین پشتون ازم کی ریاستی پالیسی کے زیر اثر تھے جس کے مطابق پاکستانی شمال مغربی سرحدی صوبہ (KPK) اور بلوچستان، افغانستان کا حصہ ہیں۔[60] ایک ممتاز افغان قوم پرست، مصنف گھبر[61]، بلوچ افغانستان تعلقات کے حوالے سے کسی بھی قسم کی تفصیل مہیا نہیں کرتا۔ اس کا کہنا ہے کہ ناصر خان نے نہ صرف احمد شاہ کی برتری تسلیم کی بلکہ افغان بادشاہ کو اس کی جنگوں کے لیے چھ ہزار فوجی فراہم کرنے پر رضامندی بھی ظاہر کی۔

گھبر اپنے موقف کے حق میں کسی حوالے کا ذکر نہیں کرتا۔ گھبر کی مانند جیبی، معاہدے کے متعلق کوئی تفصیل یا اس موضوع پر کسی بھی قسم کا اشارہ مہیا نہیں کرتا۔[62] افغان مؤرخین میں سے ہروی (Herawi) نہایت اہم ہے۔ اس نے بلوچستان اور افغانستان کی جنگ (1758ء) کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی ہے اور حوالوں اور حواشی کے ساتھ معاہدے کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس کے ذرائع کی بنیاد میلیسن (Malleson)، ہیتو رام اور گنڈا سنگھ ہیں لیکن کسی افغان تاریخی ذریعہ کا حوالہ نہیں دیا۔[63]

برطانوی تحریریں

بلوچستان اور افغانستان کی تاریخ کے متعلق برطانوی تحریریں انیسویں صدی کے اوائل میں سامنے آئیں۔ وہ عناصر جن کے باعث بلوچ مصنفین نے وسطی ایشیا کی ریاستوں کے متعلق مطالعہ کیا، وہ علمی نہیں بلکہ سیاسی تھیں۔ 1809ء میں برطانوی فوجی افسروں کو ایران، بلوچستان اور افغانستان اس لیے بھیجا گیا تاکہ ان کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں اور ان کی معاشی اور فوجی طاقت کے متعلق تحقیق کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ ایران، بلوچستان اور افغانستان سے ہندوستان جانے کے لیے کون سے راستے ہوسکتے ہیں جہاں سے فرانسیسی یا روسی افواج گزر سکیں۔ پوٹنگر (Potinger)، گرانٹ (Grant) اور کرسٹی (Christie) کو بلوچستان کے متعلق معلومات کے حصول کے لیے بھیجا گیا جب کہ میلکم (Malcolm) اور الفنسٹن (Elphinostone) کو ایران اور افغانستان بھیجا گیا۔ بعدازاں، پوٹنگر اور الفنسٹن نے بلوچستان اور افغانستان کی تاریخ، جغرافیہ اور سیاست کے متعلق اپنی کتابیں شائع کیں۔ ان کی کتابوں کے ذریعے افغانستان اور بلوچستان کی اٹھارہویں اور ابتدائی انیسویں صدیوں کی سیاست کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ پوٹنگر (Pottinger) کی تحریریں نہایت اہم ہیں کیوں کہ 1809ء (جب سکندر اعظم نے گیڈروسیا (Gedrosia) کے راستے پیش قدمی کی تو اس دور کی یونانی تحریروں اور مارکوپولو کے مختصر تبصرے کے علاوہ) تک کسی بھی یورپی کی طرف سے اندرون بلوچستان کے دورے کی تفصیلات

Scanned by CamScanner

موجود نہیں۔ یہ تحریریں، انیسویں اور بیسویں صدی کی برطانوی تحریروں سے کہیں زیادہ قابل اعتماد ہیں کیوں کہ ابتدائی دَور میں برطانویوں کی بلوچستان اور افغانستان کی ساتھ کوئی مشترکہ سرحد موجود نہیں تھی، نیز ان ممالک کے حوالے سے برطانویوں نے کوئی طویل المدت حکمت عملی بھی تشکیل نہیں دی تھی۔

پوٹنگر اور الفنسٹن کی طرف سے فراہم کی گئیں معلومات منفرد اور دلچسپ ہیں۔ انہوں نے اس وقت سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے قابل اعتماد معلومات اکٹھی کرنے کی انتہائی کوششیں کیں جب ماضی کے واقعات کی یادیں ابھی تازہ تھیں اور وہ بہت سے لوگ زندہ تھے جو ناصر خان، احمد شاہ اور ان کے جانشینوں کی ادوارِ حکومت کے عینی شاہد تھے۔ (ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پوٹنگر نے ناصر خان اعظم کی وفات (1795ء) کے 14 برس بعد بلوچستان کا دورہ کیا۔ مزید برآں، الفنسٹن اور پوٹنگر نے خاص طور پر 1758ء کے معاہدے کے حوالے سے بلوچستان اور افغانستان کے تعلقات کے متعلق گہری دلچسپی اظہار کیا)۔ الفنسٹن نے دونوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات کی مختصر تاریخ یوں بیان کی:

''یہ معلوم نہیں کہ ناصر خان نے کس لیے درّانی خان کی حکومت پر اپنا انحصار ختم کر دیا لیکن اس نے 1758ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔''[64] اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر خان کو اپنے زیرِ نگین لانے کے ضمن میں احمد شاہ کی ناکامی کے ذمہ دار افغان سردار اور شاہ کا وزیرِ اعظم تھے: ''قلات کا محاصرہ چالیس دن جاری رہا جس دوران درانی کے گھڑ سوار دستے کو خوراک کی کمی کے باعث شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستان میں بادشاہ کی طرف سے بے صبری اور جنگ کے فوری نتیجے کے حصول پر مبنی اس کا رویہ اس کے کردار کے ایک منفی پہلو کو اجاگر کرتا ہے جب کہ ناصر کی طرف سے امن کے لیے بات چیت کی خواہش کے نتیجے میں مذاکرات کا آغاز ہوا اور ایک ایسا معاہدہ طے پایا جو آج بھی بادشاہ اور بلوچوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہے۔''[65] مزید برآں پوٹنگر، معاہدہ قلات کے متعلق تفصیلات مہیا کرنے کے ذریعے بلوچستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کے حوالے سے ایک واضح تصویر پیش کرتا ہے۔

''آئندہ دوستی کے حوالے سے، بادشاہ کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں ناصر خان کے عم زاد کی آمد طے پا چکی تھی؛ اور یہ بھی کہ خان کو اس کے سوا کوئی اور خراج ادا نہیں کرنا تھا کہ وہ بادشاہ کے خرچ پر شاہی حکومت کو فوج اور ٹرانسپورٹ فراہم کرے جس کے عوض اسے ان کی نصف تنخواہ کے برابر نقدی کی صورت میں وظیفہ ادا کرنا تھا۔ خان نے واضح طور پر یہ بھی بتا دیا تھا کہ ''وہ اور اس کے جانشین

کبھی بھی خانہ جنگی میں بادشاہ کی مدد نہیں کریں گے۔'' یہ ایک ایسی شق تھی جس کی انہوں نے نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی۔[66] پوٹنگر مزید لکھتا ہے کہ کیپٹن کرسٹی اور میں 1810ء میں کابل میں تھے تو تخت کے ایک دعوے دار شاہ محمود نے محمود خان سے شجاع الملک کے خلاف مدد طلب کی۔ خان نے جواب دیا کہ وہ شاہ کابل کے حدود سے بیرونی حملہ آوروں کو نکال باہر کرنے کے لیے مدد کرنے یا اس کے فوجیوں کو غیر ملکی معاونت مہیا کرنے کے لیے تیار ہے لیکن احمد شاہ کے ساتھ اس کے باپ کا معاہدہ، موجودہ مطالبے کا مناسب اور شافی جواب ہے۔''[67] شاہِ شجاع نے 1834ء میں خان، میر مہراب سے امیر دوست محمد کے خلاف فوجی امداد کے لیے رابطہ کیا۔ خان کی طرف سے اس کی یہ درخواست معاہدہ 1758ء کے تحت اندرونی معاملات میں عدم مخالفت کی شق کے تناظر میں مسترد کردی گئی۔[68] علاوہ ازیں، بلوچستان اور افغانستان کی تاریخ کے موضوع پر میسن (Masson)، آوترام (Outram)، برنس (Burns) اور موہن لال کی تحریریں موجود ہیں لیکن ان کے ذریعے معاہدہ قلات کا متن سامنے نہیں آتا۔[69]

1850ء کے بعد وسطی ایشیا کے متعلق سیاسی اور فوجی حکام کی برطانوی تحریروں پر "Forward Policy" کے حمایتیوں کے نظریات اور پالیسیوں کے اثرات غالب تھے۔ یہ تحریریں ہرگز علمی نوعیت کی نہیں بلکہ قطعی طور پر سیاسی نوعیت کی حامل ہیں۔

برطانوی حکام اور پالیسی سازوں کی تحریروں کے مطابق ناصر خان، ہمیشہ درانیوں کے ماتحت ہی رہا اور اس امر کی تصدیق یوں ہو جاتی ہے کہ بلوچستان کبھی بھی ایک خودمختار ملک نہیں رہا۔ برطانوی سیاسی مصنفین میں سے جنہوں نے بلوچستان کی سیاسی حیثیت پر اظہارِ خیال کیا، اے ڈبلیو ہیوز (A.W.Hughes)، سنڈیمن (Sandeman) (بشمول اس کے مقامی معاون ہیتو رام)، مالیسن (Malleson)، ٹیٹ (Tate)، کرزن (Curzon)، ہیوز بلر (Hughes Buller) اور سائکس (Sykes) اہم ترین نام تھے۔

ہیوز (Hughes) کے مطابق، ناصر خاں ابتدائی طور پر درانی بادشاہت کا ماتحت تھا۔ 1758ء کے معاہدہ کے متعلق وہ لکھتا ہے: ''مذاکرات کے اختتام پر درانی بادشاہ اور بروہی خان کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس میں باہمی طور پر اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ ناصر خان اب خراج ادا نہیں کرے گا لیکن بہ وقت ضرورت اسے اپنے خرچ پر فوجیوں کا ایک دستہ شاہی حکومت کو بھجوانا چاہیے جس کے عوض اسے ان کی تنخواہ کے نصف کے برابر نقد وظیفہ دیا جائے گا۔''[70] لیکن ہیوز یہ نہیں بتا سکا کہ اسے معاہدہ یا یہ

Scanned by CamScanner

متن کہاں سے حاصل ہوا۔ 1886ء میں دفتر خارجہ کو ایک خفیہ مراسلے کے ذریعے بلوچستان کی سیاسی اور جغرافیائی حیثیت کے متعلق یوں آگاہ کیا:

''ماضی میں عبداللہ خان، مہابت خان، ناصر خان اور اس کے جانشینوں کے ادوارِ حکومت میں جب حکومت قلات اور سرداروں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو ان کے حل کے لیے شاہ احمد شاہ درانی اور اس کے جانشینوں سے رابطہ کیا گیا۔ اس کے بعد سرداروں نے نادر شاہ سے درخواست کی جس نے مہابت خان کو جلاوطن کر دیا اور اس کے بھائی ناصر خان کو گدی نشین کر دیا۔''[71]

سنڈیمن نے اپنی اس تحریر میں کچھ حقائق کو غلط انداز میں پیش کیا ہے جنہیں یوں درست کیا گیا ہے:

1. بلوچستان کی خودمختار حکومت کا بانی، عبداللہ خان، احمد شاہ کا ہم عصر نہیں تھا۔
2. میر مہابت خان، ناصر خان کا حلیف تھا جس نے افغانی اور سندھی سرداروں کے خلاف اس کی مدد کی۔
3. احمد شاہ، ناصر خان اور بلوچستان کے باغی سرداروں نے مہابت خان کو مل کر گرفتار اور جلاوطن کیا۔

سنڈیمن بلوچستان میں برطانوی "Forward Policy" کو جائز ثابت کرنے کے لیے قلات اور اس کی سیاسی حیثیت کے متعلق مندرجہ بالا احوال فراہم کرنے کے ضمن میں اپنے ارادوں کو کبھی بھی نہیں چھپاتا جس کے نتیجے میں معاہدہ جیکب آباد (1876ء) طے پایا۔

''برطانوی حکومت نے معاہدہ جیکب آباد کی رُو سے خود پر یہ فرض عائد کر لیا ہے اور اب اس ریاست پر گزشتہ مثال کی قدیم روایت کے مطابق حکومت کی جائے گی۔''[72] سنڈیمن کا ایک مقامی نائب ہیتو رام، اٹھارہویں صدی میں بلوچستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کے ضمن میں اپنے آقا کے خیالات کی ہی پیروی کرتا ہے۔[73] ایک برطانوی فوجی افسر، مالیسن (Malleson)، 1758ء کی بلوچستان اور افغانستان جنگ اور 1758ء کے معاہدہ امن کے متعلق اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے:

''ہندوستان میں مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبریں گاہے گاہے احمد شاہ تک پہنچیں تو اس نے نہایت بے چینی کے عالم میں ناصر خان سے جواب طلبی کی۔ لیکن قلات پر قبضے کی کوششیں ناکام ہو گئیں

Scanned by CamScanner

اور اپنی پانچویں کوشش ناکام ہونے کے بعد وہ مایوس ہوگیا۔ ناصر خان نے آزادی کے لیے کوشش کی لیکن وہ دارالحکومت تک محدود ہوگیا۔ یوں ناصر خان، احمد شاہ کا تسلط قبول کرنے اور شاہ کو فوجیوں کا ایک دستہ بھیجنے پر تیار ہوگیا کہ جب کبھی شاہ کو اپنے علاقے سے باہر جنگ چھیڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دوسری طرف، احمد شاہ نے جب کبھی اسے بلوچ فوجیوں کی ضرورت محسوس ہوتی، ایک مخصوص رقم اور جنگی اسلحہ فراہم کرنے کی حامی بھرلی۔ وہ کسی داخلی جھگڑے کی صورت میں فوجی دستے کی فراہمی کے مطالبے سے بھی دستبردار ہوگیا، نیز اس نے بلوچ سردار کو بھی خراج کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ اس معاہدے کو مزید مضبوط بنانے کی خاطر احمد شاہ نے ایک بلوچ خاتون سے شادی کرلی۔[74]

میلیسن (Malleson) نے معاہدہ قلات کی جو مختصر تفصیل مہیا کی تھی، گنڈا سنگھ اور ہروی نے بغیر کسی تبصرے کے اس خلاصے کو اپنالیا۔[75] ایک برطانوی مدبر کے علاوہ ''ایران اور ایران کی حیثیت'' کے متعلق ایک مستند ماہر اور برطانوی "Forward Policy" کے عظیم وکیل، لارڈ کرزن نے بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے حوالے سے سنڈیمن کے خیالات سے اتفاق کیا ہے لیکن مزید یہ لکھا کہ ناصر خان نے درانی حکومت کے آخری دَور میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ آر ہیوز (R.Hughes Buller) کے نزدیک قلات ہمیشہ سے ہی ایک آزاد ریاست رہا ہے۔ سنڈیمن کی مانند وہ لکھتا ہے: ''قلات کے حکمران کبھی بھی آزاد نہیں رہے اور ہمیشہ سے ہی ایک برتر قوت کے دست نگر رہے اور آج بھی ہیں۔''[76]

بہرحال، بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق اپنے خیالات کی حمایت میں اس کے پاس کوئی تاریخی دستاویز موجود نہیں، نیز وہ معاہدہ قلات (1758ء) کے متعلق کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ ایران میں برطانوی سفارت کار، پی ایم سائکس (P.M.Sykes) نے اپنی کتاب میں قلات کے معاہدۂ امن کا یوں حوالہ دیا ہے۔

''تین کوششوں کے بعد امن قائم ہوگیا، اور ناصر خان نے وعدہ کرلیا کہ وہ بہ وقتِ ضرورت فوجی مہیا کرے گا۔ اس کے بدلے اسے خراج سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔''[77] اس کے برعکس، سائکس ناصر خان کی سیاسی حیثیت کے متعلق دو مختلف بیانات دیتا ہے۔ افغانستان کے موضوع پر اپنی کتاب میں اس نے ناصر خان کو وہ ماتحت بتایا ہے جس نے ''احمد شاہ کی بالادستی قبول کی۔''[78] مزید برآں، ایران کے متعلق اس کی کتاب میں یوں درج ہے: ''بلوچستان پر ناصر خان اعظم اوّل نے حکومت کی جس کا دورِ حکومت 1750ء سے 1793ء تک تھا اور وہ مکمل طور پر خودمختار تھا۔''[79]

Scanned by CamScanner

سی یو ایچی سن (C.U.Aitchison)، جو محکمہ خارجہ میں انڈر سیکریٹری تھی، اس نے بھی ایک کتاب تحریر کی لیکن اس میں بھی بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق کوئی ذکر نہیں۔[80] ایک برطانوی سیاسی اہلکار ٹیٹ (Tate)، ناصر خان اور احمد شاہ کے درمیان تعلقات کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:[81]

''کہا جاتا ہے کہ 1758ء کے موسم گرما میں اسے بلوچستان میں تب داخل ہونے دیا گیا جب اس کا ماتحت، ناصر خان خراج کی ادائیگی کے بڑھتے ہوئے مطالبات کے باعث پریشان اور مضطرب ہوگیا تھا جو وہ اپنے ملک کی حکومت اور قبائلیوں کے فوج کے سربراہ کی حیثیت کے بدلے ادا کرتا تھا۔ مقامی تاریخی واقعات کے مطابق قلات کے چھوٹے سے قلعے میں شاہ کو چالیس دن تک نظر بند رکھا گیا اور پھر شاہ ولی اللہ خان کی ذاتی کوششوں کے باعث ضدی خان نے اس کی بالادستی تسلیم کی۔''

درحقیقت، بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق Forward Policy کے علمبرداروں نے جو موقف اپنایا، اس کے گنڈا سنگھ، ڈُپری جیسے دیگر دانشوروں کی تحریروں پر بہت زیادہ اثرات مرتب ہوئے لیکن اس ضمن میں میلیسن یا برطانوی سیاسی مصنفین کی طرف سے مختصر احوال پر کسی بھی قسم کی بحث کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی افسران کی جانب سے برطانوی Forward Policy کے عروج کے دَور میں شائع کردہ خلاصے کی قبولیت انتہائی مشکل ہے جنہوں نے برطانوی حدود اور استعماریت کو وسیع کرنے کے لیے خود کو وقف کیا ہوا تھا اور جو بلوچستان جیسے پسماندہ ریاستوں کو خودمختاری اور حق خودارادی دینے سے انکاری تھے۔ بہرحال پوٹنگر نے جس قسم کی تفصیلات مہیا کیں، وہ زیادہ قابل اعتماد معلوم ہوتی ہیں۔ یہ معلومات اور تفصیلات اس وقت مہیا کی گئیں جب لوگوں کی یادیں تازہ تھیں۔ بلوچستان اور افغانستان کے ساتھ برطانویوں کی مشترکہ سرحدیں مفقود تھیں اور اس دَور میں ان ریاستوں کے حوالے سے ان کی کوئی واضح حکمت عملی بھی موجود نہ تھی۔

بلوچ تحریریں

ناصر خان کے دورِ حکومت کے متعلق حقیقی بلوچ ذرائع چند ایک ہی ہیں اور اکثر دانشوروں نے ان ذرائع کو نظرانداز کیا ہے۔ ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ہم ان ذرائع کے متعلق مختصر معلومات مہیا کریں گے۔

جنگ نامہ

اسے گنگابا (اب گندھاوا) کے نور محمد نے 1763ء میں تحریر کیا۔ اس نے ناصر خان اعظم کے

Scanned by CamScanner

دورِ حکومت میں قاضی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جب 1762ء میں سکھوں کے خلاف پنجاب میں بلوچوں اور افغانیوں نے مشترک حملہ کیا تو نور محمد، ناصر خان کے ساتھ تھا۔ اس کی یہ کتاب ہندوستانیوں کے علاوہ بلوچوں اور افغانوں کے حالات جاننے کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب بے دین سکھوں کے خلاف ناصر خان اعظم کے کارناموں کا ذکر کرنے کے لیے قاضی نور محمد نے تحریر کی تھی۔ چوں کہ یہ کتاب قلات کے معاہدۂ امن (1758ء) کے بعد لکھی گئی، اس لیے اس کتاب میں بلوچستان اور افغانستان کے تعلقات کے حوالے سے ہمیں بلوچستان کی خودمختار حیثیت کے منظر نامے کے علاوہ چند ثبوت بھی میسر ہوتے ہیں۔[82]

1. احمد شاہ نے ناصر خان سے درخواست (حکم نہیں دیا) کی کہ اسے سکھوں کے خلاف مدد فراہم کی جائے۔ شاہ کی طرف سے امداد کی درخواست کے ذریعے ناصر خان کی زیردست حیثیت کی بجائے بالادست اور خودمختار حیثیت کا ثبوت مہیا ہو جاتا ہے۔

2. شاہ کے نمائندے نے ناصر خان کا استقبال دُور افتادہ شاہی پڑاؤ سے آ کر کیا۔ اس کے ساتھ یہ خاص سلوک، ایک خودمختار حکمران کی حیثیت سے کیا گیا تھا۔

بلوچ رزمیہ نظمیں

بلوچستان اور افغانستان کے درمیان جنگ (1758ء) کے دوران، ناصر خان کے دربار کے ایک مشہور بلوچ شاعر، جام درک نے رزمیہ نظمیں تحریر کیں جو جنگ کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ شاعر، خان اور اس کی فوج کے کارناموں کی تعریف کرتا ہے۔ ناصر خان کا قلات اور بلوچ عوام کے محافظ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جس نے قلات کو افغانوں کی ''غلامی'' سے نجات دلائی۔ یہ رزمیہ نظمیں، معاہدے کے متن کا ذکر کیے بغیر ایک تحریری معاہدہ کی موجودگی کی تصدیق کرتی ہیں۔[83]

تاریخ بلوچستان

اسے میر مہراب اور میر ناصر دوم کے سابق وزیر اعلیٰ اخوند محمد صدیق نے تحریر کیا ہے۔ محمد صدیق کے والد نے عظیم خان (میر ناصر اوّل) اور میر محمود کے مشیر اور خوانین کے وزیر اعظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، نیز صدیق کو ناصر خان دوم نے اس کی عدم وفاداری کی بنا پر وزیر اعظم کے عہدے سے معزول کر دیا۔ ہتو رام نے صدیق کی کتاب شائع کی جسے انیسویں صدی کے وسط میں اس کی اپنی کتاب کے ساتھ ہی تحریر کیا گیا تھا۔ اگرچہ صدیق کی کتاب بہت ہی مختصر ہے لیکن اس میں

Scanned by CamScanner

بلوچستان اور افغانستان کی جنگ (1758ء) کے متعلق ایک عمومی نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ وہ ناصر خان اور احمد شاہ کے درمیان ایک مکالمہ بھی درج کرتا ہے۔ صدیق کے مطابق، ناصر خان نے بلوچستان کے معاملات میں مسلسل مداخلت کے خلاف شکایت اور احتجاج کیا تھا۔ احمد شاہ نے اس کی خودمختاری کو درج ذیل جواب کے ذریعے تسلیم کیا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں قلات عطا کیا ہے۔''[84]

انیسویں صدی کے بلوچ مصنفین میں سے مولوی شیدائی کی کتاب بہت اہم ہے۔ وہ ناصر خان کو جرمنی کے بسمارک کی مانند بہت بڑا مدبر سمجھتا ہے۔ وہ 1978ء کے معاہدے کا جائزہ لیتا اور کہتا ہے کہ بلوچستان ایک خودمختار حیثیت کا مالک ہے لیکن وہ معاہدے کا مکمل متن فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ گل خان، معاہدے کے خلاصے کا حوالہ دیتا ہے جو گنڈا سنگھ اور میلیسن نے بغیر اپنے تبصروں کے فراہم کیا ہے۔[85]

حکومت قلات کا سرکاری بیان

خوانین قلات کی طرف سے سرکاری طور پر 1970ء تک معاہدے کے متعلق کچھ بھی شائع نہیں کیا گیا، جب قلات کے سابق درباری وزیر ملک اللہ بخش نے درج ذیل بیانات کے ساتھ ریاست قلات کی سرکاری دستاویزات شائع کیں:

''مجھے عالی جناب خان اعظم (میر احمد یار خان) نے حکم دیا ہے کہ میں دربار کی معلومات کی بنیاد پر تمام تاریخی واقعات اور امور کو کتاب کی شکل میں بلوچ عوام کے علم کی خاطر مرتب کروں اور اسے شائع کروں۔ اس کتاب میں درج معلومات کی بنیاد دربار قلات میں موجود معلومات اور تحریریں ہیں۔[86]

بلوچ خانیت کا سیاسی نظام

میر ناصر خان اعظم نے بلوچ رواج۔۔۔ غیر تحریری آئین۔۔۔ کو حتمی شکل دی۔ اس نے سیاسی ادارے متعارف کرائے اور بلوچ خانیت میں جاگیردارانہ اور وفاقی نظام کو مضبوط بنایا۔ اس کا سیاسی نظام بلوچستان میں اس قدر مقبول ہوا کہ جب کبھی قبائلیوں کے درمیان یا خان کی رعایا یا خان اور قبائلی سربراہوں کے درمیان کوئی چپقلش پیدا ہوتی تو تمام فریق ''دستورِ ناصری'' (ناصر خان کا آئین) کے تحت اپنے جھگڑے طے کر لیتے۔ بعد میں آنے والے خوانین نے 1948ء تک ناصر خان اعظم کے سیاسی نظام کی وفاداری کا حلف اٹھا رکھا تھا۔[87]

Scanned by CamScanner

ریاستی انتظامیہ

ا) مرکزی

انتظامیہ کا سربراہ خان کا وزیر (وزیراعظم) تھا جس کے فرائض میں صوبوں کے مختلف محکموں کا انتظام وانصرام تھا۔ وہ بیرونی امور، امن وامان اور سلامتی کے قیام، اعلیٰ عہدوں کے لیے امیدواروں کے انتخاب کا ذمہ دار تھا۔ خزانہ، قانون یا انصاف، جاسوسی سرگرمیاں اور خوانین کا سیکریٹریٹ، وزیر کے زیرانتظام تھا۔[88]

وزارتِ خزانہ کا سربراہ مستوفی تھا جو براہ راست اور بلاواسطہ، دونوں قسم کے ٹیکسوں کے وصولی، خالصہ (خوانین کے زیرانتظام علاقے) کے انتظام وانصرام، خزانے اور بطور ٹیکس مصنوعات اور خانیت کے تمام اخراجات کا ذمہ دار تھا۔ وہ فلاح عامہ کے امور اور محکمہ آبپاشی کا بھی ذمہ دار تھا۔ بادشاہ کی دولت اور خانیت کے خزانہ کو الگ الگ نہیں رکھا جاتا تھا۔ محکمہ محصولات اور متفرق امور کا انتظام وانصرام وزیرخزانہ کے ہاتھ میں تھا۔[89]

محکمہ جاسوسی اور داخلی امور کا سربراہ داروغہ تھا۔ وزیردربار، The Shahgh، دربار میں سرداروں کی درجہ بدرجہ نشستوں کے انتظام، راشن (Jirah) کی نگرانی اور ہنگامی حالت میں فوجی یونٹوں کی تیاری کے علاوہ دیگر درباری امور انجام دیتا۔ محکمہ انصاف قاضیوں (ججوں) کے ہاتھ میں تھا۔ مرکزی اور صوبائی ججوں کا انتخاب، قاضی القضاۃ کی سفارش پر خان کرتا تھا۔ قبائلی علاقوں میں ججوں کی ذمہ داریاں سرداروں کو تفویض کی گئی تھیں جن کی رہنمائی شریعت اور رواج کی روشنی میں قاضی اور جرگے کرتے تھے۔ اقلیتوں (مثلاً ہندوؤں اور یہودیوں) کو ضمیر اور پیشے سمیت ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔[90]

ب) صوبائی:۔

صوبائی انتظامیہ، صوبے کے درجے کے مطابق منقسم تھی۔ بلوچ خانیت میں تین قسم کے صوبے تھے:

II. براہ راست زیرانتظام یا مفتوحہ علاقے[91]

II. بلاواسطہ زیرانتظام علاقے یا قبائلی صوبے[92]

III. زیرنگیں صوبے یا نیم خودمختار ریاستیں

نیابت یا مفتوحہ علاقوں پر خان حکومت کرتا جس نے ان علاقوں پر مطلق العنان بادشاہ کی

Scanned by CamScanner

مانند حکومت کی۔ان صوبوں کے عوام، خان کی رعایا تھے۔ان میں مندرجہ ذیل صوبے بہت ہی اہم تھے:

1. مکران: یہ ایک ساحلی صوبہ ہے جسے خانیت نے اٹھارہویں صدی میں فتح کیا۔اس کی مغربی سرحد بندر عباس تھی اور اس کی مشرقی سرحد کراچی (یہ صوبہ انیسویں صدی میں خانیت اور ایران کے درمیان تقسیم ہوگیا تھا) تھی۔ساحلی اور پہاڑی علاقے تقریباً بنجر ہیں کیوں کہ یہاں بہت کم بارش ہوتی ہے۔ یہاں کی اہم فصل کھجور ہے اور ایک زمانے میں اونٹ اور بکریاں پالی جاتی تھیں۔پسنی، اور ماڑہ، جسک اور گوادر، اہم سمندری بندرگاہیں ہیں۔خانیت کی زیادہ تر آمدن اسی صوبہ سے حاصل ہوتی ہے جو افغانستان اور خلیجی ممالک کے درمیان تجارت پر محصول کی صورت میں ہے۔مقامی لوگوں کا ذریعہ معاش ماہی گیری ہے۔ یہ علاقہ کئی اضلاع میں منقسم تھا اور ضلع کو انتظام نائب (گورنر) کے ہاتھ میں تھا۔مکران کے تمام نائبین (گورنروں) کا سربراہ ناظم (گورنر جنرل) تھا۔اہم اہمیت کے حامل قبائل میں مند کے رند، گچکی، بزنجو، نوشیروانی، برانزائی، ہوت، دشتی اور لاشار شامل تھے۔

2. خاران: مکران کے شمال اور جھالاوان کے مغرب اور چاغی کے شمال (سراوان صوبے کا حصہ) میں خاران کا صوبہ تھا۔ یہ ایک وسیع میدانی علاقہ ہے جو مغرب سے دوسو میل اور شمال سے جنوب اسی میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں مغرب اور شمال مشرق میں آبپاشی کی جاسکتی ہے۔اس صوبہ کا مرکز قلاتِ خاران تھا۔اس صوبے کی اکلوتی نباتات چند ایک چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور عوام کا مرکزی ذریعہ معاش اونٹوں کی نسل کشی تھی۔

3. شال: خانیت کا انتہائی شمالی صوبہ شال تھا، اس کا مرکزی شہر شالکوٹ تھا۔(انیسویں صدی ہی سے شہر اور صوبے کو کوئٹہ کہا جاتا تھا)۔ یہ صوبہ، شمال سے جنوب کی طرف 120 میل اور مشرق سے مغرب کی طرف تقریباً 60 میل تک پھیلا ہوا تھا۔سراوان صوبہ اس کے جنوب اور جنوب مشرق میں تھا۔ اس صوبے کی دیگر سرحدیں افغانستان کی سرحد کے ساتھ منسلک تھیں۔ خان نے شالکوٹ میں ایک نائب مقرر کیا ہوا تھا۔رعایا قبائل میں زیادہ تر پشتون اور بروہی تھے۔درۂ بولان میں اس کے محل وقوع کے باعث، کوئٹہ ہمیشہ سے ہی اہم سٹریٹجک اہمیت کا حامل رہا ہے۔

4. کچھی: قلات کا سب سے زیادہ اہم علاقہ کچھی کا صوبہ تھا۔ یہ ایک چپٹا، تکونا داخلی راستہ ہے جس کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل پر مشتمل ہے۔مشرقی صوبہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ صحرا اور امارت سندھ سے جھالاوان اور سراوان کی طرف پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔اس کے شمال مشرق میں مری اور بگتیوں کا

Scanned by CamScanner

ملک ہے جو سراوان صوبے کا ایک حصہ ہے اور ڈیرہ غازی خان کے نزدیک دجل ہرند کی نیابت ہے۔ اس میدانی علاقے کی بہت زیادہ سٹریٹجک اہمیت ہے کیوں کہ بولان اور مُولہ درّوں تک جانے کا راستہ اس علاقے سے گزر کر جاتا ہے۔ درہ مُولہ کے ذریعے ٹریفک کچھی سے قلات کی طرف یا پھر کوئٹہ یا مکران اور سیستان کی طرف جاتی ہے۔ اس لیے، اس کا میدانی علاقہ، جنوبی ایشیا سے جنوب مغربی ایشیا اور وسطی ایشیا کو جانے والے رستے پر مشتمل ہے۔

اپنے معاشی وسائل وذرائع کے باعث خانیت کی ترقی کے لیے کچھی نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اس کی اہم خصوصیات، ہموار سطح، موسم سرما میں سرد درجۂ حرارت اور موسم گرما میں گرم درجہ حرارت ہیں۔ بہرحال، اس کے پاس آبپاشی کے لیے وافر پانی موجود ہے، نیز زمین بہت ہی زرخیز ہے۔ موسمی دریاؤں کے علاقہ بارشوں کا پانی محفوظ کرنے کے لیے بند تعمیر کیے گئے تھے۔ اس علاقے کا انتظام، گوادر اور بھاگ میں متعین دو نائبین کے ہاتھ میں تھا۔ دھاڈر کا شہر خانیت کا سرمائی دارالحکومت تھا۔ اس صوبے کی آبادی میں دو قسم کے لوگ شامل تھے:

a) محکوم اقوام: یہ اقوام، جاٹوں اور سندھی بولنے والوں پر مشتمل تھیں جو کاشتکاری کرتے تھے جنہیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

b) قبائل: یہ زیادہ تر کیری، مگسی، کھوسو، جاکھرانی، جمالی اور ڈومکی جیسے بلوچ قبائل تھے۔ یہ خان کو خراج دیتے یا پھر فوجی خدمات میں اپنا حصہ ڈالتے۔ انہیں اپنی ریاستوں میں حاکم اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ یہ قبائل، پندرہویں صدی میں امیر چاکر رند کے دورِ حکومت میں کچھی میں آباد ہوگئے۔ باقی ماندہ زمینیں دیگر قبائل اور خانیت میں تقسیم کردی گئیں۔

ان صوبوں کے علاوہ کراچی، خان گڑھ اور ڈیرہ جات کے قریب دجل ہرند کے چھوٹے چھوٹے صوبے بھی تھے جن کا انتظام نائبین کے ہاتھوں میں تھا۔

بلاواسطہ زیر انتظام یا قبائلی صوبوں پر سرداروں یا تمن داروں کی حکومت تھی۔ یہ سردار، اپنے اپنے علاقے کی انتظامیہ کے ذمہ دار تھے۔ قبائلی سرداروں کا انتخاب قبائلی کرتے اور بطور سردار تقرری کی تصدیق کے لیے فرمان وصول کرتے اور انہیں سردار یا تمّن دار کہا جاتا۔ ان کے متعلقہ قبائل کی شکایات کی بنیاد پر خانیت کو سرداروں کو معزول کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

قبائلی صوبے، دو مرکزی ڈویژنوں پر مشتمل تھے:

Scanned by CamScanner

1) سارا وان (بالائی علاقے)

2) جھالاوان (زیریں علاقے)

صوبہ سارا وان، قلات شہر کے شمال کی طرف تقریباً نوے میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی ریاستی حد، دودائی وفاق اور کوہِ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ اس کی مغربی سرحد، مغربی بلوچستان میں سرحد (Sarhad) پر مشتمل تھی۔ سراوان کے سب سے زیادہ اہم قبائل رئیسانی، شاہوانی، کرد، مری، بگتی، کھیتران، سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے بلوچ قبیلے، سنجرانی اور سرحد کے بلوچ قبیلے تھے۔ مستونگ، صوبائی گورنر کا صدر مقام تھا۔

محکوم صوبے ان علاقوں پر مشتمل تھے جنہیں خان نے فتح کیا تھا، مثلاً لسبیلہ اور ڈیرہ جات کا دودائی وفاق یا پھر وہ علاقے تھے جن پر افغان حکمرانوں کے ساتھ اتحاد کے ذریعے قبضہ کیا گیا تھا۔ ان میں امارتِ سندھ اور سیستان شامل تھے۔ محکوم صوبوں کی طرف سے خانیت کو مندرجہ ذیل رقم بطور خراج دی جاتی تھی۔

1) لسبیلہ کو بہ وقتِ ضرورت خان کو فوج فراہم کرنی ہوتی تھی۔ خراج کی رقم مقرر نہ تھی۔

2) ڈیرہ جات کا دودائی وفاق:

علاقہ	خراج کی سالانہ رقم[93]
(i) ڈیرہ اسماعیل خان کی نیابت	1,20,000/- روپے
(ii) ڈیرہ غازی خان کی نیابت	6,70,000/- روپے
(iii) بھکر رلیہ کی نیابت	1,50,000/- روپے

3) امارتِ سندھ 40,000/- روپے کا سالانہ خراج ادا کرتی۔[94]

4) سیستان کے خراج کی رقم کے متعلق علم نہیں ہوسکا۔ برطانوی اطلاعات کے مطابق، سیستان کے سردار فوجی خدمات بجالاتے۔[95]

فوجی تنظیم

ناصر خان اعظم کی فوجی تنظیم، میر جلال خان کے فوجی نظام اور منگول ڈیسیمل نظام (Mongol Decimal System) کی ایک ترمیم شدہ شکل تھی۔ فوج، تین بڑے ڈویژنوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ ہر ڈویژن کو دستہ (Dasta) کہا جاتا تھا۔ دستۂ خاص (شاہی ڈویژن)، 1,750 فوجیوں،

Scanned by CamScanner

دستہ ساراوان 5,160 جنگجوؤں اور دستہ جھالاوان 5,700 فوجی سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ خان، فوج کا سپہ سالار اعلیٰ تھا اور شاہی دستہ براہ راست اس کے زیر انتظام تھا۔ دستۂ ساراوان کی سربراہی رئیسانی یا شاہوانی قبیلے اور دستہ جھالاوان کی سربراہی زہری یا مینگل قبیلے کے سردار کے ہاتھ میں تھی۔ ہر ڈویژن کے سالار کو سرِ ساراوان اور سرِ جھالاوان کہا جاتا تھا۔ یہ ڈویژن، ٹاکروں، پاروں اور شلواروں میں مزید منقسم تھے۔ ہر ٹاکر (رجمنٹ) کا سالار ٹاکری (بریگیڈیئر کے برابر) اور ہر پارا (بریگیڈ) کا سالار، معتبر (کرنل کے برابر) کہلاتا۔ پارا کو مزید تقسیم کیا گیا تھا اور ہر شلوار (یونٹ) کا سالار، صیفدرشس (میجر کے برابر) ہوتا۔ اس طرح ایک فوجی ادارہ قائم کیا گیا۔ خانیت کو فوج کے سپہ سالارِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے سرِ ساراوان اور سرِ جھالاوان کی معاونت حاصل تھی جو دو طاقت ور ڈویژنوں کے سالار تھے۔ صیفدرشس، معتبروں؛ معتبر، ٹاکروں؛ ٹاکر، سرداروں اور سردار، سرِ ساراوان اور سرِ جھالاوان کو جواب دہ تھے۔ دستوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ خان کی ہدایت کے مطابق فوجی کی مخصوص تعداد فراہم کرتے۔ ان فوجیوں کو غمِ لشکر کہا جاتا۔ ہر ڈویژن کے لیے لازمی تھا کہ وہ غمِ لشکر کے لیے اپنے فوجیوں کا بارہواں حصہ بھجوائے۔ زمانۂ امن میں فوج کی مکمل تعداد یوں تھی:

شاہی ڈویژن	1,750
سرِ ساراوان	5,160
سرِ جھالاوان	5,700
کُل تعداد	12,160

بھرتی:۔

دستۂ خاص کی بھرتی مکران کے بلوچ قبائل، کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے بلوچ قبائل، سیستان، کچھی کے بلوچ قبائل اور سبی سے کی جاتی تھی۔ دستۂ خاص کے پرچم کا رنگ سبز تھا اور ان کی وردی سرخ جیکٹ پر مشتمل ہوتی، نیز وہ ہر ضروری ہتھیار سے لیس ہوتے۔ دستۂ ساراوان میں دس قبائلی دستے شامل ہوتے اور ان کے پرچم کا رنگ سرخ ہوتا جب کہ دستہ جھالاوان، تیرہ قبائل سے بھرتی کیا جاتا اور اس کے پرچم کا رنگ زرد ہوتا تھا۔[96]

ہیتو رام نے بتایا کہ ہنگامی حالات میں خانیت کی فوج کُل تعداد تقریباً ایک ملین افراد ہوتی، اور لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر نے، جس نے 1810ء میں بلوچستان کا دورہ کیا، بتایا کہ بلوچستان اور افغانستان

کے درمیان جنگ (1758ء) کے دوران خانیت کی فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔[97]

فوج کے علاوہ خان کے پاس ایک باڈی گارڈ بھی تھا جسے مکران کے سیاہ غلاموں اور افغانستان وایران کے کرائے کے فوجیوں سے منتخب کیا جاتا جس کا کام یہ تھا کہ خان کی مختلف سازشوں کے خلاف حفاظت کی جائے۔[98]

قومی پرچم

بلوچ خانیت کا اپنا پرچم تھا جس کا بالائی حصہ سرخ اور زیریں حصہ سبز تھا۔ سرخ رنگ کا مطلب آزادی اور جنگ جب کہ سبز رنگ سے مراد انصاف اور امن تھا۔[99]

قومی زبان

تحریری درباری زبان فارسی تھی۔ داخلی اور خارجی معاملات فارسی میں طے کیے جاتے۔ بلوچی قومی زبان تھی اور تمام بحث ومباحث وکانفرنسوں وغیرہ کے انعقاد کے لیے یہ زبان استعمال کی جاتی۔

کرنسی

بلوچ خانیت نے اپنی کرنسی متعارف کرائی تھی جسے ''ناصر شاہی'' یا ''کرم شاہی'' کہتے تھے اور اس پر ناصر خان کا نام چھپا ہوتا تھا۔ ''شاہی'' کی قیمت، افغانی ''احمد شاہی'' کے برابر ہوتی جو افغانستان کی کرنسی تھی۔ سکوں کو قلات میں ڈھالا جاتا تھا۔[100]

خارجہ پالیسی

خان، وہ پہلا بلوچ حکمران تھا جس نے خارجہ پالیسی پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔ اس نے ایران، افغانستان اور سلطنت اومان کے علاوہ ترکی کی عثمانیہ سلطنت کے ساتھ سفیروں کا تبادلہ کیا۔ مزید برآں اس نے ڈیرہ جات، وفاق اور سندھ، محکوم صوبوں سے وکیلہ Wakila وصول کیا۔ مغل ہندوستان کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس کی خارجہ پالیسی کا نہایت ہی برا پہلو، سندھ کی بلوچ امارت کے ساتھ اس کا رویہ تھا۔ سندھ، سیستان کی مانند، بلوچستان اور افغانستان کا ایک مشترک محکوم صوبہ تھا۔ تالپور میروں نے افغانستان کے زیر تسلط محکومانہ حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بلوچ فوج نے سندھ کی بلوچ امارت کو اپنے زیر تسلط لانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ بالآخر، ناصر خان اعظم کی مدد کے ذریعے اس امارت کو شکست دی گئی اور اسے افغانیوں کو خراج دینے پر مجبور کر دیا گیا۔[101] اگر ناصر خان اعظم

Scanned by CamScanner

نے تالپور بلوچوں کے ساتھ تعاون کیا ہوتا تو بلوچ تاریخ کا دھارا مختلف ہوتا۔ افغانستان کے ساتھ ناصر خان کے تعاون کے باوجود، احمد شاہ کے جانشینوں نے بلوچستان کے متعلق ایک جارح اور توسیع پسندانہ پالیسی اختیار کی جب کہ میر مہراب خان اور تالپور میر برطانوی سامراجیت کے خلاف متحدہ محاذ تشکیل دینے میں ناکام ہو گئے۔

زمینوں کا استعمال[102]

میر ناصر خان اعظم کے دورِ حکومت میں براہ راست زیرِ انتظام صوبوں (مفتوحہ زمینیں) اور بلوچ قبیلوں میں زمینوں کے استعمال کی مختلف اقسام سامنے آئیں۔ بنیادی طور پر زمین کے استعمال کے چار طریقے تھے:

(i) قومی اراضی (قبائلی زمینیں)

یہ زمینیں قبائلی صوبوں میں واقع تھیں اور مشترکہ ملکیت کی خصوصیت کی حامل تھیں اور کسی بھی (حتیٰ کہ قبیلے کا سربراہ بھی) شخص کو یہ زمینیں فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ بلوچ آئین کے مطابق، زمین کا پانچواں حصہ منتخب سردار کو اس کی قبیلے کے لیے ایک منتظم اور فوجی سپہ سالار کے طور پر خدمات انجام دینے کے انعام کے طور پر اس کے مخصوص استعمال کے لیے دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ زمین مہمان خانہ کے انتظام وانصرام کے لیے بھی دی جاتی تھی۔ اس کے بعد باقی زمین کو ہر قبیلے کے ایک ایک مرد میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ غلاموں، جاٹوں (ہندوستانی اقوام) اور لوریوں کو زمین سے حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص اپنے طور پر کاشتکاری نہ کر سکتا تو پھر زمین جاٹوں یا دہواروں کو ٹھیکے پر دی جاتی اور اس کی پیداوار کو مردارکان میں مساوی تقسیم کر دیا جاتا۔ عام طور پر زمین پانچ یا چھ سال کے عرصے کے بعد تقسیم کی جاتی تھی۔ (مری، قیصرانی اور بزدار سمیت بہت سے بلوچ قبیلوں نے یہ رواج آج بھی برقرار رکھا ہے)۔

(ii) جاگیر (محصولات کے بغیر امداد)

یہ زمینیں ہر قبیلے کو فوجی یا دیگر خدمات کے عوض عطا کی جاتی تھیں۔ قبیلے کے سربراہوں کو اجازت ہوتی کہ وہ اس زمین کی آمدن کا چھٹا حصہ اپنی ضروریات کے لیے جمع کر لیں۔ جب ایک مرتبہ زمین قبیلوں کو بطور جاگیر تقسیم کر دی جاتی، تو پھر ریاست کو کسی بھی قسم کی آمدن نہیں دی جاتی تھی۔ سرداروں نہ ہی قبیلے کے کسی فرد کو زمین فروخت کرنے کی اجازت تھی۔ قبیلوں کو زمینیں، مکران، کچھی اور

Scanned by CamScanner

ڈیرہ جات کے میدانی علاقوں میں دی جاتی تھیں۔

(iii) جنگی خدمات کے لیے زمینیں

Raxij کے تحت ہر قبیلے کا فرض ہے کہ وہ اپنی کُل فوجی طاقت کے مطابق بہ وقتِ ضرورت فوجی فراہم کرے۔ سرداروں کے لیے لازم تھا کہ وہ آمدن کا بارہواں حصہ قومی خزانے میں جمع کرائیں۔ یہ زمینیں قبیلوں کے ہر مرد میں مساوی تقسیم کردی جاتیں۔ سرداروں سمیت قبیلوں کو یہ زمین فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی اجازت نہیں۔ فوجی خدمات انجام دینے میں ناکامی یا احکام کی دیگر قسم کی نافرمانی کی صورت میں خان کو ان کی زمینیں ضبط کرنے کا حق حاصل تھا۔

(iv) شاہی زمین

دھواروں (تاجک)، جاٹوں (ہندوستانی) اور افغانیوں سمیت محکوم اقوام کو مستقل طور پر زمینیں دی جاتی تھیں۔ وہ خانیت کے خزانے میں براہ راست محصولات جمع کراتے اور فوجی خدمات سے مستثنیٰ تھے۔ محصول کی رقم مختلف علاقوں میں مختلف تھی۔ اگر ایک قبیلہ فوجی خدمات انجام نہ دے سکتا یا کسی بھی قسم کی دیگر نافرمانی کا مرتکب ہوتا تو خان کو زمین ضبط کرنے کا حق حاصل تھا۔

قبائلی تنظیم

خانیت کی قبائلی تنظیم کی بنیاد میر جلال خان کا پہلا بلوچ وفاق تھا۔ تمنوں (قبیلوں) کو ایک ایسے نظام میں منظم کردیا گیا تھا جو فوجی ضروریات کے لیے مناسب تھا جو گزشتہ ادوار کی مانند تھا۔ چھوٹے پیمانے سے شروع ہوکر ہر قبیلے نے مختلف عناصر اکٹھے کرلیے جو بعض اوقات اجنبی نوعیت کے بھی حامل ہوتے تھے جو مشترک اچھائی و برائی میں شریک ہوتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمن (قبیلے کے پرانا نام 'بُلک' (Buluk)) تھا تاکہ قبیلے کا مناسب طور پر انتظام کیا جائے۔ ناصر خان اعظم کے دور میں، بلوچ تمن، ٹاکروں، ٹاکر، مختلف حصوں اور یہ حصے مختلف فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ قبائلی سردار، قبیلے کے علاوہ جنگ و امن کی کونسل کا سربراہ ہوتا۔ تمن داروں کی معاونت کے لیے مقرر شدہ انتظامی سربراہ موجود ہوتے۔ ہر حصے کا سربراہ وڈیرہ ہوتا جس کے ساتھ ایک مقدم منسلک ہوتا جو وڈیرے کے انتظامی سربراہ کا کردار ادا کرتا۔ تمن داروں سے لے کر معتبروں تک ہر سربراہ کو تمن منتخب کرتے جب کہ سردار خان کے انتخاب میں حصہ لیتے۔ قبائلیوں کو اپنے سربراہ کے فیصلوں کے خلاف بڑے سردار کے پاس درخواست کرنے کا حق حاصل تھا۔ تمن دار کے فیصلے سے ناخوش شخص کو تمن دار کے فیصلے کے خلاف خان

Scanned by CamScanner

کے دربار میں درخواست کرنے کا حق حاصل تھا اور خان کا فیصلہ حتمی تصور کیا جاتا تھا۔ خان کو رعایا کی شکایت پر تمن دار کو برخاست کرنے کا بھی اختیار حاصل تھا۔ یہ مناصب وراثتی نہیں تھے بلکہ عام رواج یہ تھا کہ ایک خاص خاندان جسے سردار خیل کہتے تھے، سے سربراہ منتخب کیا جائے۔[103]

سرداروں کے علاوہ، کئی دیگر سرکاری مناصب تھے:

(i) راہزن (علم بردار): قبیلے کی طرف سے ایک بہادر اور حوصلہ مند شخص کو جنگ اور حملوں میں قیادت کے لیے منتخب کیا جاتا۔ اسے مالِ غنیمت میں سے مناسب حصہ دیا جاتا۔

(ii) جنگی شاعر: ہر قبیلے کا اپنا ایک مخصوص شاعر ہوتا تھا جس کا کام قبیلے کی تاریخ کو نظم کی صورت میں مرتب کرنا اور میدانِ جنگ میں فوجیوں کا حوصلہ بڑھانا تھا۔[104]

مزید برآں، ہر قبیلے کی اپنی ایک مجلس (اسمبلی) ہوتی جو صرف مرد اراکین (اگرچہ سولہویں صدی تک خواتین بھی مجلس کی ارکان ہوتی تھیں) پر مشتمل ہوتی۔ اس مجلس کو تمن دار منتخب کرنے کا حق حاصل تھا، نیز مجلس دوسرے قبیلوں کے ساتھ جنگ اور امن کے معاملات کے متعلق فیصلہ کرتی، اس کے علاوہ ہجرت کے معاملات کی نگرانی بھی کرتی اور عوامی عہدوں پر فائز سربراہوں کے لیے تنخواہوں کا فیصلہ کرتی۔

ناصر خان اعظم کی وفات

میر ناصر خان اعظم نے نظام مواصلات، عوامی امور، تجارت وغیرہ کی ترقی کے لیے اپنی توجہ مرکوز کی۔ جب 1794ء میں اس کی وفات ہوئی تو اس وقت بلوچ قوم ایک واحد سیاسی چھتری کے زیرِ سایہ موجود تھی۔ اس کی موت کا غم نہ صرف بلوچوں میں کیا گیا بلکہ اس کی موت کے نقصان کو ایران، افغانستان اور سلطنت اومان کے شاہان کے درباروں میں بھی محسوس کیا گیا۔

1810ء میں برطانوی فوجی افسر لیفٹیننٹ (بعد میں ''جناب'') ایچ پوٹنگر نے جسے بلوچستان کے حالات معلوم کرنے کے لیے بطور جاسوس بھیجا گیا، خان میر ناصر خان اعظم کی مدبرانہ حیثیت کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا:

''اگر ہم ناصر خان کے کردار پر ایک فوجی، ایک مدبر یا ایک شہزادے کی حیثیت سے غور کریں تو لوگوں سے کہیں کہ اسے کون سے مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے، تو پھر ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ تو ان تمام خوبیوں اور ذمہ داریوں کا ایک غیر معمولی مجموعہ ہے جو اس سے منسوب کی گئی ہیں۔ اس نے اپنی پیشہ

Scanned by CamScanner

ورانہ زندگی کا آغاز اپنے ہی بھائی کو قتل کرنے کے رسوا کن کام سے کیا لیکن اس پر ادوارِ ابتلا بھی بہت آئے۔ اگر کبھی اسے اپنے اس فعل پر خوش ہونے کا موقع ملتا تو اس کے دشمن اس پر ترس کھاتے۔ زندگی بھر اس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا تھا کہ اپنے ملک کے بچانے کے لیے اپنے بھائی کی قربانی اس پر فرض ہے۔ دولت کی امیدوں نے اس کی آنکھیں کبھی چکا چوند نہیں کیں کیوں کہ میدانِ جنگ میں اس نے اپنے نائبین سے بہتر طرزِ زندگی کبھی اختیار نہیں کیا اور اس نے دولت مندوں کو کبھی قابل تعظیم نہیں سمجھا لیکن صرف اور صرف عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر اس نے دولت مندوں کی تکریم کا تکلف کیا۔ ایک مدبر کی حیثیت سے اس نے چند ہی ماہ میں اپنی اس عظیم سلطنت کا انتظام اس قدر سختی کے ساتھ کیا جو اسے عطا کی گئی تھی کہ اس کی سلطنت کے دُور افتادہ اضلاع عین اسی طرح اس کے احکام کی بجا آوری کے لیے تیار رہتے تھے جس طرح اس کے نزدیکی اضلاع اس کے اشارۂ ابرو پر اس کی طرف لپکے ہوئے آتے تھے۔ مزید برآں ایک شہزادے کی حیثیت سے بھی اس نے اپنے فرائض خوب نبھائے کہ اس کا نام ملک کے کونے کونے میں موجود اس کے ہم وطنوں میں ایک محاورے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مختصر یہ کہ اگر ناصر خان نے کسی روشن ضمیر قوم پر حکومت کی ہوتی، یا پھر ایک ایسی قوم پر حکومت کی ہوتی جس سے بعد میں یورپی بہتر طور پر آشنا ہوئے، تو پھر وہ اپنی زندگی ہی میں ایشیائی شہزادوں کے لیے ایک مثال کی حیثیت اختیار کر جاتا۔ وہ روشن خیال، بہادر، منصف اور درگزر کرنے والا تھا، دشمنی اور نفرت کی صورت میں بھی تحمل و برداشت اس کا وتیرہ تھا۔ صداقت و امانت جیسی خوبیاں اس کی زندگی میں اس قدر سختی کے ساتھ سرایت کر چکی تھیں کہ اس کے متعلق کبھی یہ نہیں سنا گیا تھا کہ وہ اپنے معمولی سے معمولی وعدے کو بھی بخوبی نبھاتا تھا۔"[105]

ناصر خان اعظم کی وفات کی صورتِ حال

ناصر خان اعظم کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے، میر محمود خان اوّل کو خان منتخب کیا گیا۔ وہ اس وقت محض سات برس کا بچہ تھا، اس لیے وزیر اعظم، اخوند فتح محمد اب تمام سلطنت کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں افغانیوں نے زیر تسلط صوبے، ڈیرہ جاٹ پر قبضہ کر لیا جب کہ مکران اور مغربی بلوچستان میں کئی ایک سردار خود مختار ہو گئے انہوں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ 1810ء تک برطانوی جاسوسوں کی ٹیم (پوٹنگر، کرسٹی اور گرانٹ) کی اطلاعات کے مطابق

Scanned by CamScanner

خانیت کی سلطنت میں انتشار وافراتفری کا دور دورہ تھا۔

اس انتشار اور افراتفری کی وجہ خان کی ذاتی زندگی تھی کہ وہ عیش وعشرت کا دلدادہ تھا۔ مزید برآں، وزیراعظم اور دیگر اہم حکام افغان تھے یا پھر ایرانی النسل تھے، اور یوں وہ ایران اور افغانستان کے خلاف ملکی مفادات کا تحفظ نہیں کر سکے جب ڈیرہ جات جیسے زیرتسلط صوبے یا مغربی بلوچستان کے ایک حصے پر قبضہ کیا گیا۔ میر ناصر خان اعظم کے دورِ حکومت میں قبیلوں اور ان کے سرداروں کی آمدن کا بڑا ذریعہ مغل ہندوستان، ایران اور سندھ پر ان کے حملوں سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں ان کا حصہ تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب، طاقتور رنجیت سنگھ کے قبضے میں چلا گیا، ایران طاقت ور ہو گیا جب کہ خانیت اور اس کا فوجی اتحادی، افغانستان انتشار وافراتفری کا شکار تھے۔ ان حالات میں جب سردار اپنی آمدن کے بڑے ذریعے سے محروم ہو گئے تو انہوں نے شاہی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔

1817ء میں میر محمود خان کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹے، میر مہراب خان کو خان منتخب کر لیا گیا۔ اس پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے حوصلہ مندی اور مصلحت پسندی کی بجائے اپنے دادا کی مانند مطلق العنانیت پر مبنی طرزِ عمل اختیار کیا۔

گل خاں نے لکھا کہ اگرچہ وہ ''بادل کی مانند گرج رہا تھا لیکن اس نے شبنم کے قطروں کی مانند حکومت کی۔''[106] اس زمانے کے ایک مصنف مرزا احمد علی نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

''مہراب خان ایک بہادر اور قاہر شخص تھا۔ ایک ذہین حکمران کی حکمت عملی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی سلطنت کا انتظام وانصرام نہایت ہی ہوشیاری اور مصلحت پسندی علاوہ مدبرانہ انداز میں انجام دے اور اپنی عوام کے ساتھ مہربانی وشفقت کا سلوک کرے۔ سختی اور جارحانہ طرزِ عمل کے ذریعے حکومت چلائی نہیں جا سکتی۔ اس کے برعکس، مہراب خان نے لوگوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا۔''[107] اس نے دو اہم قبائلی سربراہوں کے علاوہ اپنے وزراء کو بھی قتل کر دیا۔

اس حکمت عملی کی وجہ یہ تھی کہ سرداروں اور وزیراعظم کی طرف سے شادیوں کے ذریعے اتحاد پر مبنی طرزِ عمل کو کچل دیا جائے لیکن اس نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ اس اور خانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ وہ اقتدار کا بہت دلدادہ تھا اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے علاوہ اپنے ملک کو دوبارہ متحد کرنے کا خواہاں تھا۔ اپنے ان مقاصد کے حصول کے لیے اس نے سکھوں کے خلاف پشاور اور ہزارہ

Scanned by CamScanner

اضلاع (سابقہ افغان صوبے) کے مجاہدین کے قائد سید احمد شاہ بریلوی کے ساتھ سیاسی اور فوجی اتحاد کیا تاکہ ڈیرہ جات پر دوبارہ قبضہ کیا جائے۔ اس نے سکھوں کے خلاف ڈیرہ جات کے بلوچ قبائل کی حمایت کی اور ڈیرہ جات کے کچھ حصوں میں اپنی عملداری کو مستحکم کیا۔ درحقیقت، جب سید اسماعیل (شاہ ولی اللہ دہلوی کے پڑپوتے) اور سید احمد بریلوی کی سرکردگی میں مجاہدین نے افغانستان کے مشرقی پشتون علاقوں (اب پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ، خیبر پختون خوا) کو آزاد کرانے اور ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے سکھ پنجابیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا تو مجاہدین نے خان کو اکسایا کہ وہ اپنی سرحدوں کو جنوبی افغانستان اور ڈیرہ جات تک پھیلائے اور اس منصوبے کے ضمن میں انہوں نے خان کو اپنی مدد کا یقین دلایا۔[108]

بہرحال، مہراب خان اپنے ملک کو دوبارہ متحد کرنے میں ناکام رہا کیوں کہ اس نے قبائلی امور سے نمٹنے کے لیے مدبرانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ 1838ء میں اس کا برطانوی ہند (باب 6، سامراجیت اور بیداری ملاحظہ کیجئے) سے سامنا ہوا اور بالآخر 1839ء میں وہ ملک کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا۔

مہراب خان کی شان میں قوم پرست مصنفوں نے قصیدے اور قبائلی شاعروں نے نظمیں لکھیں جن کے نزدیک مہراب خان، ہندوستان کے ٹیپو سلطان کی مانند "شہیدِ بلوچستان" تھا۔[109]

Scanned by CamScanner

باب6

سامراجیت اور بیداری

پس منظر

سٹریٹجی اور تجارت، دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے پرتگیزیوں، روسیوں اور برطانویوں کے نزدیک بلوچستان کی اہمیت بہت زیادہ تھی کیوں کہ یہ ان راستوں کے سنگم پر واقع ہے جو وسطی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کو باہم منسلک کرتے ہیں۔ پرتگیزیوں کی طرف سے بلوچ ساحلی علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں اس لیے ناکامی کا شکار ہوگئیں کیوں کہ انہیں خلیج فارس میں یورپی طاقتوں کے علاوہ ترکی کی سلطنت عثمانیہ اور مغل ہندوستان کی طرف سے مزاحمت اور مخالفت کا سامنا تھا۔ بلوچستان کو سامراجیت کے تحت اپنا محکوم بنانے، نوآبادی کے طور پر اس کا استحصال کرنے اور وسطی ایشیا کے علاوہ خلیج فارس میں شکاری کی حیثیت سے داخل ہونے کے لیے ایک فوجی اور سیاسی مچان کے حصول کی برطانویوں کی طرف سے کئی کامیاب کوششیں کی گئیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر برطانوی حکمت عملی، مندرجہ ذیل چار مراحل پر مشتمل رہی:

(i) 1795-1838ء — جاسوسی، علاقائی جائزہ اور سفارتی سازشیں

(ii) 1838-1841ء — بلوچستان، بطور افغانستان کی ایک بفر ریاست

(iii) 1841-1893ء — بلوچستان، بطور ایک بفر ریاست، ایک خودمختار حلیف

(iv) 1894-1947ء — بلوچستان، ہندوستان کا ایک حصہ

بلوچستان کے متعلق برطانوی پالیسی کے پہلے مرحلے کا آغاز ''فرانسیسی خطرے'' کا مقابلہ کرنے کے لے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ برطانوی ہند کی سرحدیں، افغانستان کے زمان شاہ (اس کے فوجی حلیف میر محمود اوّل، خان آف بلوچستان سمیت) اور

Scanned by CamScanner

ٹیپو سلطان جیسے حملہ آوروں کی رسائی سے کہیں باہر تھیں اور یہ دونوں حکمران، فرانسیسیوں کے دوست تھے۔ اس کے علاوہ، ممکنہ حملہ آوروں اور برطانوی ہند کے درمیان اودھ، دہلی، سندھ، بلوچستان، ایران اور عثمانی ترکی جیسی کئی ایک ریاستیں موجود تھیں۔

مارکوئیس کورنوالیس کے حکم پر ہندوستان کی برطانوی حکومت نے غلام سرور نامی ایک جاسوس کو مستند معلومات کے حصول کی خاطر بلوچستان اور افغانستان بھیجا۔ غلام سرور 10 مارچ 1793ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوا اور اس کی واپسی 12 فروری 1795ء کو ہوئی۔ اسے خفیہ معلومات حاصل کرنے کے انعام کے طور پر برطانوی حکومت نے -/14,500 روپے دیئے جب کہ اس نے محض -/3,305 روپے خرچ کیے۔ اس کی خفیہ معلومات کو گورنر جنرل سر جان شور نے جولائی 1797ء میں بلوچستان اور افغانستان کی حکومتوں کے متعلق بہترین قابل دستیاب معلومات قرار دیا۔[1]

دوسری برطانوی خفیہ مہم 10-1809ء میں بھجوائی گئی۔ اس مہم کے ارکان کیپٹن گرانٹ (Captain Grant)، لیفٹیننٹ پوٹنگر (Lieutenant Pottinger) اور کیپٹن کرسٹی (Captain Christie) پر مشتمل تھے۔ گرانٹ کو مکران کے بلوچ ساحل کے متعلق معلومات جمع کرنے پر مامور کیا گیا۔

لیفٹیننٹ پوٹنگر نے ایک ''حاجی'' اور ''گھوڑوں کے سوداگر'' کی حیثیت سے بلوچستان اور سندھ کا سفر کیا جب کہ کیپٹن کرسٹی نے ''سید'' کی حیثیت سے سیستان کا سفر کیا تا کہ آئندہ برطانوی توسیع پسندانہ حکمت عملی کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ 1831ء اور 1833ء کے درمیان الیگزینڈر برنز (Alexander Bruns) نے دریائے سندھ میں جہاز رانی کے قابل عمل ہونے کے متعلق معلوم کرنے کے لیے ڈیرہ جاٹ اور افغانستان کا سفر کیا۔ میسن (Masson) نے 1830ء میں بلوچستان کا سفر کیا؛ لیچ (Leach) اور برنز (Burns) نے 1838ء میں بلوچستان کا سفر کیا اور بالآخر 1839ء میں خانیت کے تجارتی راستوں اور فوجی طاقت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خاطر آوتر ام نے سفر کیا۔ برطانیوں نے عذر یہ دیا کہ یہ مہمات ہندوستان کو درپیش روسی خطرے کا سدباب کرنے کے لیے روانہ کی گئیں۔ بہرحال، ہندوستان پر حملہ، روس کے بس سے باہر تھا اور برطانویوں نے اس بہانے کو استعمال کیا۔ برطانویوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ اپنی سلطنت کو وسیع کیا جائے، نیز وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے باشندوں کے استحصال کے ذریعے کثیر فوائد حاصل کیے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے اپنے اہلکار بھیجے اور بلوچستان و افغانستان کے خلاف ایران اور سکھ پنجابیوں کے ساتھ معاہدے کیے۔ 1809ء میں

Scanned by CamScanner

انہوں نے افغانستان کے خلاف ایران کی حمایت کی اور ڈیرہ جاٹ اور دجل رہرند صوبوں (خانیت) کے بلوچ علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے سکھوں کو فوجی کارروائی کی کھلی اجازت دے دی۔

بلوچستان، افغانستان کی بفر ریاست کا بطور ایک حصہ

1832ء کے اواخر میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے تجارت اور جہاز رانی کے لیے دریائے سندھ کو کھولنے کا منصوبہ تیار کیا۔ برطانویوں نے سندھ کی بلوچ افواج اور پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے۔ اس مقصد کے لیے برطانوی حکومت نے اپنے سفیر کیپٹن برنز کے ذریعے امیر دوست محمد سے رابطہ کیا۔ لیکن برنز[2] کی یہ مہم اس لیے ناکام ہوگئی کہ کابل نے برطانوی حکومت کے حلیف سکھوں کے خلاف پشاور پر اپنا دعویٰ کر رکھا تھا۔ کابل میں برطانوی سفیر کی ناکامی کے باعث ہندوستان کی برطانوی حکومت، پنجاب کے رنجیت سنگھ اور افغانستان کے شاہ شجاع (ایک جلاوطن بادشاہ جو لدھیانہ (برطانوی ہند) میں رہائش پذیر تھا) کے درمیان سہ فریقی معاہدہ طے پایا۔[3]

سہ فریقی معاہدے کے مطابق شاہ شجاع، کابل اور قندھار پر دوبارہ قبضے کے بعد پشاور کا افغانی صوبہ، پنجاب کے سکھوں کے حوالے کرنے اور رنجیت سنگھ کو خراج دینے پر رضامند ہوگیا۔ شاہ نے برطانوی حکومت کے دشمنوں کے خلاف اس کا اتحادی بننے کی حامی بھر لی، نیز اس نے خارجہ معاملات کے نمٹنے کے حوالے سے برطانویوں کا تسلط بھی قبول کر لیا۔

اس کے عوض، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور برطانوی حکومت، شاہ شجاع کی کابل میں اپنے شاہی تخت کی اپنی خواہش کی دوبارہ واپسی کے ضمن میں اس کی مدد کرنے پر رضامند ہوگئے۔ 1839ء میں برطانوی حکومت نے ایک بڑی فوج تیار کی، جسے سندھ کی فوج کہا جاتا ہے، تاکہ شاہ شجاع کی طرف سے افغانستان پر قبضہ کیا جائے۔[4]

قلات اور پہلی افغان جنگ

حملے سے قبل، برنز (Burns) سفیر کی حیثیت سے بلوچستان کے خان میر مہراب خان کے پاس بھیجا گیا۔ برنز نے اپنی بیماری کے باعث قلات (خانیت کا دارالحکومت) کا دورہ نہیں کیا اور اپنے نائب لیفٹیننٹ لیچ (Lt.Leach) کو بھیج دیا، یہ پہلا برطانوی تھا جس نے بلوچ اور بروہی زبانیں سیکھیں۔ بہرحال لیچ، خان کے ساتھ کوئی معاہدے طے کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔[5] مہراب خان نے بغیر کسی روک ٹوک کے راستہ دینے کے عوض مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے:۔

Scanned by CamScanner

1. ڈیرہ جاٹ اور دجل/ہرند جن پر پنجابی سکھوں نے قبضہ کر رکھا ہے، ان کی بازیابی کے لیے برطانوی حمایت۔
2. کراچی کی بندرگاہ کی بازیابی جس پر سندھ کے امیروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

ان مطالبوں کے علاوہ مہراب نے برطانویوں کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا کہ اسے اپنی ریاست کو افغانستان کی زیر تسلط ریاست تسلیم کر لینا چاہیے، نیز اس نے برطانویوں کا یہ مطالبہ بھی ٹھکرا دیا کہ بلوچ، افغانستان کے اندرونی معاملات کے حوالے سے شجاع کی حمایت کریں۔[6]

مارچ 1839ء میں سر الیگزینڈر برنز، خان کے دربار میں معاہدے کے مسودے کے ساتھ خان کی طرف سے توثیق کے لیے پہنچا۔ معاہدے کے مسودے کے مطابق، خان کو شاہ کی برتری تسلیم کرنی تھی جس کے ثبوت کے طور پر اسے بلوچستان کے راستے قندھار جاتے ہوئے شاہ کے پڑاؤ پر حاضری دینی تھی۔ خان کو یہ ذمہ داری بھی دی گئی تھی کہ وہ سندھ کی فوج کی پیش قدمی کے دوران اسے فوجی ساز و سامان فراہم کرے اور اپنی رعایا کے حملوں سے برطانوی رسد کو تحفظ فراہم کرے۔ اس کے عوض، خان کو سالانہ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کی امدادی رقم دینے کا وعدہ کیا گیا۔

مہراب خان نے ایک بار پھر محکوم ریاست کی حیثیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے برطانویوں کو خبردار کیا کہ وہ شجاع جیسے غیر مقبول بادشاہ کی مدد نہ کریں۔[7] شجاع کے افغانستان میں موجود برطانوی سفیر میکناٹن (Macnaghaten) نے شجاع کے پڑاؤ میں نواز کی موجودگی کی اطلاع خان کو دی۔ نواز ایک مخالف اور قلات کے تخت کا دعوے دار تھا۔ میکناٹن نے اس کے متعلق خان کو لکھے گئے ایک خط میں تنبیہ کرتے ہوئے لکھا: ''عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔'' اس کے علاوہ اس نے ساز و سامان، ذرائع نقل و حمل کی فراہمی اور خان کی طرف سے شجاع کی خود مختاری کو تسلیم کرنے کے عوض سالانہ دس ہزار پاؤنڈ دینے کا وعدہ کیا۔ برنز نے یہ رقم پندرہ ہزار پاؤنڈ تک بڑھا دی لیکن ناکام رہا۔ مہراب خان نے بلوچستان کی خود مختاری اور آزادی پر سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا۔[8]

برنز نے خان کو یہ یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ اس کے ملک پر شجاع قبضہ نہیں کرے گا، نیز اس نے خان کو شجاع کے پاس سرکاری دورے پر آنے کی دعوت دی۔ حالاں کہ برنز نے خان کو یقین دہانی کرائی تھی کہ اس کے دورے کو ایک محکوم حکمران کا دورہ نہیں سمجھا جائے گا لیکن مہراب خان نے کبھی یہ دورہ نہیں کیا۔

Scanned by CamScanner

مارچ میں میکناٹن نے مہراب خان کو کمزور کرنے اور افغانستان تک محفوظ راستہ حاصل کرنے کی خاطر بلوچستان کی تقسیم کی تجویز پیش کی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ وہ تین صوبے سندھ کی فوج کے راستے پر واقع ہیں، یعنی شال (کوئٹہ)، مستونگ اور کراچی کا افغانستان کے ساتھ الحاق کر دیا جائے جب کہ افغانستان میں شجاع کی فتح تک خان کی آخری سزا مؤخر کر دی گئی۔

بالآخر برنز نے خان کو سالانہ 1,50,000 روپے کی رقم لینے کے عوض برطانوی رسد کے لیے محفوظ راستہ دینے کے لیے رضامند کر ہی لیا۔[9] مہراب خان اس حقیقت کے باوجود اپنے الفاظ پر قائم رہا کہ جب سندھ کی فوج نے شجاع کو واپس لانے کے لیے پیش قدمی کی تو انہوں نے بلوچستان میں فصلیں تباہ کر دیں جو پہلے ہی پانی کی کمی کے باعث اس برس کم ہوئی تھیں۔ میر مہراب خان نے سندھ کی فوج کو فصلوں کی آبپاشی کے لیے قیمتی پانی دیا۔ اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق اس دَور میں جب بہت سے سردار بغاوت پر آمادہ تھے، اس نے برطانوی فوج کو محفوظ راستہ دیا حالانکہ وہ روسیوں اور ایرانیوں یا وہ افغانستان کے امیر دوست محمد کے ساتھ اتحاد کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ سندھ کے بلوچ امیروں، خاص طور پر سندھ میں ریاست حیدرآباد نے برطانویوں کے خلاف اتحاد تشکیل دینے کے لیے رابطہ کیا تھا۔ 25 جون 1839ء کو بیل (Bell) اور سندھ میں برطانوی سیاسی افسر نے اس امر کی تصدیق کی کہ اگر خان کو میدانِ جنگ میں لایا جاتا تو حیدرآباد کے امیر فوراً اس کی مدد کو پہنچ جاتے۔[10]

بہرحال، مہراب خان اور برطانوی حکومت کے درمیان تعلقات اس وقت خراب ہو گئے جب برنز کے پڑاؤ پر اس وقت حملہ کیا گیا جب کہ میکناٹن سے ملنے جا رہا تھا۔ وہ معاہدہ جس پر خان کو دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا، اس کے پڑاؤ سے چوری ہو گیا جس کے لیے برطانویوں نے خان کو فوراً ہی موردِ الزام ٹھہرا دیا۔[11]

برنز کے پڑاؤ پر حملہ درحقیقت وزیر (وزیراعظم) ملا محمد حسن کی ذمہ داری تھی۔ ملا محمد کے باپ، فتح محمد کو 1833ء میں مہراب خان کے حکم سے ہلاک کر دیا گیا تھا اور اب ملا محمد کو انتقام لینے کا موقع حاصل ہو گیا تھا۔ وہ خان کے سفیر کی حیثیت سے میکناٹن کے پاس پہنچا اور اسے یہ اطلاع دی کہ وہ خود تو برطانویوں کا دوست اور شجاع کا وفادار حامی ہے اور خان ہی ان کا دشمن ہے۔ قلات واپسی پر اس نے اپنے آقا، مہراب خان کو بتایا کہ برطانوی اور شجاع، اسے اور اس کے ملک کو تباہ کرنے کے لیے متحد ہو چکے ہیں۔ بعدازاں اس نے بلوچ قبائلیوں کو لکھے گئے خطوط پر شاہی مہر ثبت کی جس میں کہا گیا تھا کہ

Scanned by CamScanner

جیسے ہی برطانوی فوج، بلوچستان سے گزرے، اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ان میں سے کچھ خطوط برطانویوں کے ہاتھ لگ گئے جنہیں انہوں نے برطانویوں کے خلاف خان کی دشمنی پر محمول کیا۔

بہرحال، برنز کے پڑاؤ پر حملہ اور دیگر جارحانہ کارروائیاں، ملا محمد حسین کی سازشوں کا نتیجہ تھیں۔ یہ ملا محمد ہی تھا جس نے خان کو اس امر پر قائل کیا کہ اگر وہ شجاع اور میکناٹن سے ملاقات کرنے کے لیے گیا تو اسے برطانوی گرفتار کرلیں گے۔ بہرحال، برطانویوں نے خان کا ذمہ دار ٹھہرایا اور شجاع کی طرف سے افغانستان کی فتح کے بعد خان کو سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ شجاع نے ایک معاہدے کے ذریعے برطانویوں سے یہ اتفاق کیا تھا کہ مہراب خان اور اس کے ملک کو تباہ کردینا چاہیے۔[12]

قلات کا محاصرہ

جب مہراب خان، برطانویوں سے لڑتے لڑتے اپنی جان گنوا بیٹھا تو انہیں معلوم ہوا کہ مہراب بے گناہ تھا اور وہ اپنے وعدے پر قائم تھا۔ شاہی تحریروں اور مسودوں کی تلاش کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ ملا محمد حسن نے خان کی طرف سے قبائلیوں کو خفیہ خط لکھے تھے جن میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ برطانوی فوج پر حملہ کریں جب کہ اس نے برطانویوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ بجائے اس کے کہ برطانوی، مہراب خاں کے خاندان کو کوئی معاوضہ ادا کرتے یا قلات کے محل سے لوٹا ہوا ساز و سامان ہی واپس کرتے، انہوں نے تخت کے ایک حریف دعوے دار شاہ نواز، میر مہابت خان کے بیٹے کو خان نامزد کردیا۔[13]

خانیت کی تقسیم اور بغاوت

قلات کے تخت پر خان کی حیثیت سے براجمان ہونے کے عوض شاہ نواز، خانیت کے انتہائی دولت منداور زرخیز صوبے، شال (کوئٹہ)، کچھی اور مستونگ، شجاع کے حوالے کرنے پر رضامند ہوگیا۔

بلوچستان کی تقسیم کے باعث بلوچ قبائلیوں نے میر مہراب خان کے بیٹے، میر ناصر خان دوم کی قیادت میں برطانویوں اور شاہ نواز کے خلاف بغاوت کردی جس نے قلات سے فرار ہوکر قلات کے مغرب میں واقع خانیت کے ایک صحرائی صوبے خاران کے امیر سردار ایزد خان کے پاس پناہ حاصل کرلی تھی۔[14]

قلات کے محاصرے اور بلوچستان کی تقسیم کے نتیجے میں بلوچستان میں ہونے والی بغاوت اس قدر شدید تھی کہ برطانوی سیاسی افسر لوئیڈے (Loveday) کے علاوہ برطانوی فوجیوں کو قتل کردیا گیا اور شاہ نواز، برطانوی ہند فرار ہوگیا۔ بالآخر 15 اکتوبر 1841ء کو ناصر خان دوم اور برطانوی حکومت کی

Scanned by CamScanner

طرف سے جیمز اوترام (James Outram) کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدے کے تحت ناصر خان دوم کو بلوچستان کا خان تسلیم کر لیا گیا اور اس کے عوض، ناصر خان نے شجاع اور برطانویوں کے ایک محکوم کی حیثیت قبول کر لی۔ عالی جناب شاہ شجاع الملک کی مہربانی سے خانیت کوکچھی اور مستونگ واپس کر دیئے گئے۔ کچھ عرصے بعد شال (کوئٹہ) بھی ناصر خان دوم کو واپس کر دیا گیا۔[16]

پہلی افغان جنگ کے نتائج

1842ء میں شاہ شجاع کے قتل اور کابل میں برطانوی فوج کے مکمل صفایا کے ساتھ ہی برطانوی پالیسی ناکام ہوگئی۔ لارڈ ایلنبورو (Lord Ellenborough) نے بلوچستان کے امور کے ناظم ،اوترم کو ہدایت کی کہ خان کو مطلع کیا جائے کہ 1841ء کا معاہدہ منسوخ ہو چکا ہے لیکن بلوچستان کے حوالے سے دوستی اور عدم مداخلت پر مبنی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔

بلوچستان اور افغانستان میں شکست کے بعد، برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان ممالک کی طرف سے مکمل طور پر توجہ ہٹالی جائے۔ اس کی بجائے انہوں نے سندھ اور پنجاب کے متعلق ایک "Forward Policy" اختیار کی۔

سندھ کی تجارتی اور سٹریٹجک اہمیت کے پیش نظر لارڈ ایلنبورو (Lord Ellenborough) کی حکومت نے اس پر قبضہ کر لیا۔ سندھ میں ایلنبورو کی پالیسی کے ایجنٹ، نیپیئر (Napier) نے سندھ کے امیروں کے متعلق جارحانہ پالیسی اپنائی جس کے تحت مطالبہ کیا گیا ہے کہ کراچی، سکھر، بھکر اور شکارپور کے علاقوں کو ان کے قبضے میں دے دیا جائے۔ نیپیئر کی اس پالیسی نے حیدرآباد کے امیروں کو فروری 1843ء کی جنگِ میانی میں برطانویوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ 26 مارچ 1843ء کی جنگ میں میرپور کے امیر شیر محمد کو شکست ہوئی اور خیرپور کے امیر نے نیپیئر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ 1843ء کے اواخر تک برطانوی ہند کے ساتھ سندھ کا انضمام مکمل ہو چکا تھا۔ سندھ کی فتح کے ذریعے برطانویوں کو اب براہ راست بلوچستان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سندھ کے برطانوی ہند کے ساتھ الحاق کے باعث برطانویوں کو بلوچستان اور افغانستان کی جنگوں میں اٹھائے جانے والے نقصان کی تلافی کا موقع میسر ہوا۔[17]

برطانویوں کی "Forward Policy" کا ہدف پنجاب تھا جو پہلی افغان جنگ کا حلیف تھا۔ یہ ادراک کر لیا گیا تھا کہ کابل پہنچنے کے لیے بولان کا راستہ (بلوچستان) ایک طویل اور مشکل علاقہ ہے۔

Scanned by CamScanner

درحقیقت، درۂ بولان صرف کوئٹہ، قندھار اور سیستان پر حملہ کرنے کے لیے ہی مناسب تھا۔ کابل پہنچنے کے لیے براستہ پشاور اور درۂ خیبر سے جلال آباد، پنجاب کا راستہ کہیں زیادہ مختصر اور قابل عبور تھا۔ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد پنجاب افراتفری اور انتشار کا شکار ہوگیا۔ 1846-1842 سے ہی برطانوی حکومت اس حوالے سے عدم اتفاق کا شکار تھی کہ پنجاب کے متعلق کون سی پالیسی اختیار کی جائے۔ کلرکس (Clerks) کے حامیوں کا موقف تھا کہ پنجاب کو ایک بفرسٹیٹ بنایا جائے جب کہ میکناٹن کے حامیوں کا موقف تھا کہ افغانستان کو بفرسٹیٹ بنایا جائے اور پھر پنجاب پر قبضہ کیا جائے، نیز پنجاب کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے ذریعے تبت، افغانستان اور بلوچستان کے متعلق سکھوں کے توسیع پسندانہ عزائم کی روک تھام کی جائے۔ یہ مسئلہ 1846/47ء میں اس وقت حل ہوگیا جب پنجاب کی صورتِ حال کے باعث برطانوی حکومت نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔[18] برطانوی ہند کے ساتھ پنجاب کے الحاق کے باعث برطانویوں کا افغانستان کے ساتھ براہ راست رابطہ ہوگیا۔

بلوچستان، بطور بفر ریاست اور خودمختار حلیف

بلوچستان اور افغانستان (42-1841ء) میں برطانوی فوج کی شکست کے بعد برطانویوں نے جنوب مغربی ایشیائی ریاستوں کے حوالے سے عدم مداخلت پر مبنی پالیسی اختیار کرلی۔ عدم مداخلت کی پالیسی اور ڈیرہ جاٹ میں بلوچوں اور سکھوں کے درمیان عداوت کے باعث برطانوی 48-1847ء میں سکھوں کے خلاف بلوچ قبائل کی حمایت کے حصول میں کامیاب ہوگئے۔ بلوچ قبائلی روایات کے مطابق ڈیرہ جاٹ کے بلوچ قبائل نے خان، میر ناصر دوم کی اپیل پر برطانویوں کے ساتھ تعاون کیا۔

حکومت قلات کے دوستانہ طرزِ عمل کے باعث برطانوی حکومت نے ناصر خان دوم کے ساتھ دوستی کا معاہدہ طے کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تجویز عدم مداخلت کے حامیوں کی مخالفت کے باعث واپس لے لی گئی۔ 1854ء میں برطانوی حکومت کا ناصر خان دوم کے ساتھ ایک معاہدہ طے پا گیا تاکہ بلوچستان کے متعلق جنوب مغربی ایشیا میں روسی خطرے اور ایرانی توسیع پسندانہ پالیسی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ 1854ء کے معاہدے کے تحت خان کو ایک خودمختار حکمران تسلیم کرلیا گیا اور یوں خان کو برطانویوں کے دشمنوں کی مخالفت پر مجبور ہونا پڑا۔ اسے ہمسایہ دوست ریاستوں سے معاملات طے کرنے اور براستہ بلوچستان وسطی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا کی برطانوی تجارت کی حفاظت کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اس کے عوض، برطانوی حکومت سالانہ امداد کے طور پر -/50,000 روپے اور بیرونی

Scanned by CamScanner

حملے کی صورت میں فوجی امداد دینے پر رضامند ہوگئی۔ ناصر خان دوم کے ساتھ یہ معاہدہ بالائی سندھ کے سیاسی ایجنٹ اور بلوچ امور کے ناظم، جنرل جان جیکب (General John Jacob) نے کیا۔[19]

1843ء میں برطانوی ہند کی سرحدیں بلوچستان کی مشرقی سرحدوں تک پھیل گئیں۔ امارتِ سندھ کی فتح کے ساتھ 1876ء تک اینگلو بلوچ تعلقات کے انعقاد سندھی حکام کی ذمہ داری بن چکے تھے۔ 1872ء میں بلوچستان کے متعلق پالیسی کے حوالے سے سندھ اور پنجاب کے افسروں کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ اس ضمن میں دو مخالف نکتہ ہائے نظر یہ تھے:

(1) عدم مداخلت کی پالیسی

(2) فارورڈ پالیسی

1840ء میں بلوچستان میں برطانویوں کی شکست کے بعد برطانویوں نے بلوچستان میں بلوچ امور کے حوالے سے عدم مداخلت کی پالیسی اپنا لی۔ 1854ء کے معاہدے کے تحت انہوں نے خان کو ایک خودمختار حکمران تسلیم کرلیا اور ملک کے فوجی اور سیاسی اداروں کی تنظیم نو کے لیے خان کو مالی امداد مہیا کی تاکہ قبیلوں پر خان کی عملداری زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو سکے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مضبوط اور طاقت ور خودمختار بلوچستان، وسطی ایشیا میں برطانوی تجارت کے لیے مفید ثابت ہوگا، نیز برطانوی، برطانوی ہند میں بلوچ قبائل کی برطانویوں کے خلاف دخل اندازی کے خلاف بھی کڑی نظر رکھ سکیں گے۔ ناصر خان دوم نے برطانویوں کے ساتھ تعاون پر مبنی پالیسی اپنائی حالانکہ اس کا وزیراعظم گل محمد (میر مہراب خان کا پرانا خادم) اس کی اس دوستانہ پالیسی کا مخالف تھا جس نے اپنے آقا کے قتل کے لیے برطانویوں کو معاف نہیں کیا تھا۔ 1858ء میں ناصر خان دوم اور بالائی سندھ اور بلوچ امور کا نگران، سندھ کا کمشنر جنرل جان جیکب، دونوں انتقال کر گئے۔ قلات میں، ناصر خان دوم کے چھوٹے بھائی، میر خداداد خان کو خان منتخب کرلیا گیا، اس انتخاب کو برطانویوں کی حمایت حاصل تھی۔ 1858ء میں برطانویوں نے باغی سرداروں، خاران کے ایزد خان، بیلہ کے جام اور مری قبیلوں کے خلاف خان کی مدد کی۔ 1858ء سے 1868ء تک قلات کے امور کا انتظام وانصرام سر ایچ گرین (Sir H.Green) کے ہاتھ میں تھا جو خان کو خانیت کا مطلق العنان بادشاہ سمجھتا تھا۔ اس نے خان کو کہا کہ وہ اپنے والد کی مانند اپنی عملداری کو دوبارہ قائم کرے، جس طرح اس کے والد نے بلوچستان پر اپنی عملداری دوبارہ قائم کی تھی۔ اس نے خان کو بتایا کہ اگر اس نے مغربی بلوچستان میں ایرانی پیش قدمی کا تدارک نہ کیا تو مکران کا علاقہ

Scanned by CamScanner

جلد ہی ہاتھ سے نکل جائے گا۔[20] اس نے یہ موقف بھی اختیار کیا کہ وسطی ایشیا یا جنوب مغربی ایشیا کی طرف سے برطانوی ہند کے لیے دشمن خطرہ بن سکتا ہے، اس کے علاوہ ایرانی اومانی فارس کے لیے بھی دشمن خطرہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کی درخواست پر میر خداداد خان نے اپنے عملداری مستحکم کرنے کی خاطر مکران کا دورہ کیا۔ برطانوی حکومت کی مدد سے خان نے اپنی فوج کی دوبارہ تنظیم کی۔ درج ذیل گوشوارے میں 1860ء اور 1870ء کی دہائیوں میں خانیت کی فوج کی طاقت وقوت ظاہر کی گئی ہے۔

پہلا گوشوارہ: خانیت کی پیادہ فوج کی ڈویژن

عہدہ	تعداد	ماہانہ تنخواہ (روپے)	کل رقم (روپے)
کمانڈنٹ	1	50	50
لوکل افسر (i)	8	15 (فی افسر)	120
لوکل افسر (ii)	8	10 (فی افسر)	80
حوالدار	32	9	288
نائیک	32	7	224
سپاہی/فوجی	719	6	4314
کُل	800		5076

(50 فیصد فوجی بلوچ جب کہ بقیہ کرائے کے فوجی تھے۔ انہیں خان کے نجی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ یہ فوجی بخوبی نظم وضبط کے حامل تھے)۔

دوسرا گوشوارہ: خانیت کے محافظ

عہدہ	تعداد	ماہانہ تنخواہ (روپے)	کل رقم (روپے)
کمانڈنٹ	1	50	50
افسر (i)	4	15 (فی افسر)	60
افسر (ii)	4	10 (فی افسر)	40
حوالدار	16	9	144
نائیک	16	7	112
سپاہی	359	6	2154

Scanned by CamScanner

کُل	400		2560

(خان کے محافظوں کی اکثریت بلوچ تھی جن میں سے چند ایک پشتون بھی تھے۔ وہ سابقہ فوجی تھے جو کم از کم گزشتہ پانچ برس سے برطانوی فوج میں تھے اور بخوبی منظم تھے۔ ان کی تنخواہوں کی سالانہ لاگت 30,720/- روپے تھی)۔

تیسرا گوشوارہ: خانیت کا گھڑ سوار دستہ

عہدہ	تعداد	ماہانہ تنخواہ (روپے)	کُل رقم (روپے)
افسر (i)	2	30 (فی افسر)	60
افسر (ii)	2	18 (فی افسر)	36
افسر (iii)	2	12 (فی افسر)	24
دفعہدار	8	10	80
نائیک	8	8	64
سوار	178	7	1246
کُل	200		1510

(یہ ہندوستانی تھے جن میں سکھ بھی شامل تھے۔ یہ برطانوی سندھ ہاؤس سے ریٹائر شدہ سوار تھے اور نظم وضبط کے انتہائی پابند تھے۔ ان کی تنخواہ کی سالانہ لاگت 18,120/- روپے تھی)۔

چوتھا گوشوارہ: خانیت کا توپ خانہ

عہدہ	تعداد	ماہانہ تنخواہ (روپے)	کل رقم (روپے)	سالانہ (روپے)
لوکل افسر (i)	1	20	20	
لوکل افسر (ii)	2	15 (فی افسر)	30	4650/-
ہندوستانی فوجی	25	4.50	112.50	
بلوچ فوجی	50	4.50	225	
کُل	78		387.50	

ایک منظم فوج کی مدد سے خان نے سرداروں کی طاقت کا سدباب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ان تمام سرداروں کی جاگیریں ضبط کرنے کا فیصلہ کیا جو 1939ء میں میر مہراب خان کی مدد کرنے

Scanned by CamScanner

میں ناکام ہوگئے تھے، نیز اس نے وہ تمام کھیت بھی ضبط کرنے کا فیصلہ کیا جو سرداروں نے بغیر "فرمان" (شاہی فرمان) کے حاصل کیے تھے۔[21] خان کی اس کارروائی کے باعث قبائلی سرداروں میں بے چینی پیدا ہوگئی اور بالآخر خان اور اس کے سرداروں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔[22] باغیوں سرداروں کے خلاف برطانویوں نے خان کی مدد کی۔ مزید برآں سندھ کے کمشنر نے بالائی سندھی سرحد کے سیاسی ناظم کرنل فیئر (Col.Phayre) کو یوں ہدایات دیں: "جب تک خانِ قلات کی آزاد اور خودمختار حیثیت قائم رہتی ہے، اس وقت تک ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس کے ملک میں اس کی طاقت کو مزید تقویت بخشیں۔" اپنے طویل خط میں کمشنر نے لکھا: "جب تک قلات کی ریاست ایک واحد خان کے ہاتھ میں ہے اور اس وقت جب کہ وہ برطانوی حکومت کی خواہشات کے مطابق عمل پیرا ہے، تو ہمیں شمال سے جنوب کی جانب اپنی سرحدوں کے متعلق فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب اس کی طاقت ختم ہو جائے اور ملک ان بے شمار معمولی سرداروں کے ہاتھوں میں چلا جائے جن کا اپنی رعایا پر بہت کم اثر ہو۔[22]

کمشنر کرنل سر ڈبلیو ایل میریویدر نے حکومت ہند کو خان کی آئینی حیثیت سے بھی مطلع کیا: "عالی جناب خان، اس ملک کا عملاً حکمران ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ معاہدے کیے ہیں جن کے تحت وہ اپنی رعایا کے ذریعے ہمیں کسی بھی قسم کا نقصان نہ پہنچائے جانے اور تجارت کو تحفظ دینے کا پابند ہے۔ لیکن ہمارا اس کے ساتھ معاہدہ صرف بطور حکمران ہے اور ہم کسی بھی طرح اس کے طرزِ حکمرانی میں مداخلت نہیں کر سکتے۔"[23] سر برٹل فریئر (Sir Bartle Frere) نے "سندھی" اندازِ فکر اور موقف کو یوں واضح کیا: "یہ ہمارا انتہائی اہم اصول تھا کہ ہم خان کی مختاری کو نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش نہ کریں۔ خان، ہمارا آزاد اور خودمختار حلیف سمجھا جاتا تھا جسے اپنے اندرونی معاملات طے کرنے کے ضمن میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ تھی لیکن جہاں تک خارجی معاملات کا تعلق ہے، وہ برطانوی حکومت کے زیرِ تسلط ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا، ہم نے خان کے ساتھ عین اسی طرح معاملات طے کیے، جس طرح ہم نے بلجیم یا سوئٹزرلینڈ کے ساتھ کرتے۔"[24] کرنل سر ڈبلیو ایل میریویدر کے ماتحت کی طرف سے اس کی پالیسی کی مخالفت کی گئی۔

کرنل فیئر (Col.Phayre) نے حکام کو لکھا کہ اب وقت آچکا ہے کہ بلوچستان کے متعلق برطانوی پالیسی پر از سرِ نو غور کیا جائے تاکہ باغی سرداروں کے خدشات دُور کیے جائیں۔ "خانِ قلات ایک مطلق العنان اور خودمختار حکمران نہیں تھا بلکہ محض سرداروں کے ایک وفاق کا سربراہ تھا اور ناصر خان

Scanned by CamScanner

اوّل کے غیر تحریری آئین کا پابند تھا۔ لیکن موجودہ خان نے اپنے تمام عہد حکومت میں آئینی شکل کی حکومت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک اس کے موجودہ طرزِ عمل کا تعلق ہے، اس نے سرداروں کی ناراضی ہی مول لی ہے۔۔۔ اگر خان کو برطانوی مدد حاصل نہ ہو تو فوراً ہی اس کی حکمرانی کا تختہ الٹا جا سکتا ہے۔۔۔ اس لحاظ سے درحقیقت برطانوی حکومت نے ہی اس کے تخت کو سہارا دے رکھا ہے اور یوں اب یہ برطانوی حکومت کا فرض بنتا ہے کہ اس اور اس سے ناراض سرداروں کے درمیان انصاف پر مبنی حکمت عملی اپنائی جائے۔ برطانوی حکومت کے اس فرض سے قطع نظر، سردار اس وقت اتنے طاقت ور ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے۔"[25] اس نے حکومت کو خبردار کیا کہ بلوچستان میں خانہ جنگی برطانوی مفادات کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

فیئر (Phayre) کے افسر میریویدر نے اس کے خیالات سننے کی بجائے اسے ایک خط لکھا جس میں اسے شدید جھاڑ پلائی، "ممکن ہے کہ خان وفاق کا برائے نام حکمران ہو لیکن درحقیقت وہ ایک خودمختار شہزادہ ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو، وہ وہی واحد شخص ہے جس کے ساتھ ہمیں معاملات طے کرنے ہیں۔ جہاں تک 1854ء کے معاہدے کا تعلق ہے، یہ معاہدہ صرف اسی کے ساتھ ہوا۔ نیز ہمیں اس اور اس کے زیر تسلط سرداروں کے درمیان مداخلت کا قطعی کوئی حق نہیں۔ ممکن ہے کہ خان ایک اچھا حکمران نہ ہو، لیکن اس نے معاہدے کی تمام شرائط کی پابندی کرنے کی اپنی بساط بھر کوشش کی ہے اور اس کی طرف سے ایک معیاری فوج تیار کرنے کے ضمن ہمیں تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان اس وقت ایک ایسے دَور سے گزر رہا ہے جب ایک اچھی حکومت کی ترقی کے دَور میں جاگیردارانہ ادارے، مرکزی قوت کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔ ہماری پالیسی خان کے ملک کو کمزور کرنے کی بجائے اسے مضبوط کرنے پر مبنی ہونی چاہیے۔ اب سب سے اہم امر یہ ہے کہ ہمیں باغی سرداروں کے نمائندوں کی باتیں سننے سے محتاط انداز میں احتراز برتنا چاہیے اور ان کے کہنے پر مداخلت کرنے کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہیے جب تک کہ وہ خود کو مکمل طور پر اطاعت کے لیے تیار نہیں کر لیتے۔"[26]

پنجابی نقطۂ نظر

اس کے برعکس، 1866ء سے ڈیرہ غازی خان کے بلوچ ضلع میں پنجاب کے ایک سیاسی افسر کیپٹن سنڈیمن (Capt.Sandeman)، کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے بلوچ قبائل، پنجاب کی سرحد

Scanned by CamScanner

پر رہنے والے خان کے زیر تسلط سرداروں اور خانیت کے ساتھ رابطے میں تھا۔ سنڈیمن نے ''فارورڈ پالیسی'' کی حمایت کی اور حکومت پنجاب کو عین کرنل فیئر کے الفاظ میں بلوچستان کے امور کے متعلق مطلع کیا اور تجویز پیش کی کہ بلوچ وفاق کے سربراہ (خان) اور اس کے سرداروں کے درمیان خانہ جنگی رکوانے کے لیے مداخلت کی جائے۔[27]

مٹھن کوٹ کانفرنس (1871ء)

لارڈ میو (Lord Mayo) کی حکومت نے حکومت پنجاب اور حکومت بمبئی کو ہدایت کی کہ ایک مضبوط مرکزی عملداری کے حامیوں اور فیڈریشن کے علاوہ بلوچستان کے اندرونی معاملات کے حامیوں کے درمیان اختلافات ختم کرانے کے لیے ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی جائے۔

مٹھن کوٹ (ڈیرہ غازی خان) میں 3 فروری 1871ء کو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر، ایچ ڈیویز (H.Davies) اور سندھ کے کمشنر میریویدر (سیاسی افسروں سمیت) کی سربراہی میں دونوں نقطہ ہائے نظر کے نمائندوں کے درمیان ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں اس امر کا متفقہ اظہار کیا گیا کہ بلوچستان کا نظام مکمل طور پر سندھ حکومت کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ انہوں نے درج ذیل سفارشات پیش کیں:[28]

(i) کیپٹن سنڈیمن یا ڈیرہ غازی خان کا ضلع، سرحدی سندھ کے سیاسی سپرنٹنڈنٹ کے احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

(ii) بلوچستان کے معاملات سرداروں کے ذریعے نہیں بلکہ خان کے ذریعے طے پانے چاہئیں۔ قبائلی گھڑسواروں کی بھرتی کے ذریعے تجارتی راستوں کے تحفظ کے ذریعے یہ مدنظر رکھتے ہوئے امن قائم کرنا چاہیے کہ خان کا اختیار مکمل طور پر قائم و برقرار رہے۔

(iii) بلوچ سرداروں کو تمام رقوم برطانوی حکومت کے نام پر نہیں بلکہ خان کے نام پر دینی چاہئیں۔

اکتوبر 1871ء میں حکومت ہند نے ایک قرارداد کے ذریعے ان سفارشات کی منظوری دی اور ''سندھیوں'' کی پالیسی کی حمایت کی جس کے تحت خان کو حکمران اعلیٰ تسلیم کیا گیا تھا اور سرداروں کو وفاق کے فریقین کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔[29]

خان کی مرکزی حکومت کے متعلق سرکاری برطانوی رپوٹ کے باعث خانہ جنگی شروع ہوگئی جو 1876ء تک جاری رہی۔ اس خانہ جنگی کے دوران، سرداروں نے درج ذیل مطالبات پیش کیے:[30]

Scanned by CamScanner

(i) ناصر خان اعظم کے آئین کو متعارف کرایا جائے۔

(ii) خانیت کی فوج ممنوع قرار دی جائے، نیز لشکر (قبائلی فوج) کی مدد کے لیے سرداروں کو بحال کیا جائے۔

(iii) قبائلی علاقوں میں خان کی طرف سے مداخلت بند کی جائے۔

(iv) خانیت کی غیر فوجی اور فوجی کونسلوں میں سرداروں کو نمائندگی دی جائے۔

(v) خان کو ایک مطلق العنان بادشاہ کی بجائے بلوچ وفاق کا سربراہ تسلیم کیا جائے۔

(vi) وزیر اعظم کا انتخاب سرداروں کے ذریعے ہونا چاہیے۔

خان نے ان تمام مطالبات کو مسترد کر دیا۔ ایک قوم پرست مصنف گل خان، کے نزدیک یہ مطالبات برطانوی سامراجیت کی تخلیق کا باعث تھے لیکن اس موقف کے حق میں کوئی تاریخی ثبوت میسر نہیں۔[31] درحقیقت، اس وقت برطانوی حکام مکمل طور پر خان سے متفق تھے۔

فارورڈ پالیسی یا ''پنجابی'' نقطۂ نظر

1848ء میں برطانویوں نے پنجاب کو برطانوی ہند میں شامل کر لیا، نیز ڈیرہ جات کے بلوچ اور پشتون علاقوں کے علاوہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ برطانوی انتظامیہ نے ڈیرہ جاٹ کے آزاد و خود مختار بلوچ قبائل کے امور میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ اگرچہ وہ خان کی رعایا تھے لیکن کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں رہنے والے قبیلوں پر خان کی عملداری بہت کمزور تھی۔ بلوچستان پر برطانوی حملے (40-1839) کے علاوہ، سندھ اور ڈیرہ جاٹ پر قبضے کے باعث کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے بلوچ قبیلوں میں بے چینی اور نفرت پیدا ہوگئی۔ بلوچوں میں برطانوی مخالف جذبات کے باعث دونوں فریقین میں جھڑپیں شروع ہوگئیں اور قبائلیوں نے ان علاقوں پر حملہ کر دیا جن پر برطانویوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ برطانویوں نے ان کارروائیوں کو ''ڈاکا'' یا ''چھاپا'' قرار دیا اور انہیں غیر سماجی کے علاوہ غیر مہذب بھی قرار دیا۔ بلوچ قبائل کی طرف سے سامراج مخالف کارروائیوں کے تدارک کے لیے پنجابی حکام نے پہاڑی قبیلوں کے ان ''چھاپوں'' کے متعلق سندھ انتظامیہ (قلات امور کی انتظام کار) کو لکھا اور مطالبہ کیا کہ خان کو ان کارروائیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ سندھ انتظامیہ نے پنجابیوں کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں بتایا کہ یہ قبیلے خان کے ''برائے نام محکوم'' ہیں۔[32] سندھیوں نے پنجابیوں کو مشورہ دیا کہ پنجاب کی سرحد پر رہنے والے باغی

Scanned by CamScanner

بلوچ قبیلوں کے خلاف طاقت استعمال کی جائے۔

1868ء میں سکاٹ لینڈ کے ایک باشندے، سنڈیمن کو ضلع ڈیرہ غازی خان کا سیاسی افسر مقرر کر دیا گیا۔ وہ بلوچستان میں ''فارورڈ پالیسی'' کا حامی تھا۔ ڈیرہ غازی خان میں اس کی عملداری کے دوران اس پر انکشاف ہوا کہ بلوچ قبیلوں کی تنظیم تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہے، نیز سرداروں کی عملداری اور اثر ورسوخ میں کمی آ رہی ہے اور دُور افتادہ مغربی علاقے میں خان اور اس کے وفاقی فریقین میں خانہ جنگی جاری ہے۔

ان حالات میں سنڈیمن نے سرداروں کو رشوت دینے پر مبنی ایک پالیسی اختیار کی تا کہ انہیں برطانوی حکومت کے تسلط میں لایا جائے۔ ڈیرہ جاٹ کے بلوچ قبائل میں اس کی یہ پالیسی بے حد کامیاب رہی۔ اس نے سرداروں کے درمیان رقوم اور جاگیریں بانٹ دیں تا کہ ان کی عملداری، منصب اور وقار قائم رہے۔ بعدازاں اس کی خواہش تھی کہ اس طریقے کا اطلاق بلوچستان پر بھی کیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ جب برطانویوں کی طرف سے سرداروں کو حمایت حاصل ہوگئی تو پھر امن وامان قائم ہو جائے گا۔[33] لیکن ''سندھیوں'' نے ان خیالات کو یکسر مسترد کر دیا۔

مٹھن کوٹ کی کانفرنس ''پنجابیوں'' کی شکست تھی جو ''فارورڈ پالیسی'' کے حامی تھے لیکن سنڈیمن کے نزدیک اس کا یہ موقف درست تھا۔ قلات میں مضبوط مرکز کی حمایت کے باوجود خانہ جنگی ختم نہ ہو سکی۔ 1875ء میں سنڈیمن، خان اور اس کے سرداروں کے درمیان ایک معاہدے کے ذریعے خانہ جنگی ختم کروانے کے لیے قلات گیا لیکن اس نے سندھ انتظامیہ کو اپنے اس اقدام سے آگاہ نہیں کیا۔ وکیل (جیکب آباد میں خان کے نمائندے) نے خان کو اس بارے میں مطلع کیا۔[34] خان نے سنڈیمن نے ساتھ معاملہ طے کرنے سے انکار کر دیا اور سنڈیمن کو آگاہ کیا کہ وہ کابل کے امیر اور شاہ ایران کی مانند بلوچستان کے ایک مطلق العنان حکمران کے طور پر آئینی حیثیت کا مالک ہے۔[35]

1876ء میں جب کہ ''سندھیوں'' اور ''پنجابیوں'' کے درمیان اختلاف ابھی جاری تھا، وہائٹ ہال (White Hall) میں ایک تبدیلی واقع ہوئی اور فارورڈ پالیسی کے حامی اقتدار میں آ گئے۔ بلوچستان اور افغانستان کے ساتھ برطانویوں کے تعلقات بہتر بنانے کی خاطر لارڈ لٹن (Lord Lytton) کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ اسی سال، سنڈیمن نے قلات کا دوبارہ دورہ کیا۔ اس نے خان کو یہ تاثر دیا کہ اب برطانوی حکومت خان کو بلوچستان کے ایک خودمختار حکمران کی

Scanned by CamScanner

بجائے وفاق بلوچستان کا سربراہ سمجھتی ہے۔ برطانوی طاقت سے خوف زدہ خان نے ''نظریہ وفاق'' کی مخالفت نہیں کی اور معاہدہ مستونگ 13 جولائی 1876ء کے تحت اپنے اور سرداروں کے درمیان جھگڑوں کے حوالے سے برطانوی ثالثی قبول کر لی۔[36] معاہدہ سے قبل، سنڈیمن نے دونوں فریقوں سے کہا کہ وہ ایک درخواست لکھیں جس میں برطانوی حکومت سے گزارش کی جائے کہ وہ ایک ''ثالث اعلیٰ'' کی حیثیت قبول کر لے۔[37] اس کا مقصد یہ تھا کہ لٹن انتظامیہ کو قائل کیا جائے کہ وہ خان کو وفاق کا سربراہ سمجھے۔ لٹن انتظامیہ نے سنڈیمن کی سرگرمیوں کی کہ اس بنا پر مخالفت کی بلوچستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت افغانستان کے امیروں کے درمیان شکوک پیدا کرے گی۔ لٹن، خان اور افغانستان کے امیروں کے ساتھ ایک ہی پالیسی اپنانا چاہتا تھا۔[38] اس کے علاوہ، لٹن نے خان سے ملاقات کے لیے جیکب آباد جانے اور ایک نیا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 8 دسمبر 1876ء کو خان اور وائسرائے نے ایک معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کی پہلی تین شقوں نے 1854ء کے معاہدے کی توثیق کر دی۔ اس معاہدے کے ذریعے خان کو ایک خودمختار حکمران تسلیم تو کر لیا گیا لیکن خارجہ امور کے لحاظ سے وہ برطانویوں کے ماتحت قرار پایا۔

دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے ساتھ نمائندوں کا تبادلہ کرنے پر رضامند ہو گئیں۔ خان نے برطانوی فوجیوں کو بلوچستان میں قیام کی اجازت دے دی۔[39] یہ معاہدہ ''پنجابیوں'' کے لیے ایک عظیم فتح تھی جو ''فارورڈ پالیسی'' اور سرداروں کے حمایتی تھے۔ درحقیقت، ''سندھیوں'' اور ''پنجابیوں''، دونوں نے بلوچستان پر قبضے کی حمایت کی۔ سندھیوں نے یہ امر نظرانداز کرتے ہوئے خان کی بطور خودمختار حکمران کی حمایت کی کہ ناصر خان اوّل کے غیر تحریری آئین کے تحت قبائلی صوبوں میں خان کو سرداروں کے منتخب سردار کا درجہ حاصل تھا۔ ''سندھیوں'' کی بے خبری بلوچستان میں مرکز پسندوں اور وفاق پسندوں کے درمیان خانہ جنگی کا باعث بن گئی۔ اس کے برعکس ''فارورڈ پالیسی'' کے حامی ''پنجابیوں'' نے خانیت میں براہ راست زیر انتظام صوبوں میں خان کی خودمختار اور مکمل حکومت کو نظرانداز کیا۔ ان کے نزدیک، خان، وفاق کا منتخب سربراہ تھا اور دیگر سردار قبائلی علاقوں میں جاگیردارانہ حاکم یا موروثی سردار تھے جس کے باعث قبیلے، اپنے سردار منتخب کرنے کے روایتی اور جمہوری حق سے محروم ہو گئے۔ معاہدہ جیکب آباد (1876ء) کے ذریعے بلوچستان پر ''پُرامن'' قبضے اور یہاں سرداری نظام یا سنڈیمن نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی۔

Scanned by CamScanner

سنڈیمن کا پیش کردہ نظام

1877ء میں سنڈیمن کو بلوچستان میں برطانوی ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے اہلکار کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ اس کی اصل ذمہ داری بلوچستان میں برطانوی مفادات اور تجارت کا تحفظ تھا۔ 1879ء میں سنڈیمن نے دوسری افغان جنگ کے دوران فوجی راستہ کھلا رکھنے کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا اور اس حوالے سے اسے خان کی مکمل معاونت حاصل رہی۔ دوسری افغان جنگ کے دوران، بلوچستان پُرامن رہا اور افغانی، ''سنڈیمن کی پالیسی'' کے باعث بلوچستان کی مدد کرنے سے قاصر رہے۔ 1879ء میں برطانویوں نے معاہدہ گندامک (Gandamak Treaty) کے تحت پشین کے افغانی علاقے اور تھل چھوٹیالری ضلع پر قبضہ کرلیا۔ سنڈیمن نے ژوب اور لورالائی کے قبائلی علاقوں پر قبضہ کرنے کے علاوہ وہاں اپنی عملداری کو مستحکم کرلیا۔ اسی سال، سنڈیمن کو برٹش افغانستان (معاہدۂ گندامک کے تحت قبضہ کیے گئے افغان اضلاع، نیز ہندوستان کی تاریخ میں اس علاقے کو برٹش بلوچستان کہا جاتا ہے) کا چیف کمشنر مقرر کردیا گیا۔[40]

اس کے بعد سنڈیمن نے بلوچ قبائل میں آزادی کے احساسات اور جذبات کچلنے کی غرض سے بلوچستان میں رشوت اور طاقت کا ایک نظام متعارف کرایا۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل ''اصلاحات'' متعارف کروائی گئیں:[41]

(i) جرگہ نظام

قبیلے میں سماج مخالف عناصر کو کچلنے کے مقصد کے حصول کی خاطر جرگہ متعارف کروایا گیا جس کے ارکان، برطانوی حکام کی طرف سے نامزد کیے جاتے تھے۔ قبائلی علاقوں میں جرگے کا سربراہ سردار ہوتا۔ جرگے کے سردار کو سرداری جرگہ کہا جاتا جس کی معاونت کے لیے قبیلے کے دو بڑے بوڑھوں کو نامزد کیا جاتا۔ ان کا فیصلہ، ضلعی افسر جسے ڈپٹی کمشنر یا سیاسی ایجنٹ کہا جاتا، کی منظوری سے مشروط ہوتا۔ ان سب میں اہم شاہی جرگہ ہوتا تھا۔ اس کا کام قبیلوں کے باہمی اختلافات اور حکومت کے علاوہ قبائلی سرداروں کے خلاف بغاوت کے سدباب جیسے دیگر امور کی انجام دہی تھی۔ کوئٹہ، سبی اور فورٹ منرو میں ایک سال میں ایک یا دو مرتبہ شاہی جرگے کا انعقاد ہوتا تھا۔ سرداروں کو اپنی خدمات کے عوض تنخواہیں اور جاگیریں حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔ انہیں عدالتی اختیار دیئے جاتے اور وہ اپنے نجی قیدخانے بھی قائم کرسکتے تھے۔ مقدمات کا انعقاد بلوچ تعزیری نظام اور Frontier Crimes

Scanned by CamScanner

Regulation (1901ء میں بلوچستان میں Frontier Crimes Regulation III متعارف کرایا گیا) کے تحت ہوتا تھا۔[42] سرداروں اور سرکاری جرگہ کو سزائے موت، سزائے عمر قید سنانے کے علاوہ املاک ضبط کرنے اور کوڑوں کی سزا سنانے کا بھی اختیار حاصل تھا۔ Frontier Crimes Regulation کو قبائلی اور دیہی ذمہ داری کی انجام دہی کا بھی اختیار دیا گیا تھا۔ اسی جرگہ نظام کے ذریعے تمام بلوچ قوم پرستانہ بغاوتیں کچل دی گئیں۔ 1893ء میں 1854ء اور 1876ء کے معاہدات کو نظر انداز کرتے ہوئے سرداری جرگہ نے خان کو معزول کر دیا۔

(ii) لیوی نظام

یہ نظام سنڈیمن کا تشکیل کردہ ہے جو 1867ء میں ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے ڈیرہ غازی خان، مری رگبتی اور کھیتر ان بلوچ قبیلوں کے چند افراد کو سرکاری ملازمت میں لے لیا۔ ان کی بھرتی کا اصل مقصد یہ تھا کہ ''چھاپوں'' پر کڑی نظر رکھی جائے۔

ان افراد کو یہ ذمہ داری بھی تفویض کی گئی تھی کہ وہ بلوچ سرداروں اور برطانوی حکومت کے درمیان پیغامات کا اہتمام اور تبادلہ کریں۔ بلوچستان میں 1877ء کو سنڈیمن کی بطور A.G.G تقرری کے ساتھ اس نظام کو بلوچستان تک وسعت دے دی گئی تا کہ ''سماج دشمن عناصر'' کو کچلا جا سکے۔ اس نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوتوں کی روک تھام کے لیے ہر بلوچ سردار کو متعدد مسلح افراد رکھنے کے لیے رقوم دیں۔ یہ سردار امن وامان برقرار رکھنے، مفروروں اور مجرموں کو برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے ذمہ دار تھے۔

سنڈیمن نے بلوچستان کے غیر تحریری آئین کو ان بلوچ سرداروں کی مدد سے بلاواسطہ نظام حکومت پر مبنی ایک نئے نظام (سنڈیمن یا سرداری نظام) میں بدل دیا۔ اس نے بلوچ عوام کی قربانی دے کر بلوچ سرداروں کو رام کر لیا اور انہیں رشوت دی۔ اس نے بلوچ سرداروں کو منتخب سرداروں کی بجائے جاگیردار سردار تسلیم کر لیا۔ اس کے عوض بلوچ سردار، برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے رضامند ہو گئے۔ نئے نظام کے ذریعے بلوچستان کے سیاسی نظام میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بلاواسطہ حکومت پر مبنی نیا نظام کامیاب ہو گیا جب کہ خان ناکام ہو گیا لیکن اب بلوچستان خان کے تسلط میں نہیں بلکہ برطانوی تسلط میں آ چکا تھا۔ جب 1892ء میں سنڈیمن کے انتقال تک یہ نظام مکمل طور پر کامیاب ہو چکا تو اس کے جانشین نے خان کو معزول کر کے نسبتاً ایک کمزور شخص کو خان مقرر کر دیا۔

Scanned by CamScanner

بلوچستان اور جنرل براؤنی

1892ء میں سنڈیمن کا لسبیلہ میں انتقال ہوگیا اور جنرل براؤنی (General Browni) نے اس کی جگہ سنبھال لی۔ جلد ہی خان اور براؤنی کے درمیان چپقلش پیدا ہوگئی جو خان کو ماتحت شہزادہ سمجھتا تھا اور اس نے کوئٹہ اپنی آمد کے ساتھ ہی اعلان کیا تھا کہ خان سرکاری دورے پر اس کے پاس آئے گا۔ ایک خودمختار حکمران کی حیثیت سے خان کو یہ توقع تھی کہ جنرل براؤنی، اپنے پیش رو سنڈیمن کی مانند اس کے ہاں سرکاری دورے پر آئے گا۔ دونوں کے درمیان یہ چپقلش ابھی جاری ہی تھی کہ میر خداداد خان نے خان کو قتل کرنے کی کوشش کے الزامات کے تحت وزیراعظم اور اس کے افراد خانہ کی سزائے موت کا حکم دیا۔ براؤنی نے اس قدم کو غیر انسانی قرار دیا لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت نظرانداز کردی کہ ملک کے خودمختار حکمران کی حیثیت سے خان کو سزائے موت سنانے کا اختیار حاصل ہے۔ خان کو مذاکرات کے لیے کوئٹہ مدعو کیا گیا جہاں اسے گرفتار کرلیا گیا۔ جرگہ کے سردار، خان کے دشمن، کوئٹہ میں اکٹھے ہوئے اور برطانویوں کے حلیف کے علاوہ خودمختار حکمران کو معزول کردیا۔ براؤنی کے مشورے پر انہوں نے وحی عہد، میر محمود دوم کو قلات کا حکمران منتخب کرلیا۔[43]

میر محمود کے دورِ حکومت میں خانیت کی سیاسی حیثیت تبدیل ہوگئی۔ خان کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے برطانوی ریزیڈنٹ حاکم اعلیٰ بن گیا۔ وزیراعظم کی نامزدگی، برطانوی حکومت کی منظوری سے کی جاتی تھی۔ قلات کی باقاعدہ فوج تحلیل کردی گئی اور برطانوی فوجی افسران کے تحت ایک نیا ''لیوی نظام'' متعارف کرایا گیا۔ قلات کا محکمہ خزانہ، برطانوی حکومت کے محکمہ آڈٹ کی زیرنگرانی آگیا۔ درحقیقت خان، حکومت کا محض برائے نام سربراہ تھا۔ تمام اختیارات قلات میں سیاسی ایجنٹ، قلات کے وزیراعظم اور کوئٹہ میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے ہاتھ میں دے دیئے گئے تھے۔[44] اگرچہ خانیت ابھی بھی آئینی طور پر ایک خودمختار ریاست تھی اور ہندوستان کی مقامی ریاستوں میں شامل نہ تھی، لیکن عملی لحاظ سے اسے ایک ہندوستانی ریاست سمجھا جاتا تھا۔

بیداری

سنڈیمن کا نظام اور برطانویوں کے ایجنٹ کے طور پر سرداروں کے کردار کا نتیجہ ظلم وستم اور معاشی عدم انصاف کے طور پر سامنے آیا۔ سرداروں نے اپنے قبیلوں پر بھاری ٹیکس عائد کردیئے۔ اس طور برطانوی بلاواسطہ نظام حکومت، بلوچستان کے لیے ناانصافی اور غربت کا باعث بن گیا۔ میر محمود کے

Scanned by CamScanner

دورِ حکومت میں 1901ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار اور پھر قلات خانیت کے پاکستان میں انضمام کے بعد 1951ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے درمیان تقابل کے ذریعے جھالاوان اور ساراوان کے بلوچ علاقوں میں بلوچوں کی تعداد میں مسلسل کمی سامنے آتی ہے:[45]

علاقہ	آبادی 1901-1951ء	اضافہ (+)، کمی (-)	افراد (فی مربع میل)	اضافہ/کمی 1901-1951ء
ساراوان	65,549-47,254	27 فیصد	14-9	-5
جھالاوان	224,073-101,895	55 فیصد	11-5	-6

بہر حال، بلوچ عوام نے بلوچستان کو آزاد کرانے کے لیے برطانویوں اور ان کے حامیوں (سرداروں) کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ مزید برآں، بلوچ مزاحمت کی تاریخ، 1839-1918ء کی طویل جدوجہد کے لحاظ سے ایک عظیم روایت کی حامل ہے۔[46]

پہلی جنگ عظیم (1914-1918ء) کے دوران، جب ترکی کی عثمانی حکومت نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کے ساتھ اتحاد کر لیا تو Niedermayer اور Zugmayer کی قیادت میں جرمنی کے حکام نے بلوچ قبائل سے رابطہ کیا۔[47] مغربی بلوچستان کے بلوچ قبیلوں کے علاوہ مکران، جھالاوان، مری اور کیھتران کے قبیلوں میں اسلحہ تقسیم کیا گیا۔ بلوچ سردار، 1919ء تک عثمانی خلیفہ اور اس کے حلیف، جرمنی کی حمایت میں لڑتے رہے۔ لیکن یہ تمام کوششیں برطانویوں نے اپنی فوج اور خان میر محمود دوم کے علاوہ مشرقی بلوچستان کے بلوچ قبائل کی مدد سے کچل دیں جو برطانوی حکومت کے تنخواہ دار ملازم تھے۔[48]

تحریک ہجرت

اس عرصے کے دوران، جب بلوچ قبیلے بغاوت پر آمادہ تھے، مسلمان علما نے تحریک ہجرت کا آغاز کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی ہند کے مسلمان، افغانستان اور وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کر جائیں تا کہ برطانیہ پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران خلافت عثمانیہ مخالف پالیسی کو تبدیل کر لے۔ بلوچ قبائل میں اس تحریک کو بہت کم مقبولیت حاصل ہوئی جو برطانوی سامراجیت کے خلاف ''پُرامن'' احتجاج کے مفہوم کو نہ سمجھ سکے۔ اس باعث بلوچستان کی سیاست پر اس تحریک کے بہت کم اثرات مرتب ہوئے۔ اسلامی ذہن کے صرف چند افراد اور ڈیرہ جات، جیکب آباد، نوشکی اور کوئٹہ کے چند بلوچوں نے کوئٹہ سے افغانستان ہجرت کی۔[49]

Scanned by CamScanner

مغربی بلوچستان (ایرانی بلوچستان۔ سیستان) میں مزاحمت

1809ء میں مغربی بلوچستان کے بہت سے بلوچ قبائل نے خانیت سے بغاوت کردی اور اپنی نیم خودمختار مملکت قائم کرلی۔ 1870ء کی دہائی میں بلوچ قبائلی سرداروں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران نے ملک پر قبضہ کرلیا۔ 1871ء میں برطانویوں کی مدد کے ذریعے ایران، بلوچستان کو تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سوویت مؤرخ ایم جے پیکولن (M.J.Pikulin) کے مطابق، جس نے مغربی بلوچستان کے متعلق تحقیقی مطالعہ کیا تھا، بلوچ قبائل ایران کی طرف سے غیر قدرتی تقسیم اور قبضہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور بغاوت کردی۔ بلوچ کسان ہجرت کرنے لگے اور ایرانی ظالم حکومت کے دوران غارت گر بن گئے۔ ان میں سے کچھ مشرقی بلوچستان اور وسطی ایشیا کی طرف ہجرت کر گئے۔ 1897ء میں بلوچ، ناروئی قبیلے کے سردار حسین خان کی قیادت میں ایرانی حکومت کے خلاف سرحد، ساراوان اور بام پور میں بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ انہوں نے ٹیکسوں میں ایک تہائی سے دسویں حصے تک کمی اور خودمختاری کا مطالبہ کیا۔ جب ان کا یہ مطالبہ مسترد کردیا گیا تو ان کی یہ بغاوت مزید پھیل گئی اور صرف اس وقت ہی کچلی جاسکی جب 1910ء میں قبائلی سردار حسین کو بلوک (ضلع) کا حکمران بنا دیا گیا اور اسے ٹیکس جمع کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔[50]

1905ء سے 1911ء تک ایرانی بلوچستان میں بلوچوں کی اس بغاوت کے اثرات مغربی بلوچستان پر بھی مرتب ہوئے۔

بلوچ عوام، ایران کی حکمران خاندانی سلطنت قاچار کے خلاف اپنے ان قبائلی سرداروں کی قیادت میں بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جو ایران اور بلوچستان کے وفاق کو ایرانی حکومت سے اپنی قبائلی سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ 1907ء میں وہ میر بہرام خان بارانزئی کی قیادت میں بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جو کئی برس تک عملاً مغربی بلوچستان (سیستان کے بغیر) کا حکمران رہا۔ اسے سعد خان کی طرف سے غداری کا سامنا کرنا پڑا جسے ایرانی حکومت نے بلوچستان کا گورنر مقرر کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران بلوچستان پر برطانویوں نے قبضہ کرلیا۔ بلوچستان پر برطانوی قبضے کے خلاف مزاحمت ان قبائلی سرداروں کی طرف سے شروع ہوئی جنہیں رشوت کے ذریعے خریدا نہ جاسکا تھا۔ 1915ء میں تحریک مزاحمت کے رہنماؤں کو گرفتار کرکے ہندوستان بھجوادیا گیا اور اب ان کے

Scanned by CamScanner

بچنے کا ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ راستے ہی میں کہیں فرار ہو کر اپنے عوام کے پاس جا سکیں۔ 1916ء میں دمانی اور بارانزئی قبیلوں میں برطانویوں کے خلاف وسیع پیمانے پر مظاہرے شروع ہو گئے۔[51] متعدد بار شکست کے باوجود تحریک مزاحمت 1924ء تک جاری رہی جسے بالآخر برطانویوں اور ایرانیوں کی مشترکہ کارروائی کے ذریعے کچل دیا گیا۔

1925ء میں رضا شاہ، شاہِ ایران بن گیا۔ اس نے ایران میں محکوم اقوام کو کچلنے کی پالیسی اپنا لی۔ بلوچ سرداروں اور خاص طور پر دوست محمد خان کو، جس نے خود کو "شاہِ بلوچستان" قرار دے رکھا تھا، مطلع کیا کہ اب انہیں مزید خود مختار حکمران نہیں سمجھا جائے گا اور اب انہیں ایرانی حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہوں گے۔ اس کا قدرتی نتیجہ بلوچوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ کی صورت میں برآمد ہوا جس میں بلوچوں کی قیادت دوست محمد خان بارانزئی کے ہاتھ میں تھی۔ 1928ء تک ایران، بلوچوں کو شکست دینے کا آغاز نہ کر سکا کیوں کہ وہ آذری ترک اور کردوں کے خلاف مصروفِ عمل تھا۔ 1928ء میں بلوچستان پر حملہ ہوا جس کے دوران بلوچوں کو توپ خانے اور فضائی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔[52] دوست محمد کو شکست ہوئی اور ایرانی حکومت نے اسے پھانسی کی سزا دی۔[53] بلوچوں کو غیر مسلح کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ 1935ء تک سرحد اور سیستان میں کچھ مزاحمت بدستور جاری تھی جسے بالآخر کچل دیا گیا۔ مختلف بلوچ تحاریکِ مزاحمت کی ناکامی، بلوچ سرداروں کی نااتفاقی، طاقت ور ایرانی فوج اور بلوچ سرداروں کے زیرِ تسلط لانے کے ضمن میں برطانوی اور ایرانی مشترکہ مفادات کا نتیجہ تھی۔ ایران میں بلوچ قوم پرستی کی سماجی بنیاد کی عدم موجودگی نے ایرانیوں کی طرف سے مغربی بلوچستان پر قبضے کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔ سعیدی کی قیادت میں ایرانی بلوچ قوم پرستوں کے ایک گروپ نے دسمبر 1932ء میں جیکب آباد میں منعقدہ ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ بعد ازاں، سعیدی نے ایک تنظیم تشکیل دینے کی کوشش کی جسے زیادہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ 1948ء میں شہزادہ عبدالکریم خان نے پاکستان کے خلاف پہلی تحریک مزاحمت کی قیادت کی، انہوں نے مدد کے لیے "ایرانی" بلوچ سرداروں سے رابطہ کیا لیکن ان کی یہ درخواست اس لیے مسترد کر دی گئی کہ یہ سردار ایرانی ظلم و ستم اور تسلط سے خوف زدہ تھے۔[54]

Scanned by CamScanner

باب7

قوم پرستی، انقلابی اور آئینی تحریکیں

بلوچ تحریک مزاحمت کی ناکامی کے نتیجے میں قوم پرستوں کے دو گروہ وجود میں آئے:

1) وہ لوگ جنہوں نے بلوچستان سے سوویت یونین ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور برطانوی سامراجیت کے خلاف سوویت یونین کی مدد حاصل کی۔ اس گروہ کو انقلابیوں کی اصطلاح سے یاد کیا جاسکتا ہے جس کی قیادت مری اور کیھتران قبائل کی طرف سے 1919ء کی بغاوت کے ایک روحِ رواں مصری خان بلوچ کے ہاتھ میں تھی۔

2) دوسرا گروہ ان آئین پسندوں پر مشتمل تھا جو برطانوی تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل تھے اور جن کا تعلق متوسط گھرانوں سے تھا۔ انہوں نے ہندوستانی قوم پرستوں کے انداز کو اپنایا تھا۔

سب سے پہلے ہم بلوچ انقلابیوں کا ذکر کریں گے۔

اکتوبر 1917ء میں زار کے روس میں لینن کی قیادت میں عظیم انقلاب رونما ہوا جس نے برطانوی سامراجیت کے خلاف لڑنے والی تمام مظلوم و محکوم مشرقی اقوام کے حق خودارادیت کی حمایت کی۔ 5 دسمبر 1917ء کو سوویت ریاست نے ''روس اور مشرق کے مسلمانوں سے ایک اپیل'' شائع کی جس میں اس کی اپنی وسطی ایشیا اور مشرق، خاص طور پر جنوب اور جنوب مغربی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے لیے اپنی طرف سے پُرامن اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ لینن کی سربراہی میں نئی حکومت نے جنگ سے علیحدگی اختیار کرنے کے علاوہ ان تمام خفیہ معاہدوں کو شائع اور منسوخ کر دیا جو زارِ روس نے مغربی طاقتوں کے ساتھ کیے تھے:

''ہم اعلان کرتے ہیں کہ معزول شدہ زار کی طرف سے کیے گئے تمام خفیہ معاہدے، اب منسوخ سمجھے جائیں۔ ہم یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ ایران کی تقسیم کا معاہدہ بھی منسوخ ہو چکا ہے۔ نیز ہم

Scanned by CamScanner

ایرانیوں کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کے حق کی ضمانت دیتے ہیں۔''[1]

یہ اپیل، انقلاب اکتوبر کے ایک ماہ کے اندر ہی شائع ہوگئی اور اس پالیسی کی طرف اشارہ کیا جس کی بنیاد اقوام کے لیے مساوات اور حق خود ارادیت کے مارکسی اصولوں پر تھی۔

بالشویکوں نے ''روس اور مشرق کے مسلمانوں سے ایک اپیل'' میں موجود اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے ایک پالیسی تشکیل دی۔ 1918 کے موسم گرما تک، شمالی ایران میں قابض روسی افواج کو واپس بلا لیا گیا۔

27 مئی 1919ء کو لینن نے افغانستان کے امیر امان اللہ کو ایک خط لکھا جس میں اسے کسی بھی غیر ملکی طاقت کی طرف سے مداخلت کے خلاف اور افغانستان کی خود مختاری کے حوالے سے سوویت یونین کی حمایت کا یقین دلایا۔[2] اسی برس پہلے سوویت نمائندے Y.Z.Surits کو آزاد افغانستان کے عوام، بلوچستان کے آزاد قبائل اور اپنی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے ہندوستانی عوام کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا اختیار دے دیا۔[3]

یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ لینن کا یہ ہدایت نامہ اس وقت جاری ہوا جب بلوچ تحریک مزاحمت کو برطانویوں کی طرف سے کچل دیا گیا تھا۔ مشرقی بلوچستان میں مری اور کھیتر ان قبیلے کے باغی رہنما، سردار خان بلوچ، ملغانی اور حیدر خان کلونچی، افغانستان ہجرت کر گئے۔ باغی رہنما، مصری خان بلوچ اور صوبیدار سردار خان مری بلوچ نے سوویت یونین کا سفر اختیار کیا۔ ان کی سرگرمیوں کی تاریخ کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ان کی سرگرمیوں کے متعلق دستیاب ذریعہ برطانوی سیاسی ریکارڈ اور ''کانگریس آف دی پیپل آف دی ایسٹ'' منعقدہ باکو 1920ء کے متعلق سوویت رپورٹ ہے۔

بلوچ وفد اور باکو کانفرنس

ستمبر 1920ء کے پہلے ہفتوں میں، کانگریس آف دی پیپلز، باکو (سوویت آذر بائیجان) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی دعوت، Second Congress of the Comintern کی طرف سے دی گئی جس کا اجلاس ماسکو میں جولائی اور اگست 1920ء میں ہوا۔ اس کے اعلامیے میں کہا گیا کہ یہ کارکن انقلابیوں کا فرض ہے کہ اپنے نوآبادیاتی بھائیوں کی جدوجہد کی حمایت کریں اور نوآبادیاتی انقلاب مشرق میں سامراجیت کے اکھاڑ پھینکنے کے ضمن میں ایک حلیف ثابت ہوسکتا ہے۔ اس اجلاس میں لینن کے نظریے کو اپناتے ہوئے مغرب کے پرولتاریوں کی مدد کے ذریعے پسماندہ مشرق میں ترقی

Scanned by CamScanner

کے سرمایہ دارانہ مرحلے کو نظر انداز کرنے کی منظوری دی۔ باکو کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں کے درمیان خلیج پاٹی جائے۔

''کانگریس آف پیپلز آف ایسٹ'' کے ''منشور'' کے مطابق اس کانفرنس میں بلوچستان سمیت مندرجہ ذیل ممالک کے 1,891 وفود نے شرکت کی؛ ترکی، ایران، مصر، ہندوستان، افغانستان، بلوچستان، کاشغر، چین، جاپان، کوریا، عرب، شام، فلسطین اور سوویت وسطی ایشیا کے ممالک۔ وفود کی اکثریت کمیونسٹ نہیں تھی۔ بہرحال، دونوں گروہ (قوم پرست اور کمیونسٹ)، نوآبادیات مخالف کے کم از کم پروگرام پر متفق تھے۔ کانگریس کا اعلامیہ یوں تھا: ''یہ مشرق کے عوام جو بین الاقوامی کمیونسٹوں کے پرچم تلے مغرب کے انقلابی پرولتاریوں کے ساتھ متحد ہیں، کے نمائندوں کی پہلی کانگریس کا پیغام ہے۔ اس لیے مشرق؛ ہندوستان، ترکی، ایران، مصر، افغانستان، بلوچستان، کاشغر، چین، انڈونیشیا، جاپان، کوریا، جارجیا، آرمینیا، آذربائیجان، داغستان، شمالی کاکیشیا، عرب، میسوپوٹامیا، شام، فلسطین، خیوا، بخارا، ترکستان، فرغانہ، تاتاریہ، بشکیریا، کرغازیہ وغیرہ عوام کے ستم رسیدہ اور محنت کش کے عوام کے نمائندے جو باہمی اتحاد کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں اور جو مغرب کے انقلابی کارکنوں کے ساتھ ہیں، اپنی اپنی عوام کو مقدس جنگ کی دعوت دیتے ہیں۔[4]

بلوچ وفد کی قیادت مصری خان بلوچ کے سپرد تھی۔ وفد میں شامل کُل افراد کی تعداد معلوم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ تحریکِ ہجرت کے رہنما، سردار خان بلوچ، حیدر خان کلونجی بلوچ (ڈیرہ اسماعیل خان) اور ملغانی (ڈیرہ غازی خان) اور مغربی بلوچستان کے مشہورِ زمانہ کریم خان، جس نے بسماکیوں کے خلاف بالشویکوں کی مدد کی، کانفرنس میں شرکت کی یا نہیں کی۔ یہ تمام انقلابی کمیونسٹ نہیں تھے لیکن، بلاشبہ کمیونزم کے سماجی اور ثقافتی انقلاب سے ہمدردی رکھتے تھے۔

بہرحال، باکو کانفرنس میں کانگریس کا ایک ایسا منشور منظور کیا گیا جو مشرق کے عوام کے لیے تھا، اس کے علاوہ یہ یورپ، امریکہ اور جاپان کے کارکنوں کے لیے کانگریس کی طرف سے اپیل بھی تھی۔ Sepehr Zabih کے مطابق اس کی ایک کونسل تھی جو ایک ایسی انتظامی کمیٹی پر مشتمل تھی جس کے کونسل کے ان دو سمیت سات ارکان تھے جنہیں کونسل کے فیصلوں کے ضمن میں ویٹو کا حق حاصل تھا۔

منشور میں مشرق کے عوام کے حق خودارادیت کے علاوہ کسی بھی قوم کی طرف سے دوسری قوم اور کسی بھی فرد کی طرف سے کسی بھی دوسرے فرد کے ساتھ ہر قسم کے ظلم و ستم کے خاتمے پر زور دیا گیا

Scanned by CamScanner

تھا۔ کانگریس کے بنیادی مقصد کے حصول کی خاطر، مشرق میں School of Propaganda and Action قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سکول کے تحت پانچ زبانوں، روسی، ترکی، فارسی، اردو اور عربی میں ایک اخبار شائع کیا جاتا، نیز اسے مشرق کی مقبول ترین زبانوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ اس سکول کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نظریاتی تربیت مہیا کی جائے تاکہ مشرق میں کمیونزم کا تحفظ کیا جائے۔ یہ معلوم نہیں کہ بالشویک وفد نے اس سکول کی سرگرمیوں میں حصہ لیا یا نہیں۔

اس سکول کے علاوہ، باکو میں دو مزید تنظیمیں قائم کی گئیں۔ ہندوستانی تنظیم کا کام اردو اخبارات کی اشاعت اور کمیونسٹ مواد کا ترجمہ تھا۔ اردو کے علاوہ، اس تنظیم نے کمیونسٹ مواد کا فارسی، ترکی، آرمینائی، جارجیائی، پشتو اور بلوچی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا اور یہ تمام مواد متعلقہ اقوام کو بھجوا دیا گیا۔[5] اس کے علاوہ ایک ایرانی تنظیم بھی تھی جس کا کام بھی ہندوستانی تنظیم کی مانند ہی تھا۔ سکول اور ان تنظیموں کے علاوہ، تاشقند کی ہندوستانی انقلابی پارٹی نے بھی کانگریس کے منشور کو فروغ دینے کے لیے کام کیا۔ انہوں نے ہفتہ وار ''زمیندار'' شائع کرنا شروع کیا اور بخارائی زبان کے ایک کتابچے بعنوان ''کمیونزم کیا ہے؟'' کا فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا۔[6]

برطانوی اور روسی اطلاعات، بلوچ وفد کے متعلق اس کے سوا کوئی دیگر معلومات فراہم نہیں کرتیں کہ بلوچ وفد کے قائد، مصری خان نے ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا لیکن اختلافات کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔

باکو کانفرنس کے بعد، بلوچ انقلابی کابل پہنچے جہاں ان کا رابطہ شاہ امان اللہ خان اور افغانستان کے وزیر خارجہ محمد ترزئی کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے بلوچستان کو آزاد کرانے کے لیے ایک انقلابی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی۔ برطانویوں کی ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر تھی۔ بعد ازاں، شاہ نے بھی برطانوی دباؤ کے تحت کسی بھی قسم کی مادی مدد مہیا کرنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں ان کے لیے بلوچستان کی اندرونی حالت بھی سازگار نہ تھی جہاں برطانوی فوج کو حالات پر مکمل قابو حاصل تھا۔ بہرحال، ان کے انقلابی خیالات نے آئین پسندوں پر اپنے اثرات مرتب کیے اور بلوچستان کی سیاست پر بھی اثرات چھوڑے۔[7]

سوویت انقلاب میں بلوچوں کا کردار

بالشویک انقلاب (1917ء) کو ترکمانستان میں ایک مخالف تنظیم بسماکیوں (ازبکی زبان

میں ڈاکوؤں کو کہتے ہیں) پر غالب آنے میں بہت زیادہ مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ بالشویک تاریخ کے ان مشکل واقعات وحالات کے دوران، ایک بلوچ رہنما کریم خان بلوچ نے سماجی اصلاحات کے نفاذ اور وسطی ایشیا میں کمیونسٹ عملداری کو مستحکم کرنے کے لیے سرخ فوج کی مدد کی۔[8] ایک برطانوی خفیہ رپورٹ کے مطابق، ''ایران میں کون کیا ہے'' میں مذکور خان کی پیدائش 1884ء میں ہوئی۔ اس کا باپ نور محمد، زربندی بلوچوں کے 200 گھرانوں کا سربراہ تھا۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد، اسے زربندیوں کا سردار منتخب کیا گیا۔ اس نے 1918ء میں اپنے قبیلے کے ساتھ مغربی بلوچستان سے سوویت ترکمانستان ہجرت کی اور سوویت انقلاب میں حصہ لیا۔ اسے بالشویکوں نے سردار مقرر کیا۔ ایک اور ممتاز فرد جس نے سوویت روسیوں کے ساتھ تعاون کیا، سفر خان بلوچ تھا۔[9]

بالشویکوں کے اپنے انقلاب کے لیے کریم خان اور اس کے ساتھی ایک عظیم اثاثہ ثابت ہوئے۔ وسطی ایشیا میں بالشویک انقلاب کے استحکام میں بلوچوں کے کردار اور باکو کانفرنس میں بلوچ وفد کی شرکت کے باعث بلوچستان کی سیاست پر عظیم اثرات مرتب ہوئے۔ عنقا کے مطابق، سوویت ترکمانستان میں بلوچ آبادکاروں کے فلاحی منصوبے، بلوچ انقلابیوں کے ساتھ سوویت یونین کے تعاون اور لینن کی طرف سے کابل میں سوویت سفارت خانے کو بلوچستان کی تحریک آزادی کے ساتھ تعاون کی ہدایت کے باعث بلوچستان کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔[10] برطانوی فوجی افسر کی حیثیت سے میر احمد یار خان نے برطانوی حکام کو ایک رپورٹ پیش کی اور بلوچ آبادی پر عظیم اثرات کی توثیق کی۔[11] ان اثرات کو بلوچ قومی پرستی کے بانی اور قومی کمیونزم کے علمبردار، مگسی کی تحریروں میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

آئینی سیاست

1920ء میں قلات کے ایک سرکاری ملازم کے بیٹے، میر عبدالعزیز کرد نے بلوچستان میں "Young Baloch" کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا جو 1929ء تک زیرِ زمین رہی۔ 1929ء میں ایک قبائلی سردار کے بیٹے، محمد یوسف علی خان عزیز مگسی نے ایک مضمون لکھا جو لاہور کے ایک روزنامہ ''مساوات'' میں ''فریادِ بلوچستان'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں آئینی اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس نے برطانوی حکومت اور ریاستِ قلات کے وزیرِ اعظم کی پالیسیوں پر تنقید کی جس پر مگسی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے 20,000 روپے جرمانہ کیا گیا اور ایک سال کے لیے قید خانے بھیج دیا گیا۔[12]

Scanned by CamScanner

انجمن کی تشکیل

ایک نوجوان گروہ نے کوئٹہ کے قید خانے میں مگسی سے ملاقات کی اور انجمن اتحادِ بلوچستان کی تشکیل کا اعلان کیا۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ ایک متحد آزاد بلوچستان کے علاوہ بلوچستان میں اصلاحات کا مطالبہ کیا جائے۔[13] ریاست میں آئینی اصلاحات کے مطالبے کا آغاز 1931ء میں گجرات کے ایک پنجابی، وزیراعظم سر شمس کے خلاف تحریک کی صورت میں ہوا۔ سر شمس، قلات کے خان، میر محمد کی جگہ اپنے بڑے بیٹے، جو ایک بیمار شخص تھا، ایم انور کو لانا چاہتا تھا۔

مگسی کا احتجاج اور ہجرت

انجمن کے نوجوان ارکان نے، جو شمس شاہ کے ظالمانہ طرزِ عمل کے خلاف تھے، شہزادہ محمد اعظم جان کو ترجیح دی جو اس وقت گرفتار تھا۔ بالآخر، انجمن کے صدر میر یوسف علی خان مگسی نے شہزادہ محمد اعظم جان کے ساتھ مذاکرات کیے اور ایک آئینی حکومت کی تشکیل کے لیے ایک معاہدہ طے پا گیا، نیز میر یوسف علی خان مگسی نے شہزادہ کی حمایت کا اعلان کیا۔[14]

وزیراعظم کو ہٹانے اور شہزادہ محمد اعظم جان کو اقتدار میں لانے کے لیے مگسی ہجرت کا آغاز بلوچستان میں ہوا۔ اس تحریک کا مرکز، مگسی علاقے میں جھل تھا۔ ہزاروں لوگوں نے سندھ اور پنجاب کی طرف ہجرت کی۔ اسی حوالے سے، انجمن نے ایک کتابچہ بعنوان ''شمس گردی'' شائع کیا جس میں سر شمس شاہ کے مظالم پر تنقید کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا کہ قلات کے خان کو کس طرح منتخب کیا جائے، نیز مندرجہ ذیل الفاظ میں ایک نمائندہ اسمبلی کی تشکیل کا مطالبہ کیا:

''قدیم روایات و رسوم کے مطابق، عوام کو اپنا خودمختار حکمران منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہم بلوچ، خاص طور پر اس طرف برطانوی حکومت کی توجہ دلاتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ سر شمس کی ذاتی خواہشات اور مفادات کے لیے عوامی حقوق قربان نہ کیے جائیں۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ قلات کے تخت کے جانشینی کے انتخاب کا سوال چند سرداروں کے سامنے رکھا جائے گا۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب تک سر شمس اقتدار میں ہے، اس سے نفرت کرنے اور ناپسند کرنے کے باوجود سرداروں کو اس کی طرف سے ہدایات ملتی رہیں گی اور وہ اس کی مخالفت نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سرداروں کی طرف سے کوئی بھی انتخاب جس میں ہمارے ملک کی قدیم روایت کو نظرانداز کر دیا گیا ہو اور جس کا انعقاد سرداروں کی طرف سے قبیلوں کے مشورے کے بغیر

Scanned by CamScanner

کیا گیا ہو، اسے منسوخ شدہ تصور کیا جائے گا۔ یہ امر واضح ہو جانا چاہیے کہ عوام، ریاستِ قلات کے لیے ایک ایسے حکمران کے خواہاں نہیں، جو وزیراعظم کا اطاعت گزار ہو اور برائے نام ہی تخت پر بیٹھے، اور جسے ملک اور عوام کی فلاح سے کوئی سروکار نہ ہو۔ عوام کو ایک ایسے حکمران کی ضرورت ہے جو تخت پر بیٹھنے کے بعد عوام کے ذریعے یا جمہوری طور پر منتخب شدہ نمائندوں کی اسمبلی جس کی اپنی قانونی کابینہ یا وزارت ہو، پر مشتمل ایک آئینی اور ذمہ دار حکومت کی تشکیل کا فوری طور پر اعلان کرے۔[15]

انجمن کی اصلاحات پالیسی

بلوچ قبیلوں کے علاوہ رند، رستم زئی (رئیسانی) قبیلوں پر مگسی کی ہجرت کا بہت گہرا اثر مرتب ہوا۔ مینگل اور بگٹی قبیلوں نے اپنے سرداروں کے خلاف بغاوت کر دی جو سر شمس شاہ یا برطانویوں کے حمایتی تھے۔ برطانوی انتظامیہ نے شدید بے چینی کا ذمہ دار سر شمس کو ٹھہرایا۔ برطانوی انتظامیہ نے سر شمس شاہ کی طرف سے میر محمود کے بیٹے، شہزادہ انور جان کو قلات کا حکمران مقرر کرنے کی تجویز کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ وہ بیمار ہے اور حکمرانی کے قابل نہیں۔ برطانوی حکومت، میر محمود دوم کے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد اعظم جان کو خانِ قلات نامزد کرنے پر رضامند ہو گئی۔

بالآخر، 10 دسمبر 1931ء کو شہزادہ محمد اعظم جان، انجمن کی حمایت سے خانِ قلات بن گیا۔ یہ بلوچ معاشرے میں جدید جمہوری اصول کی پہلی فتح اور بلوچستان میں برطانوی حکومت کے لیے پہلا سیاسی نقصان تھا۔ دسمبر 1931ء میں اعظم جان نے سر شمس شاہ کو معزول کر دیا اور انجمن کے صدر، میر یوسف علی خان مگسی کو اپنے مطالبات پیش کرنے کی دعوت دی۔ اس دعوت کے نتیجے میں میر مگسی نے خانِ قلات سے ملاقات کی جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ملاقات کے فوراً بعد، نئے خان نے انجمن کے جنرل سیکریٹری، میر عبدالعزیز خان کرد کو تنبیہ کی کہ اس کی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔ لہٰذا، نئے خان کے اقتدار میں آنے کے باوجود انجمن کے مقاصد حاصل نہیں ہو سکے۔ اس کی بنیادی وجہ بلوچستان کا سرداری نظام تھا اور میر محمد اعظم جان کے علاوہ اس کے قبائلی سردار اسی نظام کی پیداوار تھے۔ ایک آئینی اور نمائندہ حکومت کی تشکیل، انہیں برائے نام حکمرانی تک محدود کر دیتی۔ برطانوی حکومت بھی بلوچستان میں سرداری نظام برقرار رکھنے کے لیے پُرعزم تھی تاکہ قوم پرست تحریک کے باعث ان کے مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔ ان برطانوی خیالات کا اظہار، ہندوستان کے وائسرائے، لارڈ ویلنگٹن (Lord Wellington) کی طرف سے 26 اپریل 1942ء کو میر محمد اعظم جان کی بطور برطانوی نمائندے تاج پوشی

Scanned by CamScanner

کے موقع پر درج ذیل الفاظ میں کیا گیا:

''آپ (خانِ قلات) نہ صرف ریاست کے حکمران ہیں بلکہ ایک قدیم اور مضبوط وفاق کے سربراہ بھی ہیں۔ اس لیے، یہی مناسب ہوگا کہ آپ مل جل کر اور اپنے سرداروں کی مشاورت سے کام کریں، نیز ان کے حقوق کا احترام کرنے کے علاوہ ان کے مناصب اور وقار کو بھی بحال کریں۔ ہر حکمران کو مشکلات اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خدانخواستہ، اگر اس قسم کا وقت آجائے تو پھر آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ ہمارے افسران، آپ کو ہر قسم کی مدد و مشاورت فراہم کریں گے۔ یقین رکھیے کہ میں بذاتِ خود، آپ کی ریاست میں مسلسل اور گہری دلچسپی لیتا رہوں گا۔''[16]

یوں لارڈ ولنگٹن نے خان کو کسی بھی خطرے، مثلاً انجمن کے جاگیردارانہ ڈھانچے کے خلاف کسی بھی مدد کا یقین دلایا۔ ان حالات میں انجمن نے آئینی حکومت کے لیے کام کا سلسلہ جاری رکھا۔

آزاد بلوچستان کے متعلق انجمن کا موقف

انجمن نے نمائندگی کی صورت میں حکومت پر مشتمل ایک آزاد اور متحد بلوچستان کے قیام کو اپنا مقصد قرار دیا۔ اس ضمن میں انجمن کے جنرل سیکریٹری نے 13 دسمبر 1932ء کو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: 9 ستمبر 1932ء کے ''زمیندار'' رسالے میں، میں نے ہندوستان سے بلوچستان کو علیحدہ کرنے اور ملک میں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا۔ میں نے اس نظریے کی تشکیل آج نہیں کی بلکہ میں اس نظریے کی تشکیل 1920ء میں مقامی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بارہ برس قبل کر چکا تھا اور جس کا اظہار میں اس سے قبل دنیا کے سامنے 1922ء میں ایک اخبار ''ہمدان'' میں اشاعت کے ذریعے کر چکا تھا۔ میری خواہش ہے کہ بلوچستان میں ایک آئینی حکومت ہو جو ہر لحاظ سے خالصتاً اسلامی اور خودمختار ہو۔ یعنی، جس طرح مجھے یہ پسند نہیں کہ بلوچستان ہندوؤں کی غلامی میں رہے، عین اسی طرح میں یہ بھی چاہوں گا کہ میرا ملک یورپیوں کی غلامانہ زنجیر میں قید نہ رہے۔''[17]

اس موقع پر ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ابھی تک پاکستان کا مطالبہ پیش نہیں کیا تھا بلکہ ایک متحد ہندوستان کے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

ایک آزاد بلوچستان پر مبنی انجمن کے نظریے کا ردِعمل برصغیر میں بہت ہی شدید تھا۔ ''مسلم آؤٹ لک'' (Muslim Outlook) لاہور کے مدیر جناب مجید نے اس تجویز اور مطالبے کو یورپی

استعماریت کی گونج قرار دیا۔ لاہور کے روزنامہ ''زمیندار'' نے بھی اس موقف کی مخالفت کی۔ یوسف مگسی، عزیز کرد اور اعظم خان مزاری جیسے بلوچ رہنماؤں نے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندی ذرائع ابلاغ کے الزامات کو مسترد کر دیا۔ درحقیقت، ہندوستانی رہنماؤں اور ان کے ذرائع ابلاغ کو بلوچستان کی تاریخ، تہذیب وثقافت اور سیاسی حیثیت کے متعلق بہت ہی کم علم تھا۔

20 اکتوبر 1932ء کو انجمن کے مامور کردہ رہنماؤں میر یوسف علی مگسی، سردار جمال خان لغاری، نواب مشتاق احمد گورمانی اور سردار غلام رسول خان کورائی نے کانفرنس کے مقصد کے حوالے سے درج ذیل مشترکہ بیان جاری کیا: ''فیصلہ کیا گیا ہے کہ دسمبر 1932ء کے مہینے میں بلوچستان اور آل انڈیا کانفرنس جیکب آباد میں منعقد کی جائے۔ بلوچ جمہوری اصولوں سے بخوبی واقف ہیں لیکن بیرونی اثرات کے باعث ہماری قوم بری طرح متاثر ہو رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ ہم خود کو اتحاد کے رشتوں میں باندھ لیں ورنہ ہم دیگر تمام اقوام سے پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمارے مقاصد یہ ہیں کہ ہم اپنے اہم مقاصد، بلوچوں کے درمیان اتحاد، لازمی تعلیم، حقوق کا تحفظ، مذہبی تعلیم اور قانونی اصلاحات کے حصول کے لیے کوشش کریں۔ ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ ہماری قوم کے لوگ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔''[18]

اس کانفرنس کا آغاز 27 دسمبر 1932ء کو خیر پور کے حکمران، میر علی نواز خان تالپور کے صدارتی خطبے سے ہوا جس میں بلوچوں کو خبردار کیا گیا کہ وہ سیاست کے منفی پہلوؤں سے احتراز کریں کہ جن کے نتائج اقوام کی تباہی پر منتج ہوتے ہیں۔[19]

29 دسمبر 1932 کو کانفرنس ختم ہوگئی جس کے دوران مختلف قراردادیں منظور کی گئیں۔ مندرجہ ذیل انتہائی اہم مطالبات کا مقصد یہ تھا کہ بلوچ قوم پرستی کے لیے ایک سماجی بنیاد تشکیل دی جائے۔[20]

1. Frontier Crimes Regulation کی تحلیل
2. بلوچستان میں آئینی حکومت کا قیام
3. بلوچستان میں صنعتوں کا قیام
4. بلوچستان میں کالج اور جدید تعلیم کا قیام
5. بلوچوں کا اتحاد، یعنی بلوچستان کے مختلف حصوں میں اتحاد

دسمبر 1933ء کے اواخر میں ایک دوسری بلوچ کانفرنس کا انعقاد حیدرآباد (سندھ) میں

Scanned by CamScanner

کیا گیا۔ گزشتہ کانفرنس کی قراردادوں کی حمایت کرتے ہوئے دوسری کانفرنس نے بلوچستان میں ایک آئینی حکومت کے قیام پر زور دیا۔[21] انجمن کے سیکریٹری جنرل کو 1934ء میں گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتاری کے وقت پارٹی کے لیے اس کا پیغام نہایت ہی دلچسپی کا حامل ہے: ''ساتھیو! تمہیں بلوچستان میں برطانیہ کی حیثیت کو سمجھ لینا چاہیے۔ اسے ہندوستانی سیاست کے تناظر میں مت دیکھو۔ ہمارے ملک کی اہمیت کے مدنظر مقامی حالات اور قومی امنگوں کو سامنے رکھتے ہوئے صوبائی ہنگامی ضرورت کے تحت تمام ایشیا تمہارے سیاسی نظریے پر مشتمل ہے۔ بلوچ قوم کو افغانی، ہندوستانی یا کسی بھی غیر ملکی سیاست کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں یہ حقیقت ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ برطانویوں نے تمہارا ملک فتح کیا ہے نہ کسی سے خریدا ہے۔ اس لیے تم برطانویوں کے غلام ہو نہ ہی برطانوی تمہارے آقا ہیں۔ درحقیقت، برطانویوں نے تمہارے ملک میں ایک عارضی پڑاؤ قائم کرلیا ہے تاکہ تاجر کی حیثیت سے دوستانہ اور مساویانہ معاہدوں کے ذریعے مخصوص رعایتیں حاصل کرسکیں۔ اس لیے تمہیں ہمیشہ اپنی حقیقی حیثیت اور سیاسی وقار سے آگاہ رہنا چاہیے۔[22]

ریاستِ قلات کی نیشنل پارٹی

میر محمد اعظم جان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا میر احمد یار خان، 20 دسمبر 1933ء کو قلات کے تخت پر بیٹھا۔ نیا خان، انجمن کے منشور اور پروگرام کا حمایتی تھا۔ نتیجے کے طور پر اس کے تخت سنبھالنے کے ساتھ ہی انجمن کے لیے زیادہ سازگار حالات پیدا ہوگئے جس کا مقصد یہ تھا کہ آزاد بلوچستان کا ہدف حاصل کیا جائے۔ میر احمد یار خان نے میر یوسف علی خان مگسی کو اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے برطانیہ بھیجا تاکہ اعلیٰ حکام کے ساتھ خوانین قلات کی خودمختاری پر بات کی جائے اور لیز پر لیے ہوئے علاقے خانیت کو واپس کیے جائیں۔ یہ مذکرات تعمیری ثابت نہ ہوئے اور برطانوی حکومت نے بلوچستان میں اصلاحات متعارف کرانے سے انکار کردیا۔ مگسی کے اس مشن کی ناکامی کے نتیجے میں انقلاب پسندی نے جنم لیا۔ انجمن کے صدر مگسی نے سوویت یونین کی مدد سے مسلح جدوجہد کی حمایت کی۔ بہرحال، 1935ء میں انجمن کے صدر مگسی کا کوئٹہ میں انتقال ہوگیا۔

مگسی کا انتقال بلوچ قومی تحریک کے لیے بہت بڑا نقصان تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مگسی نے انجمن کی انقلابی خطوط پر ازسرنو تنظیم کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو انجمن میں سے برطانویوں کے حمایتی عناصر کو نکال باہر کرنے اور بلوچستان کی مکمل سیاسی آزادی اور ایک سوشلسٹ

Scanned by CamScanner

نظام کے قیام کی خاطر خود کو وقف کرنے کے متعلق خطوط لکھے۔

1936ء میں انجمن کے جنرل سیکریٹری عزیز کرد نے انجمن کی از سرِ نو تنظیم کی تجویز پیش کی۔ انجمن سے منسلک دائیں بازو نے اس تجویز کی مخالفت کی جس کی قیادت میر بندو علی تالپور اور مشتاق گورمانی کے ہاتھ میں تھی۔ دایاں بازو بلوچستان میں اصلاحات متعارف کروانے کے لیے برطانوی حکومت سے تعاون کا خواہاں تھا۔ انجمن کا بایاں بازو، انہیں برطانویوں کا ''ایجنٹ'' سمجھتا تھا۔ بہرحال، انجمن سے منسلک انقلابیوں نے سبی میں 1937ء میں باہم ملاقات کی۔ انجمن کو ایک روایتی سیاسی جماعت، Kalat State National Party میں بدل دیا گیا۔ نیشنل پارٹی کا منشور، اپنی پیشرو انجمن سے کافی حد تک ملتا جلتا تھا اور اس نے تمام بلوچ طبقوں میں اپنی بنیاد کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ پارٹی کے قومی منشور نے بلوچستان کے پڑھے لکھے افراد، خاص طور پر ریاست کے ملازمین کو متاثر کیا۔ یہ گروہ، پارٹی کی مالی معاونت کا ذمہ دار تھا۔ ایک اور گروہ ان بے لوث افراد اور سیاسی کارکنوں پر مشتمل تھا جنہوں نے نیشنل پارٹی کے منشور اور نظریے کو آگے بڑھایا اور قبیلے کے بارسوخ ارکان کو ان کی معاونت کرنے اور پارٹی کے ارکان بننے کی ترغیب دی۔ اس طرح نیشنل پارٹی عوام میں مقبول ہوگئی۔ لیکن ملک کے اندر نیشنل پارٹی، سرداری نظام کی طاقت اور برطانوی حکومت کے عزائم کو نظرانداز نہ کرسکی۔ یہ دونوں، قومی آزادی کے راستے کی رکاوٹ تھے یعنی سرداری نظام اور برطانوی حکومت، ایک آزاد اور خودمختار بلوچستان کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

نیشنل پارٹی اور اصلاحات

نیشنل پارٹی نے سرداری نظام کے خلاف جدوجہد جاری رکھی اور بہت سے سیاسی امور کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مثال کے طور پر غیر قانونی ٹیکس ختم کردیئے گئے۔ پارٹی کے انقلابی منشور سے خانِ قلات کے تعاون کے اعتراف میں پارٹی نے اسے ''خانِ معظم'' کا خطاب دیا۔ بہرحال، 1938ء میں خان کا کردار اس کی ریاست کی خودمختاری تک محدود ہوچکا تھا۔ وہ قبائلی سرداروں کے مفادات یا برطانوی حکومت کی مخالفت میں بہت زیادہ آگے نہ بڑھ سکا کیوں کہ اس صورت میں اسے اپنے دادا، میر خداداد کی مانند تخت سے معزول کیے جانے کا خطرہ تھا۔

سرداری نظام کے خاتمے کے لیے نیشنل پارٹی کی جدوجہد کے باعث، قبائلی سردار پارٹی سے ناراض ہوگئے۔ 1939ء میں جب برطانوی حکومت نے جیوانی کی بندرگاہ کے حقوق ٹھیکے پر حاصل

Scanned by CamScanner

کرنا چاہے تو نیشنل پارٹی نے کھلے عام برطانوی حکومت کے اس منصوبے کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کے باعث، برطانوی حکومت یہ بندرگاہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ ٹیکسوں کے حصول سے محرومی اور جیوانی کی بندرگاہ کے حصول میں ناکامی کے باعث، قبائلی سرداروں اور برطانوی حکومت نے نیشنل پارٹی کے خلاف گٹھ جوڑ کرلیا۔

پارٹی کا سالانہ اجلاس (1939ء)

قلات کے برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کے اُکسانے پر بالآخر سردار، اجتماعی طور پر نیشنل پارٹی کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ 6 جولائی 1939ء کو سرداروں کی قبائلی فوج نے نیشنل پارٹی کے اجلاس پر حملہ کر کے اجلاس کو منتشر کر دیا۔[23] اگلے ہی روز سردار، خانِ قلات کے پاس اپنی شکایتیں لے کر پہنچے اور نیشنل پارٹی پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے خانِ قلات نے کہا:

''قبیلے ہمارا دایاں ہاتھ ہیں جب کہ سردار ہماری حکومت کے ارکان ہیں۔ آپ کا وقار، سرداروں کا وقار ہے اور سرداروں کا وقار، خان کا وقار ہے۔ نیشنل پارٹی کے اجلاس کے دوران جب آپ کی خواتین کا ذکر آیا تو آپ مشتعل ہونے پر مجبور ہوگئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں ابھی حوصلہ اور غیرت موجود ہے۔ ہم آپ کے مطالبات پر غور کریں گے۔''

20 جولائی 1939ء کو ریاستِ قلات کے وزیراعظم نے ایک حکم جاری کیا جس کے تحت نیشنل پارٹی کو ریاستِ قلات کی حدود میں غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس کے فعال رہنماؤں ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، میر غوث بخش بزنجو، عبدالکریم شورش، میر گل خان نصیر اور دیگر کئی ایک کارکنوں کو ریاستِ قلات سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے بعد نیشنل پارٹی نے اپنا صدر دفتر کوئٹہ میں قائم کرلیا جہاں اس نے اپنی سرگرمیاں زیادہ زور و شور سے جاری رکھیں۔ اسی عرصے کے دوران، دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت برطانوی ہند میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن نیشنل پارٹی نے اپنی سرگرمیوں کو زیرِ زمین جاری رکھا۔

خاران سے متعلق نیشنل پارٹی کی پالیسی

25 اگست 1941ء کو نیشنل پارٹی نے برطانوی حکومت کی طرف سے خاران کی ایک علیحدہ ریاست میں تبدیلی کے منصوبے کی مخالفت کی۔ پارٹی کی سیکریٹری، عبدالکریم شورش نے قلات کی مزید تقسیم کے خلاف برطانوی حکومت کو خبردار کیا۔ اس نے ریاستِ قلات کی ہمارے لیے اہمیت کو یوں آشکار کیا:

Scanned by CamScanner

''کسی بھی صورت میں موجودہ ریاستِ قلات، فعال بلوچ محاذ کا نام ہے جس کے نام پر ہم مستقبل میں بلوچوں کا ایک متحد محاذ قائم کر سکتے ہیں۔ اگر آج یہ مرکز ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے تو پھر بلوچوں کی تقسیم ناگزیر ہوگی۔ سیاسی دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ہم اس قسم کی تنگ نظری سے احتراز کریں جس میں تقسیم اور ذلت کے بیج پوشیدہ ہیں۔ قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے بلوچوں کو عوامی جلسوں میں برطانوی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ قلات کے ساتھ خاران اور لسبیلہ کا انضمام ختم کر دیا جائے تا کہ موجودہ انارکی اور سیاسی انتشار کا سلسلہ اختتام کو پہنچے۔''[24]

دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی قلات کی حکومت نے نیشنل پارٹی پر پابندیاں برقرار رکھیں۔ ان حالات میں نیشنل پارٹی نے ارکان نے خانیت میں حمایت کے لیے خان کے قانونی مشیر ایم اے جناح سے رابطہ کیا۔ انہوں نے جناح سے خان پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کی درخواست کی لیکن جناح نے انکار کر دیا لیکن یہ وعدہ کیا کہ ان کے مطالبات خان تک پہنچا دیئے جائیں گے۔[25] ان حالات میں نیشنل پارٹی نے نہرو سے رابطہ کیا جس نے کانگریس کی طرف سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ 1944ء کے اواخر میں نیشنل پارٹی آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانگریس (کانگریس کی حمایتی) میں شامل ہوگئی۔

محمد حسین عنقا اور میر غوث بخش بزنجو جیسے رہنما پارٹی کی پالیسیوں سے منحرف ہوگئے اور انہوں نے ہندوستان کے ساتھ قلات کے انضمام کی حمایت کر دی۔[26] انہوں نے خان اور اس کے آزاد بلوچستان پر مشتمل مطالبے کی مخالفت کی۔ پارٹی کے منشور اور موقف میں تبدیلی کے باعث پارٹی تقسیم وانتشار کا شکار ہوگئی۔ پارٹی کے بانی عزیز کرد اور شہباز خان نے پارٹی کی اس نئی پالیسی کی مخالفت کی۔ پارٹی کے سابق صدر شہباز خان نوشیروانی نے ایک نئی سیاسی پارٹی ''بلوچ لیگ'' کی بنیاد رکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک آزاد اور خود مختار بلوچستان کے لیے خان کی جدوجہد میں معاونت کی جائے۔[27] اس ضمن میں ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ پارٹی کی پالیسی میں تبدیلی بلوچ عوام کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ اس حوالے سے کافی دستاویزی شہادت موجود ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی کی طرف سے ہندی قوم پرستی کے حمایت کے باعث قلات میں اس کی مخالفت کی گئی۔ بہر حال، پارٹی نے کانگریس سے اپنا ناتا توڑ لیا اور بلوچ قوم پرستی کے حوالے سے اپنی پرانی حیثیت بحال کر دی۔

نیشنل پارٹی کے علاوہ برٹش افغانستان یا ''برٹش بلوچستان'' میں درج ذیل پارٹیاں زیادہ سرگرمِ عمل تھیں: (i) انجمن وطن (ii) مسلم لیگ

Scanned by CamScanner

وطن پارٹی

بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے مقصد کے حصول کی خاطر عبدالصمد اچکزئی نے 1938ء میں وطن پارٹی یا انجمن وطن کی بنیاد رکھی۔ 1939ء میں اچکزئی نے آل انڈیا کانگریس پارٹی کے منشور کی حمایت کی اور وطن پارٹی کا کانگریس کے ساتھ الحاق کر دیا۔ 1954ء میں اچکزئی نے مغربی پاکستان ہائی کورٹ کو بتایا کہ وطن پارٹی کا کانگریس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن پارٹی کا ریکارڈ اور ذرائع ابلاغ کی اطلاعات اس موقف کی نفی کرتی ہیں۔[28] بہرحال، وطن پارٹی ''اصلاحات'' کے متعلق اپنا مطالبہ تسلیم کروانے میں ناکام رہی کیوں کہ برطانوی انتظامیہ نے اس مطالبے کی اس بنا پر مخالفت کی کہ ''برٹش بلوچستان'' کی آبادی بہت کم ہے جس کا رقبہ بھی بہت کم ہے اور کسی بھی انتظامیہ کے انصرام کے لیے اس کے پاس مالی وسائل بھی بہت کم ہیں۔[29]

مسلم لیگ

برٹش بلوچستان میں دوسری بڑی پارٹی، ''آل انڈیا مسلم لیگ'' تھی جس کی قیادت قاضی عیسیٰ (پشین کے ایک سوداگر کا بیٹا) کے پاس تھی۔ اس کی بنیاد 1938ء میں رکھی گئی اور 1939ء میں اس کی ازسرنو تنظیم کی گئی۔[30] انجمن کی مانند، اس پارٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بلوچستان میں آئینی اصلاحات متعارف کروائی جائیں۔ 1940ء میں پارٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی جس میں قراردادِ پاکستان منظور کی گئی۔[31] یہ امر بھی انتہائی اہم ہے کہ برٹش افغانستان پشتونوں میں بہت مقبول تھا۔ وطن پارٹی کی مانند لیگ کی انتظامیہ پر پشتون اور غیر بلوچ غالب تھے۔ وہ وفد جس نے برٹش افغانستان کو مسلم لیگ (1940ء) کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں پیش کیا، اس کی قیادت برٹش افغانستان کے پشتونوں کے ہاتھ میں تھی جن کے قائد قاضی محمد عیسیٰ تھے۔[32]

ریفرنڈم

جون 1947ء میں برطانوی حکومت نے برٹش ہندوستان کو دو خودمختار مملکتوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا: (i) ہندوستان (ii) پاکستان

مملکت پاکستان میں مندرجہ ذیل علاقے شامل تھے:

i. مشرقی بنگال (مسلم اکثریتی علاقہ)
ii. ضلع سلہٹ

Scanned by CamScanner

iii- مغربی پنجاب (مسلم اکثریتی علاقہ)

iv- شمال مغربی سرحدی علاقہ

v- برٹش افغانستان (مستقبل ریفرنڈم کے نتائج سے مشروط تھا)۔

vi- بلوچ قبائلی علاقے (مری، بگتی، کھیتران اور ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائلی علاقے)، جن کا مستقبل ریفرنڈم کے نتائج سے مشروط تھا۔

برٹش افغانستان میں ریفرنڈم اور بلوچ قبائلی علاقے کے متعلق ریفرنڈم کے انقلاب کے حوالے سے مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔ مسلم لیگی رہنما ایم اے جناح نے اس قسم کے منصوبے کی مخالفت کی جس میں ووٹ دینے کا حق شاہی جرگہ کے ارکان تک محدود کر دیا جائے۔ جناح صاحب نے انتخابی حلقے کے لیے مندرجہ ذیل تین متبادل تجاویز پیش کیں:[33]

1) حاملین راشن کارڈ (تقریباً بیس ہزار)

2) تمام قبائلی سردار (ملک اور معتبر: تقریباً پانچ سو)

3) ضلعی جرگوں کے تمام ارکان (تقریباً چار سو)

کانگریس کی پالیسی کے متعلق نہرو نے حکومت ہند کو لکھا:

1) ''منتخب سینئر عدالتی افسروں اور محکمہ خارجہ امور کے ممکنہ نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جاسکتا ہے۔ اس کمیشن کو جرگوں کے مکمل اجلاسوں کا اہتمام کرنا چاہیے اور ان اجلاسوں میں شرکت کے ذریعے معاملے کی نشاندہی کرنی چاہیے۔ وہ ووٹ حاصل بھی کر سکتے ہیں اور نہیں بھی۔ انہیں واقعی ہر اجلاس کے متعلق عمومی علم حاصل کرنا چاہیے اور اس کے مطابق مطلع کرنا چاہیے۔ اگر ضروری ہو تو کچھ جرگوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کمیشن کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔''

2) انہیں چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے مشاورت کریں اور محض شاہی جرگہ کے چند منتخب ارکان تک محدود نہ رہیں۔ جہاں تک کوئٹہ میونسپلٹی کے عوام کا تعلق ہے، ان کے لیے ریفرنڈم ممکن ہوسکتا ہے۔

برطانوی حکومت نے نہرو اور جناح کے خیالات سے کلی اتفاق نہ کیا۔ بلوچستان میں A.G.G نے اس امر پر رضامندی ظاہر کی کہ ''شاہی جرگہ'' موروثی اور غیر نمائندہ ہے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ریفرنڈم کے معاملے پر غور کرنے کے لیے ہر قبیلے سے ایک منتخب جرگہ شامل کیا جائے۔

Scanned by CamScanner

ریفرنڈم میں کوئٹہ کو شامل کرنے کی نہرو کی تجویز کی خان نے اس بنیاد پر مخالفت کی کوئٹہ، برٹش افغانستان کا نہیں بلکہ خانیت کا حصہ ہے۔ افغانستان کے عوام کی نمائندگی کے لیے لارڈ ماونٹ بیٹن نے منتخب جرگہ کی حمایت بھی کی۔ جہاں تک کوئٹہ کی نمائندگی کا تعلق تھا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو اس حوالے سے یوں مطلع کیا:

''بلوچستان کا قابل ذکر شہر کوئٹہ ہی ہے جہاں کی تقریباً تمام آبادی غیر بلوچ ہے۔ اس لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ بلوچستان کے مستقبل کے تعین کے ضمن میں اس کا کوئی فیصلہ کن ووٹ ہو۔''[34]

بہرحال، یہ تجاویز اور خیالات کسی بھی قسم کی ٹھوس شکل اختیار نہ کر سکے۔ برطانوی انتظامیہ نے بالآخر وقت کی کمی کے باعث ایک نمائندہ جرگہ منعقد کرنے میں اپنی نااہلیت کا اظہار کر دیا۔ بالآخر متعلقہ پارٹیاں، برٹش افغانستان اور بلوچ قبائلی علاقوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حوالے سے باہم متفق ہو گئیں۔

29 جون کو ریفرنڈم منعقد ہوا اور پشتون جرگہ کے ارکان کی اکثریت نے برٹش افغانستان کے پاکستان میں انضمام کی حمایت کی۔[35]

جہاں تک بلوچ قبائلی علاقوں کا تعلق تھا، برطانویوں نے انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق نہیں دیا۔ یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ شمال مغربی سرحدی علاقے (جس میں پشتونوں کی اکثریت ہے) اور بلوچ قبائلی علاقے کے متعلق برطانوی پالیسیوں میں تضاد تھا۔ اس لیے وہ نمائندہ جرگے پر متفق ہو گئے اور نمائندہ جرگے کا اہتمام کیا جب کہ انہوں نے بلوچ قبائلی علاقوں کے متعلق یکساں سطح پر مشتمل طرزِ عمل اپنانے سے انکار کرنے کے علاوہ بلوچ قبائلی علاقوں کے مستقبل کے فیصلے کے ضمن میں موروثی سرداروں کو اختیار دے دیا۔

بہرحال، مری اور بگٹی علاقوں کے بلوچ سرداروں، سردار ڈوڈا خان مری اور سردار محمد اکبر خان نے برطانوی حکومت کو خانیت میں شامل ہونے کے اپنے فیصلے کے متعلق تحریری یادداشت پیش کی۔ ڈیرہ جاٹ کے کئی دیگر بلوچ سرداروں نے خانیت کے ساتھ شامل ہونے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ برطانویوں نے ان تمام درخواستوں اور تجاویز کو نظرانداز کر دیا۔ جون 1946ء میں موروثی سرداروں کو پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ شامل ہونے کے ضمن میں ریفرنڈم میں شامل ہونے کا کہا گیا۔ سرداروں نے A.G.G. کو مطلع کیا کہ وہ خانیت کے حق میں ہیں لیکن A.G.G نے جواب

Scanned by CamScanner

دیا کہ انہیں پاکستان یا ہندوستان میں سے ہی انتخاب کرنا ہوگا[36] جس پر ان سرداروں نے پاکستان کے حق میں جواب دیا۔

خانِ قلات، میر احمد یار خان کی سیاست

میر احمد یار خان کی پیدائش لورالائی میں 1902ء میں اس وقت ہوئی جب ان کے دادا (میر خداداد خان)، والد (میر محمد اعظم جان) اور خاندان کے دیگر افراد مشکل حالات سے گزر رہے تھے یعنی برطانویوں کی قید میں مشقت برداشت کر رہے تھے۔ انہوں نے فارسی، عربی اور انگریزی میں اپنی ابتدائی تعلیم ایک استاد سے حاصل کی۔ ان کی شادی اسلامی اتحاد کے ایک علمبردار جمال الدین افغانی کی پوتی سے ہوئی۔ انہوں نے برطانویوں سے فوجی تربیت حاصل کی اور انہیں غیر فوجی اور فوجی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ انہوں نے بلوچستان کے گورنر جنرل (A.G.G) کے ایجنٹ کے ذاتی معاون کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ یہ تمام ذمہ داریاں خانیت کے ولی عہد کی حیثیت سے ان کی تربیت کا حصہ تھیں۔ مغربی تعلیم، یوسف علی خان مگسی جیسے بلوچ قوم پرستوں کے اثرات اور جمال الدین افغانی کے خاندان کے ساتھ تعلق نے ان کے سیاسی نظریات پر گہرے اثرات مرتب کیے اور یوں وہ بلوچ قوم پرستی اور اسلامی اتحاد کے ایک حمایتی کی حیثیت سے سامنے آئے۔[37]

1933ء میں وہ خان مقرر ہوئے۔ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے بلوچستان اور ہندوستان کے آئینی ماہرین اور سیاسی قائدین کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم کیے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم بمبئی کے سابق وکیل اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر، محمد علی جناح تھے۔[38]

اپنے دورِ حکومت (1933-1948ء) کے دوران انہوں نے آئینی اور جمہوری اصلاحات متعارف کروانے کے علاوہ بلوچستان کے لیے ایک آزاد، خودمختار مملکت کی حیثیت سے بین الاقوامی حیثیت کے حصول کے لیے جدوجہد کی۔ آئینی اور جمہوری حقوق کے متعلق انہوں نے قبائلی سرداروں اور بلوچ قوم پرستوں سے رابطہ کیا۔ دونوں نے ان کے منصوبے کی حمایت کی۔ پھر انہوں نے برطانوی حکومت سے اس حوالے سے مطالبات کیے:[39]

ان کے مطالبے کے جواب میں برطانوی حکومت نے ریاست میں ان کے اختیارات بحال کر دیئے لیکن یہ اختیارات A.G.G کی منظوری سے مشروط تھے۔ لیز پر لیے مری اور بگتی علاقوں کے متعلق اس کا مطالبہ دفاعی اور سلامتی وجوہ کی بنیاد پر مسترد کر دیا گیا۔[40]

Scanned by CamScanner

انہوں نے محسوس کرلیا کہ لیز شدہ علاقوں کا معاملہ، خانیت کی بین الاقوامی حیثیت کی بحالی سے منسلک ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے محمد علی جناح کو اپنا قانونی مشیر مقرر کیا تاکہ برطانویوں کے خلاف قانونی جنگ لڑی جاسکے۔[41] اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم ایک علیحدہ باب میں اس کے تاریخی پس منظر کا ذکر کریں گے تاکہ قارئین بلوچوں کی طرف سے حق خودارادیت کے مطالبہ سے آگاہ ہوسکیں۔

باب8

بلوچستان کی سیاسی حیثیت

پس منظر

1920ء سے ہی بلوچ قوم پرستوں کا یہ موقف رہا ہے کہ بلوچستان ایک آزاد اور خودمختار مملکت ہے۔ انہوں نے اس موقف کی مخالفت کی کہ بلوچستان، مغلوں، ایرانیوں، افغانیوں اور برطانویوں کی ایک محکوم ریاست ہے۔

1935ء میں میر احمد یار خان نے، جس کے بلوچ قوم پرستوں کے ساتھ قریبی روابط تھے، مطالبہ کیا کہ بلوچستان کو ایک علیحدہ، آزاد اور غیر ہندوستانی ریاست تسلیم کیا جائے۔ اس کی اس جدوجہد کی بلوچ قوم پرستوں، جناح اور چندریگر جیسے مسلم لیگی رہنماؤں کے علاوہ برطانوی قانونی ماہرین نے بھی حمایت کی لیکن برطانوی حکومت اور آل انڈیا کانگریس پارٹی نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔[1]

پہلے بلوچ وفاق کی ابتدائی بین الاقوامی حیثیت کے متعلق کچھ علم نہیں۔ پندرہویں صدی میں میر چاکر رند نے بلوچستان کو ہرات اور قندھار کے مغلوں کی ایک محکوم ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا۔ سولہویں صدی میں خانیت نے شیعہ ایران کے خلاف مغل ہندوستان کے ایک فوجی حلیف کی حیثیت اختیار کر لی۔ وفاقِ ڈیرہ جاٹ کے رہنماؤں نے خودمختار ہونے کی کئی کوششیں کیں لیکن دہلی کے مغل حکمرانوں نے ان کی کوششوں کو کچل دیا۔ سترہویں صدی تک اُس وقت ملک اور بلیدی قبیلے مکمل طور پر آزاد تھے جب کچھ عرصے کے لیے مکران، ایران کے نادر شاہ افشار کی ایک محکوم ریاست بن گیا تھا۔

1717ء میں قلات کے میر عبداللہ نے بلوچستان کی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس طرح اس نے مغل ہندوستان کی ایک محکوم ریاست کی حیثیت سے نجات حاصل کر لی۔ اس کے دورِ حکومت میں بلوچستان متحد تھا۔ میر عبداللہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا، میر مہابت، ایران اور افغانستان کے خلاف

Scanned by CamScanner

بلوچستان کی آزادی اور خودمختاری برقرار رکھنے میں ناکام ہوگیا۔[2] اس کے بعد 1758ء میں میر ناصر خان اعظم نے بلوچستان کی آزادی اور خودمختاری کو بحال کیا جس کے باعث 1787ء میں بلوچستان اور افغانستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

بلوچستان کی خانیت کو اپنے زیر تسلط لانے میں نادر شاہ درانی کی ناکامی کا نتیجہ ''عدم مداخلت'' پر مبنی ایک معاہدے کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس معاہدے کے تحت افغانستان نے بلوچستان کی خودمختار حیثیت تسلیم کر لی۔ افغانی قوم پرست مؤرخین اور افغانی حکمرانوں نے اپنی تحریروں اور سرکاری اعلانات میں یہ موقف اختیار کیا کہ بلوچستان اٹھارہویں صدی سے ہی افغانستان کا اٹوٹ انگ رہا ہے۔ اپنے اس دعوے کی حمایت میں وہ افغان جرگے کی کارروائیوں کا حوالہ دیتے ہیں جہاں ناصر خان اعظم نے افغانستان کے حکمران کی حیثیت سے احمد خان'' کے انتخاب میں حصہ لیا''۔ بلوچ روایتیں، جرگے میں بلوچوں کی نمائندگی کے موقف کو تسلیم نہیں کرتیں۔ بلوچ مؤرخین کا موقف ہے کہ میر مہابت (اس وقت کا خان) نے احمد شاہ کا طفیلی بننے سے انکار کر دیا۔ جرگے میں ناصر خان اعظم کی موجودگی، افغانستان کے دعوے کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر جائز ثابت نہیں کرتی:

(i) احمد شاہ کا انتخاب 1747ء میں ہوا جب ناصر خان کو بلوچستان کی نمائندگی کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا جب کہ اس کا بھائی، میر مہابت خان، بلوچستان کا واحد نمائندہ تھا۔

(ii) افغان جرگے میں میر ناصر خان کی موجودگی محض اتفاقیہ تھی۔ (وہ نادر شاہ کا قیدی تھا جہاں اس کا سامنا، نادر شاہ کے فوجی کمانڈار احمد خان سے ہوا، بعد ازاں احمد شاہ)۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد، ناصر خان، احمد شاہ کے ایک مہمان کے حیثیت سے قندھار میں بدستور ٹھہرا رہا۔ اس لیے جرگے میں اس کی موجودگی محض ایک تماشائی اور مہمان کی سی تھی۔[3]

بہر حال، ناصر خان اعظم نے 1749ء میں 1757ء تک آٹھ برس کے لیے افغانستان کی حکومت کے تسلط کو قبول کر لیا تھا۔ یہ ایک ایسے معاہدے کا نتیجہ تھا جس کے تحت احمد شاہ نے اپنے جانشینوں کی طرف سے بلوچستان پر حکومت کرنے کے حق کی حمایت کی تھی۔ لیکن ناصر خان کو اپنی طفیلی حیثیت پسند نہ تھی۔ گل خان کے مطابق، اس نے اپنی آزادی کا اعلان کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کیا۔ 1758ء میں اس نے اپنی مکمل خودمختاری کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں افغانستان اور بلوچستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ افغان فوج، بلوچستان کو فتح کرنے میں ناکام رہی اور بالآخر اسے

Scanned by CamScanner

عدم مداخلت پر مبنی ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑے۔ یہ معاہدہ، جو خانیت کی حقیقی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت ظاہر کرتا ہے، اسے ماہرین نے نظرانداز کیا ہے:

میر ناصر خان کی خارجہ اور دفاعی پالیسیاں مندرجہ ذیل نکات کی عکاس ہیں:

(i) افغانستان، ایران، سلطنت اومان اور ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ ناصر خان کے سفارتی تعلقات قائم تھے، نیز افغانستان، سلطنت اومان، ایران اور ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ کئی سفیروں کا تبادلہ کیا گیا تھا۔

(ii) قندھار (افغانستان) کے شاہ کی مانند خان، سندھ اور ڈیرہ جاٹ کے اپنے محکوم صوبوں سے خراج وصول کرنے میں بااختیار تھا۔

(iii) جب کبھی بھی احمد شاہ، ہندوستان یا ایران پر حملہ آور ہوا، اس نے ناصر خان سے بطور خودمختار حکمران کوئی مطالبہ کرنے یا اسے حکم دینے کی بجائے، اس سے مدد کی درخواست کی۔ مثال کے طور پر جب خان، حج پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو ایک بار احمد شاہ نے پنجاب کے سکھوں کے خلاف مدد کے لیے اسے حکم دینے کی بجائے اس سے درخواست کی۔[4]

(iv) عباسی خلیفہ کے زمانے سے ہی اسلامی ممالک کے حکمرانوں (سلطانوں) کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ خلیفۂ اسلام سے اپنی خودمختار ریاستوں کی منظوری حاصل کرتے۔ اپنے والد کی مانند، ناصر خان اعظم کو خلیفہ کی طرف سے ایک خودمختار حکمران تسلیم کیا گیا تھا۔ بلوچ خانیت کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت واضح کرنے کے لیے حکومت قلات نے برطانوی حکومت کو لکھا:

''ریاستِ قلات، ہندوستان کا حصہ ہے نہ ہی کبھی اس کا حصہ رہی ہے۔ یہ کوئی ہندوستانی ریاست بھی نہیں ہے۔ برطانوی حکومت کی آمد سے قبل، بلوچستان صرف اس سرزمین کو کہا جاتا تھا جہاں بلوچ قبائل (ایک اصطلاح جس میں بروہی قبائل بھی شامل ہیں) قیام پذیر تھے اور اس طرح اپنے ایک حکمران، خانِ قلات کے تحت ایک خودمختار ریاست قائم ہوگئی تھی۔ اس امر کا شافی دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ خوانین بلوچستان، ریاست قلات کے موجودہ حکمران کے عظیم آباواجداد، جو اس زمانے میں خانیت کہلاتے تھے اور جو اکثر اپنے علاقوں پر آزادانہ حکومت کرتے تھے، نہ صرف ان کے ہمسایہ افغانی اور ایرانی حکمران انہیں خودمختار حکمرانوں جیسا عزت واحترام دیتے بلکہ خلیفۂ اسلام نے خانیت کو ''خوانین قلات'' کا خطاب بھی مرحمت فرمایا۔''

Scanned by CamScanner

(v) جب کبھی بھی ہندوستان اور ایران کی طرف سے حملہ ہوتا تو خانِ قلات، افغانستان کے حکمرانوں کی مدد کرتا۔ اس موقع پر شاہ، اس کا ولی عہد یا اس کا ذاتی نمائندہ، جو خان کے عہدے کے برابر ہوتا، خان کا استقبال کرتا۔ مزید برآں، ہندوستان اور ایران پر حملے کے دوران حاصل ہونے والا مالِ غنیمت اور غلام، حکمرانوں میں مساوی تقسیم کیے جاتے۔

(vi) 1974ء میں جب میر ناصر خان اعظم نے انتقال کیا تو اس کی تجہیز و تکفین میں افغان اور اومانی نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ استنبول میں خلیفہ اسلام اور شاہِ ایران نے تعزیت کے پیغامات بھجوائے۔ شاہِ ایران نے خان کے مساوی مرتبے کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ''شاہِ بلوچستان'' کے خطاب سے پکارا۔

(vii) 1810ء، 1836ء اور 1838ء میں ہرات کے شاہ محمود اور کابل کے شاہ شجاع نے اپنے مخالفین کے خلاف فوجی مدد چاہی لیکن اس درخواست کو میر محمود خان اور میر مہابت کی طرف سے رد کر دیا گیا۔

(viii) 1872ء میں دربارِ قلات میں روسی سفیر کا استقبال کیا گیا اور خان نے برطانوی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔[5]

برطانوی نقطہ نظر

ہندوستان کی برطانوی انتظامیہ، خانیت کی بین الاقوامی حیثیت کو روس (1917ء سے سوویت یونین) کے ساتھ وسطی اور جنوب مغربی ایشیا میں بطور ایک حریف طاقت کے ساتھ تعلقات کے تناظر میں سمجھتی تھی۔ 1838ء میں برطانویوں نے معزول افغانی حکمران شاہ شجاع کی حکمرانی میں بلوچستان پر مشتمل ایک افغانی سلطنت تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کی خاطر، برطانوی نمائندے، لیچ اور بعد ازاں سر اے برنز بھیجے گئے تا کہ خان، میر مہراب خان کے ساتھ کوئی معاہدہ طے کیا جائے۔ خان نے کوئی بھی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ اس کے باعث وہ محکوم بن سکتا تھا جو معاہدہ عدم مداخلت (1758ء) کی خلاف ورزی ہوتا۔ بہر حال، اس کے بیٹے میر ناصر خان دوم کو برطانویوں نے 1841ء میں ایک معاہدہ طے کرنے پر مجبور کر دیا جس کے تحت برطانویوں اور شاہ شجاع کو اپنے برتر آقا تسلیم کرنا تھا۔

اسی برس افغانستان میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہوا: شاہ شجاع، جو برطانویوں کی طرف سے مسلط کیا گیا تھا، اسے قتل کر دیا گیا اور برطانوی فوج مکمل طور پر تباہ کر دی گئی۔ اب برطانویوں نے اپنے

Scanned by CamScanner

مفادات کے تحفظ کے لیے بلوچستان کے متعلق دوبارہ اپنی پالیسی تبدیل کرلی۔ 1842ء میں برطانوی حکومت روسی خطرے سے نمٹنے کے لیے ایک نیا معاہدہ طے کیا۔ اس نئے معاہدے کے ذریعے 1841ء کا معاہدہ منسوخ ہوگیا اور خان کو ایک خودمختار حکمران تسلیم کرلیا گیا۔ خان کو برطانویوں کے دشمن کی مخالفت پر مجبور ہونا پڑا، نیز اسے دوست ہمسایوں کے ساتھ خط وکتابت کی بھی اجازت دے گئی۔ اس کے عوض برطانوی حکومت نے بیرونی حملے کی صورت میں سالانہ پچاس ہزار اور فوجی امداد کا وعدہ کیا۔

1862ء میں میر خداداد خان نے ایک معاہدہ طے کیا جس کے تحت بلوچستان اور برطانوی ہند کے درمیان حد بندی کی نشاندہی کی گئی۔ اس معاہدے کی رُو سے خانیت کو واضح طور پر ہندوستان کی ایک ہمسایہ ریاست قرار دیا گیا۔[6]

خان، میر خداداد خان اور اس کے سرداروں کے درمیان خانہ جنگی کے دوران، خاران کے سردار، آزاد خان نے کابل کے امیر، شیر علی خان سے خان کے خلاف امداد کے حصول کے لیے رابطہ کیا۔ اس کے عوض، آزاد خان نے افغانیوں کو خراج دینے کی پیشکش کی۔ خاران کے معاملات میں خان کی مداخلت کے خلاف، امیر شیر علی نے برطانوی حکومت سے احتجاج کیا۔ خان نے برطانوی حکومت کو مطلع کیا کہ خاران، بلوچستان کا ایک ناگزیر حصہ ہے اور آزاد اس کا محکوم سردار ہے۔ برطانوی حکومت نے خان کے جواب سے اتفاق کیا اور شیر علی نے بھی اس حیثیت کو قبول کرلیا۔[7]

1871ء میں شاہِ ایران نے ایرانی اور بلوچ سرحد کی نشاندہی کی تجویز پیش کی۔ 1871ء میں ہی کرمان کے گورنر، ابراہیم خان کی قیادت میں ایرانی وفد اور میر فقیر محمد بزنجو کی قیادت میں خانیت کے وفد نے، بلوچستان اور ایران کے مشترکہ سرحدی کمیشن کے چیف کمشنر جنرل گولڈسمتھ کی زیرِ نگرانی باہم ملاقات کی۔ جب معاہدہ طے پا گیا تو تہران میں برطانوی چانسری اور برطانوی ہند کے وائسرائے کے درمیان بلوچستان کی خانیت کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت زیرِ بحث آئی۔ درج ذیل برقی تار کے ذریعے بلوچستان کی بین الاقوامی حیثیت کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے:[8]

1) برقی تار مورخہ 24 اگست 1871ء، بہ وقت شام، تین بج کر دس منٹ

منجانب: جناب الیسن، تہران

بجانب: وائسرائے، شملہ؛

"۔۔۔ایران کی خواہش ہے کہ میں ایک سرکاری خط میں یہ بیان کر دوں کہ قلات

(خانیت) ایک آزاد ملک ہے اور اس کی سرحدوں پر مشتمل علاقہ اس کی ہی مخصوص ملکیت ہے۔''

(2) برقی تار نمبر 1823P، مورخہ 28 اگست 1871ء

منجانب: وائسرائے، شملہ،

بجانب: جناب الیسن، تہران:

''۔۔۔ بلاشبہ قلات، برطانوی سرحد پر ایک خودمختار اور آزاد مملکت ہے لیکن 1854ء کے معاہدے کے تحت، میں سمجھتا ہوں، آپ کے پاس شق 3 کی نقل ہے، خان پر لازم ہے کہ وہ تعاون کرے اور ہماری رضامندی کے بغیر دیگر طاقتوں کے ساتھ مذاکرات سے باز رہے۔ شاہ کے وزیر کے روبرو ان شقوں کی وضاحت کریں۔''

1875ء میں برٹش حکومت نے بلوچستان میں عدم مداخلت کی پالیسی تبدیل کردی اور لارڈلٹن نے ''فارورڈ پالیسی'' کی حمایت کی تاکہ روسی ''پیش قدمیوں'' کو روکنے کے لیے زیادہ سے زیادہ فوجی سہولیات حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد لارڈلٹن اور خان، میر خداداد خان کے درمیان ایک نیا معاہدے طے پایا۔ اس نئے معاہدے کے ذریعے 1854ء کے معاہدے کی توثیق کی گئی اور خان کو ایک خودمختار حکمران اور برطانوی حکومت کے ایک حلیف کے علاوہ، دوست ہمسائے کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔

بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق لارڈلٹن کا نقطہ نظر

دسمبر 1876ء میں لارڈلٹن نے خان کو یکم جنوری 1877ء کو منعقدہ شاہی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ خان نے یہ دعوت قبول کرلی اور اپنے سرداروں کے ساتھ اس اجلاس میں شرکت کی۔ اس تقریب کے دوران، ہندی ریاستوں کے درمیان برطانوی پرچم تقسیم کیے گئے مگر خان کو کوئی پرچم نہیں دیا گیا۔ لارڈلٹن نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ملکہ کو بلوچستان کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت کے متعلق مطلع کیا: ''خان کا کہا گیا کہ وہ پرچم لے لے۔ عالی جناب کو بتایا گیا کہ یہ پرچم صرف جنابہ عالیہ کے محکوموں کو عطا کیا گیا اور وہ ایک خودمختار شہزادے کی حیثیت سے اپنی خودمختاری پر سودا کیے بغیر پرچم وصول نہ کرسکا۔''[9] اس کے علاوہ، لٹن کے خط کے ذریعے مندرجہ ذیل حقائق فراہم ہوتے ہیں: (i) ''مقامی'' ریاست کا اطلاق بلوچستان پر نہیں ہوتا۔[10]، (ii) وائسرائے نے خان کا استقبال کیا اور وائسرائے نے عین اسی طرح جوابی دورے کیے جیسے اس نے مسقط کے امام (سلطان) کے معاملے میں کیے۔ مقامی یا ہندوستانی شہزادوں کا استقبال وائسرائے کی بجائے برطانوی حکام کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

وائسرائے نے ان سے ملاقاتیں کیں لیکن جوابی دوروں پر ان کے ہاں نہیں گیا۔

برطانوی پالیسی میں تبدیلی

انیسویں صدی کے اواخر میں عبدالرحمٰن، کابل کا امیر مقرر ہوگیا۔ اس نے بلوچستان کی مانند ایک حلیف کی حیثیت قبول کرلی اور اس کے لیے سالانہ امداد مقرر کردی گئی۔ برطانویوں کے حمایت یافتہ افغانستان میں ضم ہونے کے باعث بلوچستان اس لیے اپنی اہمیت سے محروم ہوگیا کیوں کہ اب سٹریٹجک اہم راستے اور علاقے، برطانوی تسلط میں تھے۔ سنڈیمن کے جانشین، سر جے براؤن (Sir.J.Brown) نے خودمختار خان کو معزول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی جو بلوچستان کی خانیت اور برطانیہ کے درمیان طے پایا تھا۔ اس ضمن میں خان کو کوئٹہ آنے کی دعوت دی گئی اور اس الزام کے تحت گرفتار کرلیا گیا کہ خان نے اپنی رعایا کے دو افراد کو قتل کیا تھا۔ خان کی بجائے اس کے بڑے بیٹے میر محمود دوم کو خان مقرر کیا گیا۔[11]

معاہدوں کی خلاف ورزی اور برطانوی کٹھ پتلی خان کے کردار کے باعث بلوچستان کی سیاسی حیثیت تبدیل ہوگئی۔ برطانویوں نے قلات کے لیے ایک نیا آئین تشکیل دیا۔[12] خان نے برطانوی انتظامیہ کی براہ راست نگرانی میں قلات پر 40 برس حکومت کی۔ جب بلوچ اور افغانی سرحد کے علاوہ ایرانی اور بلوچ سرحدوں کی بھی نشاندہی کی گئی اور برطانوی ہند نے انہیں دوبارہ تشکیل (1895-96ء) دیا تو حکومت قلات سے مشاورت نہیں کی گئی۔ خانیت کی سیاسی حیثیت کی تبدیلی کے متعلق میر محمود دوم کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے نہیں آیا۔

1924ء میں میر محمود دوم کی صحت خراب ہوگئی جس کے باعث برطانوی خوف زدہ ہوگئے کہ نیا خان محکوم حیثیت تسلیم نہیں کرے گا جو میر محمود دوم کے دورِ حکومت میں قائم ہوئی تھی۔ کرنل کیئز (Col Keyes)، قلات کے پولیٹیکل ایجنٹ کی معاونت کے ساتھ سر فریڈرک جانسٹن (Sir Frederik Jhonston) کو بلوچستان خانیت کی سیاسی اور آئینی حیثیت کا جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ خانیت کی آئینی اور بین الاقوامی حیثیت کا جائزہ لینے کے بعد، سر جانسٹن نے برطانوی حکومت کو خبردار کیا کہ ''جارحانہ کردار کا مالک کوئی نیا خان اپنے حقوق کے تحت 1876ء کے معاہدے کو درست سمجھے گا اور اس معاہدے کے تحت دی گئی خودمختاری کا دعوے دار ہوگا۔ اس نے لکھا کہ اس قسم کا خان برطانیہ سے درخواست کرسکتا ہے کہ اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت بند کی جائے اور خانیت کی خودمختار

Scanned by CamScanner

حیثیت کا احترام کیا جائے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ 1876ء کے مطابق خان کو دی گئی خودمختاری کے ساتھ برطانوی ہند کی مغربی سرحدوں پر قلات جیسی پسماندہ ریاست کو اپنے زیر تسلط لانے کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ اس نے حکومت سے کہا کہ بلوچ خانیت کی غیر ہندی اور خودمختار حیثیت تبدیل کرنے کی خاطر ایک نیا معاہدہ کیا جائے۔ میر محمود دوم نے نیا معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا اور خانیت کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت تبدیل کرنے کا برطانوی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔[13] میر محمد اعظم جان کو 1932ء کو برطانویوں نے خان تسلیم کر لیا۔ نئے خان کو برطانویوں کی طرف سے ''ہندوستانی شہزادوں کے چیمبر'' کی رکنیت اختیار کرنے کے لیے کہا لیکن خان نے انکار کر دیا۔[14]

1933ء میں میر احمد یار خان، خان بن گیا اور قلات کی خودمختار اور سابق حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی۔ جنوری 1935ء میں خان نے برطانوی حکومت کو لکھا کہ خانیت کی بین الاقوامی حیثیت بحال کر دی جائے۔[15]

1935ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ متعارف ہوا جس کے تحت خانیت کو ہندوستان کا حصہ قرار دیا گیا۔ خان نے برطانوی حکومت کے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیا جو اس کے خیال کے مطابق 1876ء کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ 10 جون 1939ء کو برطانوی حکومت نے خان کو مطلع کیا کہ عالی جناب (شاہی تاج کے نمائندہ) کے نزدیک 1876ء کا معاہدہ ہر لحاظ سے جائز اور درست ہے اور اس کے ذریعے برطانویوں اور قلات کے درمیان تعلقات قائم ہیں۔[16] بعد ازاں، وزیر اعظم نے سیاسی اور خارجہ امور کے محکمے کی سیکریٹری کو ایک خط لکھا جس میں حکومت کی تشویش کا اظہار کیا گیا:

''یہ بات درست ہے کہ قانونِ حکومت ہند 1935ء کے مطابق قلات، ہندوستان میں واقع ایک ریاست ہے لیکن اس قانون کا مسودہ تیار کرنے کے دوران ایک فریق کی حیثیت سے اس ریاست سے مشاورت نہیں کی گئی۔ مزید یہ کہ اپنے علاقوں کی انتظامیہ کے لیے منظور کیا گیا قانون کسی بھی طرح، دوسری حکومت کے علاقوں پر اثرات مرتب نہیں کرتا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو برطانوی حکومت کے لیے یہ امر یکساں طور پر قانونی ہوتا کہ قانون میں اس حوالے سے ایک شق متعارف کروانے کے ذریعے ایران اور افغانستان کی سرحدوں کو ہندوستان میں شامل کر لیا جاتا۔''[17]

اکتوبر 1940ء میں خان نے وائسرائے لارڈ لنلتھگو (Lord Linlithgow) کو ایک خط لکھا جس میں ایک خودمختار ریاست کے ایک قائد کی حیثیت سے دہلی میں اپنا ایک نمائندہ بھیجنے کے اپنے حق کا

Scanned by CamScanner

مطالبہ کیا: ''روزانہ تبدیل ہوتے حالات کے پیش نظر اور میری ریاست کے متعلق مسائل کے حل کے ضمن میں تاخیر سے احتراز کرنے کی خاطر، میں 1876ء کے معاہدے کی شق، عالی جناب کے علم میں لانا چاہتا ہوں جس کے تحت حکومت ہند میں قلات کے ایک بااختیار نمائندے کو مقرر کرنے کی گنجائش موجود ہے تاکہ غلط فہمی کے تمام تر امکانات سے گریز کیا جا سکے تاکہ ریاست کے متعلق حقائق کی درست وضاحت کی جا سکے اور ریاست کے قانونی و جائز حقوق و مفادات کا تحفظ ہو سکے۔''[18]

19 اکتوبر 1940ء کو بلوچستان میں برطانوی ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل (A.G.G) کے ایجنٹ، آبرے میٹکالف (Aubrey Metcalfe) نے سیکریٹری محکمہ خارجہ امور، کوئٹہ (Caroe) کے نام اپنے ایک خط میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنے خط میں اس نے بلوچستان خانیت کی حکومت کو ہندی ریاست سے کہیں مختلف ریاست قرار دیا۔[19]

1942ء میں کرپس مشن کی ہندوستان آمد ہوئی اور اس نے بلوچستان کی خودمختار خانیت کے معاملے کو پیش کیا۔ 25 مارچ 1942ء کو خان نے سر سٹیفورڈ کرپس کو ایک برقی تار کے ذریعے لکھا:

''مجھے امید کامل ہے کہ کرپس مشن کو کامیابی نصیب ہوگی اور آپ کی بروقت مداخلت سے عمومی طور پر ہندوستان اپنا مقصد حاصل کرنے اور خصوصی طور پر ریاست قلات، ہندوستان کے ایک دوست ہمسائے کی حیثیت سے اپنی سیاسی اور تاریخی حیثیت بحال کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔''

اسی برس، حکومت ہند کے وزیر خارجہ نے خانیت کے متعلق برطانوی پالیسی سے وائسرائے کو مطلع کیا اور اس کے آزاد، خودمختار اور غیر ہندی ریاست ہونے سے انکار کر دیا۔ حکومت ہند کے فیصلے سے خان کو جون 1942ء میں آگاہ کیا گیا۔ برطانوی حکومت کی قانونی حیثیت درج ذیل تھی:

I. جب خانِ قلات نے 1903ء اور 1911ء کے درباروں میں شرکت کے لیے دہلی کا دورہ کیا تو اس کا عین اسی طرح استقبال کیا گیا جس طرح برابر عہدوں کے دیگر ہندوستانیوں کا کیا جاتا ہے۔[20]

II. یہ درست ہے کہ کسی بھی خان نے ہندوستانی شہزادوں کے چیمبر کی رکنیت اختیار نہیں کی۔ 1933ء میں جب خان کو چیمبر کی رکنیت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی تو اس کے وزیراعظم نے 20 فروری 1933ء کو لکھے گئے ایک خط میں اس چیمبر میں خان کی شرکت سے خان کی مصروفیات کی بنا پر معذرت کی۔ اس امر سے انکار کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ خان، چیمبر کا رکن ہے۔ اس کے برعکس، اس خط کا اثر یہ ہوا کہ خان نے اس حیثیت کو قبول کر لیا کہ اسے چیمبر کی رکنیت حاصل کرنے کا حق ہے۔[21]

Scanned by CamScanner

III. خانیت، قانون حکومت ہند کے مطابق ایک ہندی ریاست تھی۔[22]

خان نے برطانوی حکومت کا نقطہ نظر قبول نہ کیا لیکن اس فیصلے کی مخالفت کرنے یا اس وقت کوئی بھی فضول اختلافی سوالات اٹھانے کے تاثر سے گریز کیا کیوں کہ اس وقت برطانوی جنگ میں مصروف تھے۔ بلوچستان میں ریزیڈنٹ اور A.G.G نے محکمہ خارجہ امور کے سیکریٹری کو مطلع کیا کہ خان، جنگ کے اختتام پر اس سوال کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے۔[32] دوسری جنگ عظیم کے بعد 1946ء میں خان نے اس معاملے کو دوبارہ اٹھایا۔

مارچ 1946ء میں برطانوی کابینہ مشن کی ہندوستان آمد ہوئی اور خان نے خانیت کی خودمختاری کے معاملے پر مشن کے ساتھ ملاقات کے ضمن میں ایم اے جناح کے ساتھ مشورہ کیا۔ جناح کا خیال تھا کہ خان کو علم تھا کہ کس طرح سفارتی لحاظ سے معاملات طے پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خان ان کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی دے گا اور اس پارٹی میں کابینہ مشن اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ یوں جناح کی رہائش گاہ پر ایک پارٹی منعقد کی گئی۔ اس سے قبل جناح نے کبھی ایسی شان دار پارٹی منعقد نہ کی تھی۔ اس استقبالیے میں کابینہ مشن کے ارکان سمیت 500 کے لگ بھگ معززین نے شرکت کی۔[24] اس ٹی پارٹی کے موقع پر ایم اے جناح نے ایک یادداشت کی صورت میں خانیت کا مقدمہ پیش کیا۔ اس یادداشت میں خانیت کی آئینی حیثیت کی وضاحت کی گئی تھی:

(i) بلوچستان کی خانیت ایک خودمختار اور آزاد ملک ہے جس کے برطانوی حکومت کے ساتھ تعلقات 1876ء کے تحت طے پاتے ہیں۔

(ii) خانیت، اس کی حکومت اور حکمران کبھی رضامند نہیں ہوئے کہ قلات کو انڈین یونین میں شامل کیا جائے۔

(iii) ہندوستان کے ساتھ بلوچستان کے تعلقات محض برطانوی حکومت کی وجہ سے ہیں۔

(iv) خانیت، ہندوستان میں برطانوی حکومت سے پہلے کی ایک آزاد اور خودمختار حیثیت کی طرف واپس لوٹ جائے گی۔

قلات کے وزیراعظم، نوابزادہ محمد اسلم نے 26 دسمبر 1946ء کو حکومت ہند کے سیکریٹری، پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ، گریفن (Griffin) کو پیش کی گئی ایک رپورٹ میں قلات کی آزاد اور خودمختار ریاست کا تاریخی پس منظر پیش کیا۔ اس رپورٹ میں برطانوی حکومت اور قلات کے درمیان تعلقات،

Scanned by CamScanner

لیز شدہ علاقوں اور ایک خودمختار ریاست کے طور پر اس کی بین الاقوامی حیثیت کے متعلق بحث کی گئی۔[25]

جنوری 1947ء میں خان نے وائسرائے، لارڈ ویول (Lord Wavell) سے ملاقات کی اور اپنا موقف پیش کیا۔ ویول نے لکھا: ''پھر میں نے خانِ قلات کو دیکھا جو ایک مستعد، ادھیڑ عمر اور پرانے انداز کا نہایت ہی نفیس اور شائستہ شخص تھا، جس کی برطانویوں کے ساتھ اپنی وفاداری کی پالیسی میں تبدیلی کی ناپسندیدگی پر رویے نے مجھے بے حد متاثر کیا اور یہ بھی کہ بلوچستان کا ہندوستان کے ساتھ کوئی حقیقی تعلق نہیں۔''[26] ویول کے ردِعمل کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔

11 اپریل 1947ء کو ایک کتابچے کی صورت میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ریاست قلات کے آئین کے علاوہ اقلیتی حقوق اور فلاحی ریاست جیسے معاملات کو تفصیلاً بیان کیا گیا۔ آئندہ خارجہ پالیسی اور جناح کے رویے کے متعلق یوں بیان کیا گیا:

''حکومت قلات، آئندہ اندرونی اور خارجہ امور میں ایک خودمختار مملکت کے مکمل حقوق استعمال کرے گی۔ یہ دوستانہ معاہدوں کے ذریعے اپنے ہمسایہ اسلامی حکومتوں افغانستان، ایران، عرب ممالک اور خاص طور پر پاکستان کے ساتھ تعلقات قائم کرے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ ہندوستان اور بیرونی دنیا کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات قائم اور معاہدات طے کرے گی۔ بلوچ عوام کو اس حقیقت کے متعلق بھی واشگاف انداز میں معلوم ہونا چاہیے کہ خانِ قلات اور جناح کی پالیسیوں میں کوئی فرق نہیں اور یہ بھی کہ خانِ قلات نے جناح کے ساتھ مشاورت کی ہے اور ان تمام معاملات کے ضمن میں ان سے مشورہ طلب کیا ہے۔ قلات کی آزادی، لیز شدہ علاقوں کی واپسی اور ریاست قلات کے ساتھ بلوچ علاقوں کے انضمام کے حوالے سے جناح مکمل طور پر متفق ہیں، نیز جناح نے ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا ہے۔''[27]

3 جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا۔ اس اعلان میں شہزادوں کی خودمختار حیثیت کو کابینہ مشن مورخہ 12 مئی 1946ء کی یادداشت کے مطابق برقرار رکھا گیا۔ اس یادداشت کے مطابق، اگر ایسی ریاستیں اپنی خودمختاری برقرار رکھنا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتی ہیں۔ 30 جولائی 1947ء کو جناح نے خودمختار ریاستوں کے حوالے سے پاکستان کی پالیسی کی وضاحت کی جس کے مطابق پاکستان ان کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائے گا، نیز جناح نے یہ اعلان بھی کیا کہ ان ریاستوں کو اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا بھی اختیار ہے۔[28]

Scanned by CamScanner

اس پالیسی کے نتیجے میں 4 اگست 1947ء کو برطانوی حکومت، حکومت پاکستان اور حکومت قلات کے نمائندوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کا اعلان 11 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ اس معاہدے کے پہلی شق کے مطابق، ''حکومت پاکستان، قلات کو ایک آزاد، خودمختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اور اس کی یہ حیثیت ہندوستانی ریاستوں کی حیثیت سے مختلف ہے۔[29] ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کے بعد، ریاست قلات غیر ملکی مداخلت کے باعث اپنی آزادی اور خودمختاری برقرار رکھنے میں ناکام ہوگئی۔ ستمبر 1947ء کو برطانوی حکومت نے کراچی میں اپنے ہائی کمیشن کے ذریعے حکومت پاکستان کو خانیت کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے خطرات سے آگاہ کیا۔[30] برطانوی حکومت کے مشورے پر پاکستان نے ایک توسیع پسندانہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے بلوچستان کے حکمران کو اپنے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور کردیا۔ 28 مارچ 1948ء کو بلوچستان، پاکستان میں انضمام کے ذریعے اپنی بین الاقوامی حیثیت سے محروم ہوگیا۔

آئینی حیثیت

اس مسئلے کو سمجھنے کی خاطر ہم برطانیہ اور پاکستان کی حکومتوں کی تبدیل ہوتی ہوئی پالیسیوں کا تجزیہ کریں گے۔ نہرو نے لکھا: ''برطانوی تاریخ کا احوال، خاص طور پر جسے برطانوی دَور کہتے ہیں، شدید قابل نفرت ہے، جہاں سچائی کہیں پاتال میں پوشیدہ ہے اور ہر طرف جھوٹ، برہنگی اور بے شرمی کا دور دورہ ہے۔''[31] بلوچستان کی بین الاقوامی آئینی حیثیت کا دارومدار مجموعی نوآبادیاتی مفاد پر ہے۔ اس کے عوض انہوں نے بلوچستان کو پہلے تو ایک خودمختار ریاست، افغانستان کی محکوم ریاست، ایک خودمختار حلیف، برطانوی ہند کی ایک اہم ریاست اور حتمی طور پر اسے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔

1894ء ہی سے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی پر مبنی پالیسی اپنائی جس کے تحت انہوں نے اس کا نیا آئین تشکیل دیا، ایک نیم قبائلی اور نیم جاگیردانہ نظام متعارف کرایا، نیز لیز اور دیگر ذرائع کے ذریعے اس کے علاقے ہتھیا لیے۔

جب خان نے بلوچستان کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت کا سوال اٹھایا تو برطانوی حکومت پریشان ہوگئی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ انہوں نے خان کی حوصلہ شکنی کی کوشش کی اور بالآخر اپنے ہی بنائے آئین سے انکار کرتے ہوئے خانیت کو ایک ''ہندی'' ریاست قرار دیا۔ اس برطانوی پالیسی کی

Scanned by CamScanner

معلومات خفیہ اور صیغۂ راز میں موجود دستاویزات سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

خلیج فارس کے دفاع کے تناظر میں بلوچستان نہایت اہمیت کا حامل ہے، نیز یہ برطانوی ہند کے دفاع کے ضمن میں اہم تھا۔ سوویت یونین کے منظرعام پر آنے کے ساتھ ہی رضا شاہ اوّل کی زیرِقیادت قوم پرستی کی طرف مائل ایران کا وجود، تہران میں سوویت یونین کی حامی حکومت کے قیام (1946-47ء) کے علاوہ سوویت یونین کی حامی حکومت افغانستان کے باعث مغربی بلوچستان میں کمیونسٹ رجحانات کی آمد، نیز بلوچستان میں سامراج مخالف ترقی پسندانہ اور قوم پرستانہ پالیسیوں کے باعث بلوچستان اور سوویت یونین کے درمیان تعلقات، برطانویوں کے لیے بہت بڑی تشویش کا باعث تھے۔[32] بہرحال، 1940ء میں A.G.G نے بلوچستان کو آزاد اور خودمختار غیر ہندی ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔ اس نے محکمہ خارجہ امور کے سیکریٹری کیرو (Caroe) سے درخواست کی کہ خان کو ایک غیر ہندی، خودمختار حکمران کے طور پر اس کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت سے آگاہ نہ کیا جائے۔

1877ء کی امپیریل اسمبلی میں برٹش ہند کی حکومت نے ''معاہدہ کی شرائط کے مطابق'' برٹش حکومت سے مکمل طور پر آزاد ایک خودمختار ریاست کی بنیاد پر خانِ قلات کی آزاد اور خودمختار حیثیت تسلیم کرلی۔ بہرحال، اس حیثیت کے متعلق حکومت ہند کی ہدایات کی روشنی میں سر رابرٹ سنڈیمن نے خان خداداد خان کو اس وقت نہایت ہی محتاط انداز میں مطلع کردیا۔ A.G.G نے مزید کہا کہ ''بلوچستان ایجنسی کے پہلی انتظامی رپورٹ میں شائع شدہ سرکاری پالیسی بلاشبہ، ایک خفیہ دستاویز ہے جس تک عالی جناب کو بھی رسائی حاصل نہیں ہونی چاہیے لیکن حکومت ہند کی اس دستاویز کے مندرجات بلاشبہ میرے دعوے کو تقویت بخشتے ہیں جس کے متعلق عالی جناب ایک خاص حیثیت، ہندوستان کی ایک طفیلی ریاست دینے کے متعلق فیصلہ کرسکتے ہیں۔''[33]

1944ء میں جب برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں کود پڑا تو جنرل آرمی منی (Genreal R.C.Money) نے ایک یادداشت بعنوان ''بعداز جنگ بلوچستان کی تعمیرِ نو'' پیش کی۔ اس یادداشت میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ جنگ کے بعد شاہی فوج کے انتہائی اہم پڑاؤ کے لیے بلوچستان ایک بہت ہی درست جگہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ برٹش ہند میں انتقالِ اقتدار کے بعد اس بنیاد پر برطانوی فوج کے پڑاؤ کے لیے بلوچستان نہایت ہی مناسب جگہ ہے کیوں کہ بلوچستان، برٹش ہند کا حصہ نہیں۔ فوج کی طرف سے اس یادداشت کو پسند کیا گیا جس کا اظہار جنرل منی کی طرف سے 18 نومبر 1944ء اور

Scanned by CamScanner

23 نومبر 1944 کو ویول کو لکھے خطوط کے ذریعے ہوتا ہے۔ فوج کی طرف سے لکھے ان خطوط کے ذریعے اس کی طرف سے جنرل منی کی اس دفاعی حکمت عملی سے اتفاق سامنے آتا ہے کہ جس کے مطابق بلوچستان کو افغانستان اور تبت کی مانند ایک علیحدہ ملک قرار دیا گیا تھا۔[34]

5 جون 1947ء کو حکومت ہند کے محکمہ خارجہ امور کے ایک آئینی مشیر، سر والٹر مونکٹن (Sir Warlter Monkton) نے حکومتی پالیسی سے اختلاف کیا اور 1876ء کے معاہدہ کی روشنی میں بلوچستان کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت کے متعلق اپنی رائے دی۔[35] ''مجھے اس امر سے اتفاق ہے ہے کہ قلات کوئی ہندی ریاست نہیں۔''

ہندوستان کے لیے برطانوی وزیر خارجہ نے خان اور آئینی ماہر سر والٹر مونکٹن کا موقف تسلیم نہ کیا۔ اس نے 2 اگست 1947ء کو وائسرائے کو لکھا:

''پارلیمنٹ میں ریاستوں کی طرف سے ایک علیحدہ بین الاقوامی ریاستوں کے دعووں کی فیصلہ شکنی ہمارے لیے پریشانی کا باعث رہی ہے اور قلات کی جانب سے اس قسم کے دعوے کی قبولیت یقیناً دوسری ریاست کو بھی اس قسم کے دعوے کرنے پر اکسائے گی۔ مزید برآں، سرحدی ریاستوں کی طرف سے اس قسم کے دعووں کو تسلیم کرنے میں خاص طور پر یہ خطرہ موجود ہے کہ یہ اپنی آزاد اور خودمختار حیثیت کو موثر بنالیں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کی وحدت کے لیے خطرہ ہونے کے علاوہ، نئی کمزور بین الاقوامی ریاستوں کا قیام نا قابل قبول ہے۔''[36]

11 فروری 1948ء کو ایک برطانوی قانونی ماہر، جے ایچ مورگن (J.H.Morgan) نے بلوچستان کی خانیت کے وزیر خارجہ، فیل (Fell) کو بلوچستان کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت کے متعلق اپنی رائے دی۔ اس رائے کے مطابق، بین الاقوامی قانون کے تحت، بلوچستان ایک آزاد، خودمختار اور غیر ہندی ریاست ہے۔''[37]

ایک بین الاقوامی ریاست کی حیثیت سے خانیت کے متعلق پاکستان کی پالیسی کا تعین جناح نے کیا جو؛

1. خان کے قانونی مشیر تھے،
2. آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے،
3. پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔

Scanned by CamScanner

1936-1947ء تک جناح نے ایک آزاد اور خودمختار بلوچستان کی حمایت کی لیکن ستمبر 1947ء میں پاکستان نے اپنی پالیسی تبدیل کر لی اور خان سے کہا کہ وہ پاکستان سے الحاق کر لے۔ جناح اور پاکستان کی تبدیل شدہ پالیسیاں، ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں، آل انڈیا کانگریس پارٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان اختلافات اور مفادات کا نتیجہ تھیں:

1. تحریک پاکستان کے لیے رقوم کے حصول کے لیے جناح اور مسلم لیگ نے ایک آزاد اور خودمختار بلوچستان کی حمایت کی۔[38]

2. پاکستان کے مطالبہ میں ناکامی کی صورت میں جناح کے نزدیک بلوچستان ہی آخری پناہ گاہ تھی۔[39]

خان کے موقف کے مطابق، جناح اور یوپی کے ایک ممتاز مسلم لیگی چوہدری خلیق الزماں کے درمیان ایک خفیہ معاہدے طے پایا تھا کہ ایک آزاد پاکستان کے مطالبہ میں ناکامی کی صورت میں، ایک آزاد اور خودمختار بلوچستان ان کے وطن، پاکستان کے حصول کے لیے ہندی مسلمانوں کی طرف سے مسلح جدوجہد میں ان کی مدد کرے گا۔[40]

3. خانیت کے سابق وزیر خارجہ فیل (Fell) کے مطابق، خانیت کو جناح نے اس لیے ایک آزاد، خودمختار اور غیر ہندی ریاست تسلیم کر لیا تھا تاکہ جانشین ریاست کی حیثیت سے لیز شدہ اور قبائلی علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھا جا سکے[41] ورنہ برطانوی حکومت کی عملداری ختم ہونے کے بعد یہ علاقے قلات کے پاس چلے جاتے۔ ان حالات میں، پاکستان 9,476 مربع میل پر مشتمل رقبے کے حصول کا حق دار ہوتا جہاں زیادہ تر پشتونوں یا برٹش افغانستان میں افغانوں کی آبادی تھی۔

Scanned by CamScanner

باب9

آزادی اور اس سے محرومی

1947ء میں برطانوی تسلط کے اختتام کے بعد خانیت کی حکومت ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ خان، میر احمد یار خان نے 15 اگست 1947 کو ایک عوامی جلسے میں آزادی کا اعلان کیا۔ انہوں نے نوآبادیاتی حکومت کے دَور کے برعکس جلسے سے بلوچی زبان میں خطاب کیا جب انگریزی، فارسی یا اردو میں تقریریں کی جاتی تھیں۔[1] خان نے اعلان کیا:

''مجھے بلوچی میں خطاب کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ جب بھی آئندہ میں آپ سے مخاطب ہوں گا، بلوچی زبان میں ہی تقریر کروں گا کیوں کہ یہ بلوچ قوم کی زبان ہے۔''

اپنے سیاسی نظریات اور آئندہ منصوبوں کے متعلق انہوں (خان) نے اعلان کیا:

''ایک غیر ملکی حکومت کے باعث میں نے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار نہیں کیا۔ آج ہمارا ملک آزاد ہے اور میں بغیر رکاوٹ کے اپنے نظریات کا علی الاعلان اظہار کر رہا ہوں۔''

انہوں نے اعلان کیا کہ ان کی آئندہ پالیسی کے رہنما اصول کے مطابق وہ خانیت کی حکومت کی آزادی اور خودمختاری کو محفوظ رکھنے کے علاوہ اس کا دفاع بھی کریں گے، نیز اس کے رہنما اصول بلوچ علاقوں کو ایک پرچم تلے متحد کر دیں گے: ''ہم مکمل آزادی اور بلوچ عوام کے اتحاد کے حصول تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ہم اپنے مقصد کے حصول تک مطمئن نہیں ہو سکتے۔''

خان نے اعلان کیا کہ ''خارجہ پالیسی کی بنیاد عدم مداخلت کے اصول اور تمام اقوام، خاص طور پر ہمسایہ اقوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہوں گے۔'' اپنی تقریر میں انہوں نے موروثی شہنشاہیت کی بنیاد پر سیاسی نظام کی مخالفت اور جمہوری اصولوں پر مشتمل بلوچ رواج (غیر تحریری آئین) کی حمایت کی۔

''لوگوں کی اکثریت اپنے برقی تاروں یا گفتگو میں میرے لیے شاہ (بادشاہ) یا ملکِ معظم کا

لفظ استعمال کرتی ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ شہنشاہیت کے ساتھ تعلق ہمارے فخر اور وقار کا باعث نہیں۔ مجھے بلوچ قوم اور اسلام کا خادم ہونے پر فخر ہے۔''

خان نے اعلان کیا کہ ''ہمارے آبا و اجداد خود کو شاہ یا شہنشاہ نہیں سمجھتے تھے۔ ناصر خان اعظم نے ہمارے خاندان کے لیے یہ وصیت چھوڑی ہے: ''آپ کو کامیابی اس وقت نصیب ہوگی جب آپ خود کو بلوچ قوم کا خادم سمجھیں گے۔ جس دن آپ نے خود کو اپنی قوم سے برتر سمجھنا شروع کیا، یقیناً اسی وقت سے آپ کی تباہی اور زوال کا آغاز ہو جائے گا۔''

تقریر کے بعد قومی پرچم لہرایا گیا۔ پرچم، سرخ اور سبز رنگوں پر مشتمل تھا جو انقلاب اور امن کی علامت ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سبز رنگ، قرآن اور سرخ رنگ، جہاد یا تلوار کی علامت ہے۔[2]

آئین

اسی مہینے خان کے فرمان (شاہی حکم) کے ذریعے ایک تحریری آئین نافذ کیا گیا۔ یہ تحریری آئین، تین حصوں پر مشتمل تھا: پہلے حصے میں خانیت کی حدود اور قانونی اصطلاحات کی تعریف بیان کی گئی تھی۔ دوسرے حصے میں خانیت کے لیے انتظامیہ کا ذکر تھا اور تیسرا حصہ مقننہ کے بیان پر مشتمل تھا۔ آئین میں سب سے اہم اور ممتاز شق یہ تھی کہ خودمختاری خانیت کی حکومت کا خاصا ہے جب کہ پارلیمنٹ، عوام کی نمائندہ ہے۔

مجلس وزرا

مجلس وزرا، وزیراعظم اور کابینہ کے ارکان پر مشتمل تھی۔ ان کا تقرر خان کی طرف سے کیا جاتا اور ان کا منصب خان کی خوشنودی کا محتاج تھا۔ مجلس وزرا کی ذمہ داری یہ تھی کہ ریاست کی انتظامیہ کی طرف اختیارات کے استعمال کے ضمن میں ملک معظم، خان کو معاونت اور مشاورت مہیا کی جائے۔ مجلس وزرا کے صدر، خان کی عدم موجودگی میں وزیراعظم، مجلس وزرا کا سربراہ ہوتا۔ خان کو غیر ملکی شہری سمیت کسی بھی شخص کو کابینہ کا رکن مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ مثال کے طور پر، وزیراعظم، نوابزادہ ایم اسلم اور وزیر خارجہ، ڈی وائی فیل (D.Y.Fell) دونوں غیر ملکی شہری تھے۔ ایک کا تعلق پاکستان سے اور دوسرے کا برطانیہ سے تھا۔ خان کی قطعی عملداری اور اختیار، بطور قوم بلوچوں کے مفاد میں نہ تھے۔ وزیراعظم اسلم نے اپنے عہدے پر موجودگی کے دوران پاکستان کے مفادات کے لیے کام کیا اور خان کے علاوہ بلوچ قوم کے لیے وفادار ثابت نہیں ہوا۔

Scanned by CamScanner

مقنّنہ

تحریری آئین میں مجلس قانون ساز کی ہیت ترکیبی بیان کی گئی تھی:

1. دارالامرا (ایوانِ قبائلی سرداران یا ایوانِ بالا)
2. دارالعوام (ایوان عام یا ایوانِ زیریں)

ایوانِ بالا، جھالاوان اور ساراوان کے صوبوں کے موروثی قبائلی سرداروں پر مشتمل تھا۔ اس کے 46 ارکان تھے جن میں سے 10 کو خان کی طرف سے مقرر کیا جاتا۔ ان دس ارکان میں سے آٹھ ارکان کو ایوانِ زیریں یا مجلس وزرا سے منتخب کیا جاتا تھا جب کہ باقی دو ارکان کو اقلیتی اقوام، مثلاً ہندوؤں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ کابینہ کے ارکان کو بحث میں حصہ لینے کی اجازت تھی لیکن انہیں ووٹ دینے کا اختیار نہیں تھا۔

مجلس قانون ساز کی مدت پانچ برس تھی لیکن خان کو مقررہ مدت سے قبل مجلس قانون ساز کو تحلیل کرنے کے علاوہ اس کی مدت میں اضافہ کرنے کا اختیار حاصل تھا جو ایک سال سے زیادہ نہ ہوسکتی تھی۔ ایوانِ بالا کی تحلیل کی صورت میں خان کی ذمہ داری تھی کہ چھ ماہ کے اندر اس کے آئندہ اجلاس کی تاریخ مقرر کرے۔ وزیراعظم، ایوانِ بالا کا صدر ہوتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں ایک سینئر وزیر کو ایوانِ بالا کی صدارت کے لیے کہا جاتا۔ خان کو اپنی مرضی کے مطابق ایوانِ بالا کا اجلاس طلب کرنے کا اختیار حاصل تھا لیکن سال میں ایک مرتبہ اس کا انعقاد لازمی تھا۔

ایوانِ زیریں 55 ارکان پر مشتمل تھا جن میں سے 50 منتخب اور بقیہ پانچ ارکان کی نامزدگی خان کی طرف سے ہوتی تھی۔ وزیراعظم، اس ایوان کا صدر تھا اور اس کی غیر موجودگی میں ایک سینئر وزیر، ایوانِ زیریں کے علاوہ ایوانِ بالا کی بھی صدارت کرتا۔ ایوان زیریں کے ارکان کی مدت پانچ برس تھی۔

تحریری آئین کوئی منفرد دستاویز نہیں بلکہ قانونِ قلات 1946ء کا محض چربہ تھا۔ خارجہ امور اور سزائے موت کے متعلق اس میں خان کے اختیارات بیان نہیں کیے گئے تھے، نیز اس میں شاہی خاندان کے حقوق و فرائض کا بھی ذکر نہیں تھا۔ مزید برآں رواج (غیر تحریری آئین) بھی فعال تھا۔

پارلیمان کے انتخابات

نفاذِ آئین کے فوراً بعد بلوچستان کی تاریخ میں پہلی بار ریاستِ قلات میں انتخابات منعقد ہوئے۔ ریاست قلات کی نیشنل پارٹی نے ایوان کی کل 51 میں سے 39 نشستیں جیت لیں۔ باقی نشستیں

Scanned by CamScanner

،آزاد امیدواروں کو حاصل ہوئیں جنہوں نے نیشنل پارٹی کے منشور کی حمایت کی تھی۔[3] یہ انتخابات، بلوچستان میں جمہوری قوتوں کی فتح تھے جنہوں نے 1920ء سے جمہوریت اور ایک آزاد و خودمختار عظیم تر بلوچستان کے لیے جدوجہد کی۔

بلوچ، پاکستان تعلقات

13 دسمبر کو خان نے ریاستی امور پر بحث کے لیے ایوانِ زیریں کا اجلاس طلب کیا۔ تین دن پر مشتمل اجلاس میں مندرجہ ذیل امور زیر بحث آئے:

1. بلوچستان کی قومی اور سرکاری زبان،
2. شریعت (اسلامی قوانین)،
3. بلوچ خانیت اور پاکستان کے درمیان، خاص طور پر الحاق کے معاملات کے متعلق تعلقات،

1) ایوان نے بلوچی کو بلوچستان کی قومی اور سرکاری زبان قرار دیا۔ سکولوں میں بلوچی زبان کو ذریعہ تدریس بنانے کی خاطر جائزہ لینے اور رپورٹ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

2) طویل بحث کے بعد ایوان نے باہم اتفاق کیا کہ شریعت کا نفاذ بلوچ معاشرے میں مشکل ہوگا جہاں لوگوں کے اپنے رسوم و رواج ہیں۔ ایوان نے اس کے متعلق بھی باہمی رضامندی کا اظہار کیا کہ شریعت کے بتدریج نفاذ کے لیے جائزہ لینے اور اپنی سفارشات پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔[4]

3) ستمبر 1947ء میں وزیراعظم نوابزادہ ایم اسلم اور وزیر خارجہ ڈی وائی فیل نے قلات اور پاکستان کے درمیان اگست 1947ء کے معاہدے کے تحت لیز شدہ علاقوں کے متعلق مذاکرات کرنے کے لئے کراچی کا سفر اختیار کیا۔ دونوں ممالک کے حکام کے درمیان ملاقاتیں، حکومت پاکستان کی پالیسیوں کے سبب بارآور ثابت نہ ہوئیں جس کا اصرار تھا کہ خانیت کی حکومت کا پاکستان کے ساتھ غیر مشروط انضمام کیا جائے۔ لہٰذا، اگست 1947ء کے معاہدے کے تحت ہونے والی ملاقاتیں منعقد نہ ہوئیں۔ خانیت کا وفد قلات واپس لوٹ آیا جہاں اس نے خان کو تمام احوال سے مطلع کیا۔ 20 ستمبر 1947ء کو پاکستان کے فارن سیکریٹری، اکرام اللہ نے خانیت کی حکومت کے وزیراعظم مسٹر اسلم کو ایک خط لکھا کہ مذاکرات کی بجائے خانیت کی حکومت کو پاکستان میں ضم کر دیا جائے۔

Scanned by CamScanner

''بحث کے دوران، آپ (اسلم اور فیل) نے بہت سے نکات اٹھائے جن کے متعلق ملک معظم مصالحت کے خواہاں ہیں۔۔۔اگر ہم ان نکات کے متعلق مذاکرات میں الجھ جائیں تو پھر ہم قلات کے متعلق دیگر اہم معاملات کے حوالے سے فوری مصالحت کی ضرورت سے صرفِ نظر کرلیں گے۔''[5]

دریں اثنا، برطانوی بلوچستان مسلم لیگ کے صدر قاضی محمد عیسیٰ نے خان سے ملاقات کی اور پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح کا پیغام پہنچایا جنہوں نے خان کو کراچی آکر خانیت اور پاکستان کے درمیان آئندہ تعلقات کے بارے میں مذاکرات کی دعوت دی۔ اکتوبر 1947ء میں خان کے پاکستان کے دورے سے قبل، انہوں نے اپنے وزیراعظم اور وزیرخارجہ کے ساتھ تمام ممکن طریقوں کے متعلق گفتگو کی۔ ان کے سامنے محض پانچ راستے تھے:

1. ایران کے ساتھ شمولیت
2. افغانستان کے ساتھ شمولیت
3. ہندوستان کے ساتھ الحاق
4. پاکستان کے ساتھ الحاق
5. برطانیہ کے ساتھ بطور زیرِ حفاظت مملکت، شمولیت

دونوں اقوام کے درمیان تاریخی مخاصمت کے باعث ایران کے ساتھ شمولیت ناممکن ہوتی۔ بلوچستان کا ایران کے ساتھ الحاق، جسے اپنی بلوچ آبادی کی طرف سے پریشانی کا سامنا تھا جو آزادی کا مطالبہ کررہی تھی، ایران کی طرف سے قابل قبول نہ ہوتا۔ حالاں کہ وزیرخارجہ مسٹر فیل اس بنیاد پر اس کے خلاف نہیں تھے کہ یوں بلوچ طویل عرصے تک متحد رہیں گے۔[6]

خان کے خاندان کے کچھ افراد، خاص طور پر خان کی بیوی جو افغانستان کے شاہی خاندان کی ایک فرد تھی اور سلطان ابراہیم نے افغانستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کی۔

فیل (Fell) نے یہ کہتے ہوئے مخالفت کی کہ ''افغانستان بیرونی مدد کے بغیر روس کے خلاف خود اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ یہ روسی عزائم کا ہدف بن سکتا ہے اور افغانستان کی آزادی کو مزید خطرہ ہوسکتا ہے، اگر زمین میں گھرے ہوئے ملک کی حیثیت سے کسی کے لیے اہم نہ ہونے کی نسبت اس کی سرحدیں سمندر کی طرف پھیل جائیں۔[7] ایک کٹر مسلمان اور کمیونزم مخالف ہونے کی حیثیت سے خان نے نہایت سختی کے ساتھ یہ حل مسترد کردیا۔[8] مزید برآں، یہ بلوچوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھا جو

Scanned by CamScanner

اپنے ملک کو افغانستان کی مانند آزاد اور اس کے برابر سمجھتے تھے۔

ہندوستان کے ساتھ الحاق جغرافیائی اور نہ سیاسی طور پر ممکن ہوتا اور پاکستان کے لیے کافی زیادہ اشتعال کا باعث ہوتا۔ اس کے علاوہ خان اور کانگریس کے رہنماؤں کے درمیان تعلقات 1946ء سے خراب ہو گئے تھے جب نہرو نے بلوچستان کی خانیت کی حکومت کی ایک آزاد و خودمختار ریاست کی حیثیت سے مخالفت کی۔ اگست 1947ء میں خانیت کی حکومت نے حکومت ہند کی توجہ پاکستان اور قلات کے درمیان معاہدے کی طرف توجہ دلائی جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت پاکستان نے خانیت کی حکومت کو ایک آزاد اور خودمختار حکومت کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ خان کی حکومت نے حکومت ہند کو اسی قسم کے ایک معاہدے کی پیشکش کی۔ بعد ازاں، خان کے نمائندے سر سلطان احمد نے خانیت کی طرف سے دہلی میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنے کی درخواست کی۔ خانیت کے نمائندے کو مطلع کیا گیا کہ یہ درخواستیں قبول نہیں کی جا سکتیں۔ ان حقائق کی روشنی میں، خان نے اس حل کو مسترد کر دیا۔[9] پاکستان کے نزدیک بلوچستان میں رائے عامہ کے دباؤ کے سبب یہ بہت مشکل تھا جس کا اظہار ریاست قلات کی نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم سے کیا گیا تھا جس نے عظیم تر بلوچستان کی تحریک کی بنیاد کی حیثیت سے ایک آزاد اور خودمختار خانیت کی حکومت کی حمایت کی تھی۔[10] خان نے اسلم کو پاکستان کے ساتھ ایک آبرومندانہ معاہدہ طے کرنے کا حکم دیا۔ جہاں تک خلیج فارس کی عرب ریاستوں کی مانند برطانیہ کے ساتھ زیر تحفظ ملک کی حیثیت سے شامل ہونے کا تعلق تھا، فیل (Fell) کے مطابق، ''بلاشبہ اس قسم کا خیال خان کے ذہن میں موجود تھا کہ قلات کی آزادی کے لیے ایک طاقت ور حمایتی کی ضرورت ہوگی۔''[11] فیل نے خان کو مطلع کیا کہ بلوچستان کو اس قسم کی حیثیت حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ دسمبر 1947ء میں جب فیل، برطانیہ گیا تو اس نے کامن ویلتھ ریلیشنز آفس کے ایک اہلکار مائلز کلاسن (Miles Clausen) کے ساتھ مشورہ کیا جس نے اس بنیاد پر اس حل کو ناقابل عمل قرار دیا کہ اس کے باعث پاکستان ناراض ہوگا، نیز برطانیہ بھی قلات کو ایک ہندی ریاست سمجھتا ہے۔ اس نے قلات اور پاکستان کے درمیان مصالحت اور معاہدے کی حمایت کی۔[11]

درحقیقت، برطانوی حکومت نے اپنی عملداری اور حکومت ختم ہونے سے قبل خانیت کی آزاد اور خودمختار حیثیت کی انتہائی مخالفت کی۔ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس قسم کی پیش رفت سے پیدا ہونے والے خطرات سے خبردار کر دیا گیا تھا جو اس نے حکومت

Scanned by CamScanner

پاکستان کے گوش گزار کر دیئے۔[12]

خان، ایک مجوزہ معاہدے کے ساتھ جناح کی دعوت پر پاکستان گئے جسے وہ حکومت پاکستان کے ساتھ مذاکرات کی بنیاد کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ خانیت کی طرف سے مجوزہ معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے ساتھ معاہدہ طے کیا جائے۔ اس مجوزہ معاہدے میں کہا گیا تھا:

1. خانیت کی حکومت کی آزاد اور خودمختار حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔
2. کسی بیرونی حملے کے خلاف بلوچ خانیت کی حکومت کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جائے۔
3. متعلق ممالک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت پر مبنی پالیسی اپنائی جائے اور اختلافات کو پُرامن طریقوں سے حل کیا جائے۔[13]

ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے کراچی پہنچنے پر سفارتی آداب کے خلاف خان کا استقبال پاکستان کے گورنر جنرل نہ ہی وزیراعظم نے کیا۔ یہ خانیت کی حکومت کے حوالے سے پاکستان کی پالیسی میں واضح تبدیلی کا ایک اشارہ تھا۔ جناح نے خان کے ساتھ ایک برطانوی ہند کے ایک ماتحت شہزادے جیسا رویہ اپنایا جس کے باعث خان کو بہت پریشانی ہوئی۔ جناح نے خان کو مشورہ دیا کہ بلوچستان خانیت کی حکومت کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر دیا جائے اور کہا کہ وہ اس سے بہتر کوئی اور راستہ تجویز نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی پالیسی میں تبدیلی کی وجہ برطانوی حکومت کا مشورہ تھا۔ پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر نے انہیں خانیت کی حکومت کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست تسلیم کرنے کے خطرات سے خبردار کیا۔[14]

بہرحال، خان نے جناح کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: ''چونکہ بلوچستان مختلف قبائل کی سرزمین ہے، اس لیے کسی بھی فیصلے سے قبل بلوچ عوام سے مشورہ کرنا ہوگا۔ مروّج بلوچ روایت کے مطابق، بلوچ عوام کو اعتماد میں لیے بغیر میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جو انہیں منظور نہ ہو۔''[15]

برطانوی پالیسی اور قلات کے لیے ہتھیار

پاکستان سے واپسی پر خان کسی غیرملکی جارحیت کے خلاف خانیت کی حکومت کے دفاع کے متعلق تشویش میں مبتلا تھے۔ انہوں نے خانیت کے سپہ سالار بریگیڈیئر جنرل پرویز کو حکم دیا کہ افواج کی تنظیم نو کی جائے اور اسلحہ کے علاوہ گولہ بارود اور گولیوں کا بندوبست کیا جائے۔ جنرل پرویز نے دسمبر 1947ء میں اپنے برطانیہ کے دورے کے دوران کامن ویلتھ ریلیشنز آفس اور وزارتِ رسد سے رابطہ

Scanned by CamScanner

کیا[16]۔ 25 مارچ کو برطانیہ کی وزارتِ رسد نے کامن ویلتھ ریلیشنز آفس کے اہلکار ایل سی پنل (L.C.Pinnel) کو آگاہ کیا کہ حکومت پاکستان کی منظوری کے بغیر کوئی جنگی سامان فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ بعدازاں، کامن ویلتھ ریلیشنز آفس نے پاکستان میں برطانیہ کے ہائی کمشنر کو مطلع کیا کہ پاکستان کی منظوری کی شرط پر مندرجہ ذیل قیمت (اندازاً) کا سامان گودام میں دستیاب ہے:

a) اسلحہ (بشمول 1500 رائفلیں، 4 چھوٹی توپیں اور 6 وکر (Vickers)) 7,960 پاؤنڈ
b) گولیاں (تقریباً 5 ملین راؤنڈ) 80,000 پاؤنڈ
c) کپڑے اور کمبل 7,200 پاؤنڈ

یہ معلومات 2 اپریل 1948ء کو پاکستان میں برطانیہ کے ہائی کمیشن کو اس وقت بھجوائی گئیں جب خانیت کی حکومت کو الحاق کے لیے پہلے ہی مجبور کیا جاچکا تھا۔ برطانوی حکومت کی طرف سے دانستہ تاخیر کے باعث پاکستان کو بلوچستان میں فوجی کارروائی کے دوران فائدہ پہنچا۔[17]

قلات پارلیمان اور الحاق

پاکستان کے دورے کے دوران، خان نے جناح کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ بلوچستان خانیت کی حکومت کی پارلیمان کے ساتھ مشاورت کے بعد جواب دیا جائے گا۔ بلوچ آئین کی رُو سے خان، مطلق العنان حکمران نہ تھا اور پارلیمان کو الحاق جیسے اہم معاملات پر فیصلہ سازی کا حق حاصل تھا۔ دسمبر کی 12 تاریخ کو خان کی طرف سے الحاق (Accession) کے معاملے پر بحث کرنے کے لیے دارالعوام کا اجلاس طلب کیا گیا۔

فیل (Fell) نے ایوان کو مطلع کیا کہ پاکستان نے معاہدہ تعلقات قائم کرنے سے انکار کردیا ہے اور غیر مشروط الحاق (Accession) کا مطالبہ کیا ہے۔[18] اس کی تقریر کے بعد ایوان کے ان ارکان نے تقریر کی جن پر ریاست قلات کی نیشنل پارٹی کا گہرا اثر تھا۔ قائد ایوان، غوث بخش بزنجو نے حکومت پاکستان کے غیر دوستانہ طرزِ عمل پر تنقید کی اور خبردار کیا کہ بلوچ کسی بھی قسم کی توہین اور ظلم برداشت نہیں کریں گے اور قومی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں گے۔[19] ایوان کے دیگر ارکان نے میر بزنجو کے خیالات کی حمایت کی۔[20] ایک طویل بحث کے بعد ایوان نے متفقہ طور پر 14 دسمبر 1947ء کو درج ذیل قرارداد منظور کی: ''پاکستان کے ساتھ تعلقات، دو خودمختار ریاستوں کی بنیاد پر الحاق کے ذریعے ہی نہیں بلکہ معاہدہ دوستی کے ذریعے قائم کیے جانے چاہئیں۔''[21]

Scanned by CamScanner

4 جنوری 1948ء الحاق کے معاملے پر بحث کرنے کے لیے دارالامراء کا اجلاس منعقد ہوا۔ ایوانِ بالا نے دارالعوام کے فیصلے کی تعریف کی۔ ایوانِ بالا کی اکثریت نے، جس میں کیچ مکران کے گچکی سردار بائی خان بھی شامل تھے، درج ذیل قرارداد منظور کی:

''یہ ایوان کسی بھی ایسے قابل احترام اور دوستانہ معاہدے کو قبول کرے گا جو خان اعظم اس شرط پر حکومت پاکستان کے ساتھ کرنا چاہتے ہوں کہ اس ملک کی خودمختاری برقرار رکھی جائے گی۔ لیکن یہ ایوان پاکستان کے ساتھ الحاق پر رضامند نہیں جو بلوچستان کے الگ وجود کے لیے خطرہ ہے۔''[22]

وزیراعظم اسلم نے پارلیمان کی کارروائی کی ایک نقل کے ساتھ کراچی کا دورہ کیا۔ اس نے جناح سے ملاقات کی اور الحاق کے معاملے پر بات چیت کی۔ فروری میں قلات واپسی پر، وہ اپنے ساتھ خان کے نام جناح کا ایک خط لے کر آئے جس پر 2 فروری 1948ء کی تاریخ درج تھی۔ اس خط میں جناح نے پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کا دوبارہ مطالبہ کیا تھا۔[23]

الحاق کے متعلق پاکستان کی پالیسی

11 فروری 1948ء کو جناح کی سبی (ایک قدیم شہر اور پہلے بلوچ وفاق کا دارالحکومت) آمد ہوئی جو سابق برٹش بلوچستان میں واقع ہے، جہاں اگلے روز خان اور جناح کے درمیان ایک ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ 13 تاریخ کو ان کے درمیان ڈھاڈر، خانیت کا سرمائی دارالحکومت، میں ایک اور ملاقات ہوئی۔ 14 تاریخ کو ہونے والی ملاقات خان کی ''اچانک'' بیماری کے باعث منسوخ کر دی گئی۔

اپنی اچانک بیماری کا ذکر کرتے ہوئے خان نے حکومت پاکستان اور جناح پر بلوچستان خانیت کے ضمن میں غیر دوستانہ اور غیر منصفانہ پالیسی اختیار کرنے کا الزام عائد کیا:

''جب دوسری مرتبہ سبی میں قائداعظم سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ حکومت پاکستان نے بعض ترمیمات اور تبدیلیوں کے ساتھ الحاق کی ایک اور دستاویز تیار کی ہے اور مجھے اس نظرثانی شدہ دستاویز پر نظر ڈال لینی چاہیے۔

جب میں نے مسودے کا مطالعہ کیا تو مجھے حیرانی ہوئی کہ اس میں حکومت ہند کے قانون 1935ء اور قانونِ آزادی 1947ء کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنیادی مسودے میں موجود نہ تھا جو قلات کی تاریخی حیثیت پر نہایت ہی شدید انداز میں اثرانداز ہوا۔۔۔ میرے عزائم ہمیشہ سے ہی نیک رہے ہیں۔ الحاق کی دستاویز میں ترمیم میرے لیے حیرانی کا باعث ہونے کے علاوہ انتہائی پریشانی کا موجب

بھی ثابت ہوئی۔ گزشتہ ماہ کے دوران بہت زیادہ کام کرنے کے باعث میرے ذہن وبدن پر مضر اثرات مرتب ہوئے اوراب یہ آخری تنکا میرے شدید اضطرابی خلل کے لیے کافی تھا۔ میں بیمار ہوگیااور اس نئی تبدیلی کے باعث بہت ہی مایوس اور دل گرفتہ ہوا۔۔۔ میری علالت اس قدر شدید تھی کہ میں اگلے روز قائداعظم کوالوداع کہنے بھی نہ جاسکااورانہیں محض ایک الوداعی خط ہی تحریر کرسکا۔"[24]

4 فروری کو جناح کے ایک خصوصی نمائندے، کرنل ایس بی شاہ نے خان کے ساتھ ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران خان نے الحاق کی دستاویز میں ترمیم پر احتجاج کیا جو پاکستان کے خارجہ سیکریٹری اکرام اللہ کے وعدے کی خلاف ورزی تھی جس کا ذکراس کے خط مورخہ 20 ستمبر 1947ء میں موجود تھا۔ مندرجہ بالا خط میں اکرام اللہ، الحاق کی دستاویز میں ترمیم کے ذریعے خانیت کی حکومت کو ایک ممتاز اور نمایاں حیثیت دینے کے لیے تیار تھا۔ خان نے جناح کے نام مورخہ 14 فروری 1948ء کا ایک خط کرنل ایس بی شاہ کے حوالے کیا جس میں خان کی طرف سے ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا۔ جناح کو خان اور پارلیمان کے رویے سے بے حد مایوسی ہوئی۔ یوں 9 مارچ 1948ء کو خان کو مطلع کیا گیا کہ عالی جناب اب پاکستان اور قلات کے درمیان آئندہ تعلقات کے ضمن میں ریاست قلات کے متعلق مذاکرات کے حوالے سے ذاتی طور پر حصہ نہیں لیں گے۔[25] کرنل ایس بی شاہ کو اسلم کی معاونت سے خانیت کے معاملات سے نمٹنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی جسے دو جاگیردار سرداروں غلام قادر، جام لسبیلہ اور میر حبیب اللہ نوشیروانی، نواب خاران سمیت خان اور اس کے سرداروں کی اندرونی چپقلش اور مخاصمت کا بخوبی علم تھا۔

جام لسبیلہ، میر ناصر خان اعظم کے دَور سے ہی بلوچستان خانیت ایک محکوم ریاست تھی اور شادیوں کے ذریعے خان کے گھرانے سے منسلک تھی۔ برصغیر میں برطانوی عملداری ختم ہونے سے پہلے ہی جام نے ایک محکوم حکمران کی حیثیت سے انکار کرنے کی کوشش کی۔ 6 جولائی 1947ء کو جام نے بلوچستان میں A.G.G کو ایک خط لکھا جس میں اس سے درخواست کی گئی کہ لسبیلہ کو ایک آزاد وخودمختار ریاست تسلیم کیا جائے۔[26] اسی مہینے اسے A.G.G کی طرف سے مطلع کیا گیا کہ وہ خانیت کا ایک محکوم حکمران ہے۔ A.G.G نے مزید لکھا کہ 1939ء میں جب سر میٹکالف (Sir Metcalf) نے جام کو خانیت کی محکوم ریاست کے طور پر لسبیلہ کی آئینی حیثیت سے مطلع کیا تو جام نے اس حیثیت کو تسلیم کرلیا تھا اور خلاف ورزی کی صورت میں خان کو اپنی عملداری قائم رکھنے کی خاطر ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کا حق

Scanned by CamScanner

حاصل تھا۔ یہ پیغام خاران کے سردار کو بھی بھجوایا گیا۔ دونوں سردار اپنی حیثیت سے غیر مطمئن تھے۔

انہوں نے فروری 1948ء کے اواخر میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کی کوشش کی لیکن جناح نے انکار کر دیا۔[27] خانیت کی طرف سے پاکستان سے الحاق کے انکار کے باعث پاکستان کو خاران اور لسبیلہ کے محکوم سرداروں کے خلاف براہ راست معاملے طے کرنے کا موقع حاصل ہو گیا اور لسبیلہ اور خاران کے سرداروں کو حکومت پاکستان نے مدعو کر لیا۔ ان دونوں محکوم سرداروں کے علاوہ خان کا برادرِ نسبتی اور خانیت کی حکومت کے ایوانِ بالا کا رکن سردار بائی خان لچکی بھی کراچی چلا گیا۔ قلات کے حکمران نے لکھا: ''میں نے نواب بائی خان کو علاج کے لیے کراچی جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی ساتھ اس پر زور دیا کہ وہ سرداروں کی ریاستی کونسل کے آئندہ اجلاس میں شرکت کے لیے 25 مارچ یا زیادہ سے زیادہ 30 مارچ (1948ء) تک واپس آ جائے۔''[28]

سردار بائی خان کے خانیت کے ساتھ کچھ مالی مسائل تھے کیوں کہ وہ ضلع کیچ (صوبہ مکران) کی آمدن کا نصف حصہ خانیت کو ادا کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا۔[29]

سردار بائی خان 1947ء سے ہی خفیہ طور پر اپنے بھائی شاہ عمر کے ذریعے پاکستانی حکام سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کراچی آمد پر وہ خانیت کے محکوم سرداروں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ انہوں نے 17 مارچ 1948ء کو جناح سے ملاقات کی اور انہیں مطلع کیا کہ اگر پاکستان ان کی طرف سے الحاق کی پیشکش کو فوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر وہ قلات کے خان کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے دیگر اقدامات اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔[30] انہوں نے خان پر مندرجہ ذیل الزامات عائد کیے:

1) چاغی اور مکران لیوی دستوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش،
2) خاران کے عوام کو سردار کے خلاف بھڑکانے کی کوشش،
3) اس ہدایت کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کی مکران روانگی کہ عوام میں بائی خان کے خلاف بے چینی پھیلائی جائے،
4) درۂ بولان پر آمد و رفت پر قابو پانے کی کوشش،
5) بلوچستان میں جناح کے خلاف جھوٹا اور نفرت انگیز پراپیگنڈا پھیلانے کی کوشش۔

جناح کے ساتھ ملاقات کے بعد، بلوچستان کے سرداروں کی درخواست کے متعلق غور اور

Scanned by CamScanner

گفتگو کرنے کے لیے پاکستانی کابینہ کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا۔[31] کابینہ نے اس پیشکش کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ خان پر پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے دباؤ ڈالا جائے۔ 17 مارچ کو حکومت پاکستان نے ایک غیر آئینی طریقہ اختیار کیا اور جناح نے محکوم سرداروں کے علاوہ مکران کے سردار بائی خان کی طرف سے الحاق کی درخواست قبول کر لی۔ اس موقع پر جناح نے بائی خان کے کردار کی تعریف کی: ''بائی خان! لسبیلہ اور مکران کے موجودہ سردار، برطانویوں کی پیداوار ہیں جب کہ آپ پاکستان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں!''[32]

18 مارچ کو پاکستان کی وزارتِ خارجہ امور نے ذرائع ابلاغ کے لیے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ پاکستان نے مکران، خاران اور لسبیلہ کے الحاق کو قبول کر لیا ہے۔[33] ان علاقوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے ساتھ ہی قلات اپنے نصف سے زیادہ علاقے کے علاوہ ایران اور افغانستان کے ساتھ اپنے تعلقات سے محروم ہو گیا اور سمندر کی طرف جانے والے راستے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔[34] پاکستان نے مندرجہ ذیل بنیادوں پر اپنی غیر آئینی کارروائی اور جارحیت کو جائز قرار دیا:

1) خان، اپنے ایک ایجنٹ (زیادہ امکان یہی ہے کہ برٹش بلوچستان سے کانگریس کے حمایتی ایک رہنما، عبدالصمد خان اچکزئی) کے ذریعے بھارت سے الحاق کرنے کی پیشکش کر رہا تھا اور قلات کے ہوائی اڈوں کے استعمال کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے تیار تھا۔

2 خان نے افغانستان کو مکران کے ساحل پر واقع بندرگاہیں استعمال کرنے کی پیشکش کی۔

3) جب خانیت کی حکومت کے ''الحاق'' کی خبریں قلات پہنچیں تو خان نے برطانوی تحفظ کے حصول کے لیے کوششیں کیں۔

بلوچستان خانیت کی حکومت نے اس پر احتجاج کیا اور ان الزامات کی تردید کا مطالبہ کیا۔ پاکستان نے اس احتجاج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خان پر پاکستان کے مفادات کے خلاف سازش کا الزام عائد کیا۔ خان نے اس الزام سے انکار کیا، نیز عالمی عدالت انصاف کے علاوہ اقوامِ متحدہ جانے کی دھمکی دی۔[35] خان نے حکومت پاکستان کے علاوہ جناح کو بھی اس غداری کے ضمن میں تنبیہ کی۔ اس نے کہا: ''اگر قلات کو الحاق پر مجبور کر دیا گیا تو اس میں ہماری مرضی شامل نہیں ہوگی۔''[36]

قلات کی محکوم ریاست کے الحاق کے بعد حکومت پاکستان نے قلات کو تقسیم کرنے کی پالیسی اپنا لی۔ وزارتِ امورِ خارجہ کے جائنٹ سیکریٹری کرنل ایس بی شاہ نے بلوچ سرداروں وڈیرہ بنگلزئی،

Scanned by CamScanner

سردار شاہوانی اور سردار سنجرانی سے رابطہ کیا تا کہ انہیں رشوت دی جا سکے۔ انہیں پیشکش کی گئی کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں انہیں خود مختار حیثیت دی جائے گی۔[36] دریں اثنا، سردار رئیسانی نے کرنل ایس بی شاہ کو اپنے تعاون کی پیشکش کی۔ بہر حال، جب کہ یہ سازشیں جاری تھیں، آل انڈیا ریڈیو نے 27 مارچ 1946ء کو اعلان کیا کہ خان نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے متعلق مذاکرات کرنے کے لیے اپنا نمائندہ بھیجا ہے۔ خان نے اسی روز ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ایک برقی تار کے ذریعے احتجاج کیا: ''اس شر انگیز خبر کی میں شدید تر دید کرتا ہوں، جس کو سن کر مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ حکومت قلات نے کسی بھی شکل میں ایسی کوئی درخواست نہیں کی ہے۔ میری عالی جناب سے درخواست ہے کہ ذرائع بلاغ کے ذریعے اس امر کی تردید کی جائے کہ حکومت قلات کی جانب سے کوئی نمائندہ، حکومت ہندوستان کی طرف بھیجا گیا ہے۔''[37]

ہندوستان اور قلات

30 مارچ 1948ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل نے خان کے نام ایک برقی تار میں آل انڈیا ریڈیو کی اس اطلاع کے متعلق معذرت کا اظہار کیا اور اسے ایک غلطی قرار دیا۔[38] اسی روز نہرو نے ہندوستانی پارلیمان کو بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو کی خبر ''غلط اطلاع'' کا نتیجہ ہے اور اس ضمن میں معذرت کی۔[38]

''ہندوستان کے ساتھ ریاست قلات کے الحاق کے متعلق قلات کے حکمران کے نمائندوں یا حکومت ہند کی طرف سے کبھی بھی کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ ریاستِ قلات کے جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر اس قسم کا کوئی سوال قطعی طور پر پیدا نہیں ہوتا۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت ہند اور قلات کے درمیان سیاسی مذاکرات کے متعلق غیر ملکی ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی اطلاعات مکمل طور پر بے بنیاد ہیں۔ یہ بیان کہ حکومت ہند کی طرف سے ریاست قلات کو رقم دی گئی ہے، اور یہ بھی کہ حکومت ہند نے قلات میں ہوائی اڈوں کی دستیابی کے لیے کہا ہے، قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔''

اسی روز ماؤنٹ بیٹن نے خانِ قلات کے احتجاج کے متعلق بات چیت کے لیے وی پی مینن کو ملاقات کے لیے طلب کیا۔ ملاقات کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے درج ذیل تحریری بیان دیا:

''جہاں تک قلات کا تعلق ہے، مینن صاحب نے کہا کہ جناح صاحب نے انتقالِ اقتدار کے وقت اس ریاست کی خود مختاری کو تسلیم کیا تھا۔ بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ قلات کا پاکستان کے ساتھ

Scanned by CamScanner

الحاق ناگزیر ہے۔ چوں کہ اس ریاست پر کسی بھی قسم کے دباؤ کا کوئی اثر نہ تھا، اس لیے اس کے سرداروں کی طرف سے الحاق کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اس میں دخل اندازی کے اقدامات کیے گئے۔ مینن صاحب کا خیال تھا کہ اس معاملے اور حیدر آباد کے معاملے میں بھی اسی قسم کا رویہ اپنایا جاسکتا ہے۔"[39]

خانیت کی حکومت کا خاتمہ

بہر حال، قلات کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے پر مبنی پاکستان کی پالیسی اور مینن کے بیان نے خان کو پریشان کر دیا۔ اب ان کے سامنے درج ذیل دو متبادل راستے تھے:[40]

1) پاکستان کی طرف سے حملے کی صورت میں محل چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو جائیں اور ایک فیصلہ کن جنگ لڑیں، نیز اقوامِ متحدہ سے رابطہ کیا جائے اور خانیت کی حکومت کے دفاع کی خاطر دوستوں کی تلاش کی جائے۔

2) الحاق کا مطالبہ قبول کر لیا جائے۔

مسٹر فیل نے پہلے متبادل راستے کی اس بنیاد پر مخالفت کی کہ سوویت یونین کو اپنے مفاد کی خاطر بلوچ آبادی میں مداخلت کا موقع مل سکتا تھا۔ قلات نیشنل پارٹی کے ارکان کے علاوہ بلوچ لیگ، شہزادہ عبدالکریم کے گروپ، شہزادہ سلطان ابراہیم اور ایک نئی قائم شدہ سیاسی تنظیم، مظلوم پارٹی کے سربراہ شیر محمد مری نے پہلے متبادل راستے کی حمایت کی۔[41]

بہر حال خان نے جو مسٹر فیل کے زیر اثر تھے، یہ متبادل راستہ مسترد کر دیا۔ اپنے آباواجداد کی طرف سے مزاحمت کی روایتوں کے برعکس، جو بلوچستان کی خودمختاری کی خاطر ایرانیوں، افغانیوں اور برطانویوں کے ساتھ لڑتے رہے، خان کو پارلیمان کی منظوری کے بغیر "الحاق" کا اعلان کرنے میں ہی "دانش مندی" نظر آئی۔[42]

28 مارچ کو انہوں نے اپنے اس فیصلے کے متعلق حکومت پاکستان کو آگاہ کیا اور خانیت کی حکومت پاکستان کا حصہ بن گئی۔ قوم پرستوں نے ان کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ ایک بلوچ مصنف لکھتا ہے: ناصر اوّل نے سب کو متحد کیا۔ ناصر دوم نے اس اتحاد کو برقرار رکھا۔ ناصر خان، حکومت کی تنظیم کے لیے زندگی بھر لڑتا رہا۔ محمود خان دوم نے ریاست کے لیے کفن تیار کیا اور موجودہ خان، احمد یار خان نے اپنے آباواجداد کے تمام وقار اور شان وشوکت کو دفن کر دیا۔"[43]

Scanned by CamScanner

بلوچ قومی مزاحمت (1948ء)

خانیت کی حکومت کے سربراہ میر احمد یار خان کو الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ خان کوئی مطلق العنان بادشاہ نہیں تھا، اسے رواج (بلوچ آئین) کے تحت رویہ اپنانا چاہیے تھا، نیز اسے پارلیمان کی منظوری کے بغیر انضمام کی دستاویز پر دستخط کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔[44] خان نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے کہ اس نے انضمام کی دستاویز پر دستخط کر کے اپنے اختیار سے تجاوز کیا تھا۔[45] خان کا موقف یہ تھا کہ اس کے غیر آئینی قدم کے باوجود بلوچ قوم کی طرف سے احتجاج کی ایک آواز بھی نہیں اٹھی۔[46] حقائق خان کے موقف کی تردید کرتے ہیں۔ خانیت کی حکومت کے زبردستی انضمام کے خلاف خانیت بھر میں پاکستان مخالف جلسے اور جلوسوں کا انعقاد ہوا۔[47] عوامی جذبات سے نمٹنے کے لیے پاکستانی فوج کو ہوشیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ حکومت پاکستان نے 15 اپریل 1948ء کو خانیت کی حکومت کی انتظامیہ کا مکمل انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بلوچستان میں تعینات A.G.G نے جناح کے احکامات پہنچائے کہ خانیت کی حکومت کی وہ حیثیت کبھی بحال نہیں کی جائے گی جو سابقہ برطانوی راج میں تھی۔[48] بلوچستان خانیت کی حکومت کی انتظامیہ کے انصرام کی خاطر ایک پولیٹیکل ایجنٹ تعینات کیا گیا۔ خان نے اس نئی صورتِ حال کو بادلِ نخواستہ قبول کر لیا اور پاکستان کے گورنر جنرل، محمد علی جناح کے فیصلے پر یوں تبصرہ کیا:

''یوں بطور خانِ اعظم میری قانونی بااختیار حیثیت، 15 اپریل 1948ء کو اختتام کو پہنچی اور احکامات ملنے کے بیس گھنٹوں کے اندر ہی امورِ قلات سے میرا تعلق قطع ہو گیا، نیز حکومت قلات کے کئی وزرا کو جلاوطن کر دیا گیا یا گرفتار کر لیا گیا۔

میں نے جو سماجی و معاشی اور انتظامی اصلاحات متعارف کروائی تھیں، اچانک واپس لے لی گئیں۔۔۔ قلم کی ایک جنبش سے بلوچ نمائندہ پارلیمان اور بلوچ وفاق توڑ دیا گیا۔''[49]

بلوچستان خانیت کی حکومت کے متعلق حکومت پاکستان کی پالیسی کے علاوہ، جناح نے بلوچستان کی خودمختاری قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا بلکہ انہوں نے بدنام سنڈیمن نظام برقرار رکھنے کی خاطر بلوچ سرداروں کے مطالبات تسلیم کر لیے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بلوچستان کو گورنر جنرل کا بوجھ قرار دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ بلوچستان کے لیے جمہوری اداروں کی بجائے ان کی زیرنگرانی بلوچستان کے لیے سماجی و معاشی ترقیاتی منصوبے درکار ہیں۔[50] اپریل 1948ء میں محمد امین کھوسہ اور

Scanned by CamScanner

عبدالصمد اچکزئی جیسے بلوچستان کے بہت سے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ وطن پارٹی (کانگریس کی حمایتی) کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا جس کی سربراہی عبدالصمد اچکزئی کررہے تھے۔

بلوچستان کو خودمختاری دینے سے انکار، سنڈیمن نظام کی مسلسل موجودگی اور پاکستان کے ساتھ بلوچستان کے غیر آئینی اور غیر جمہوری انضمام کے باعث بلوچستان میں بے چینی نے سر اٹھالیا۔ یوں، 16 مئی 1948ء کی رات خان کے چھوٹے بھائی، پرنس عبدالکریم نے قومی تحریک آزادی کی قیادت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔[51] انہوں نے قوم پرست سیاسی جماعتوں (ریاست قلات کی نیشنل پارٹی، بلوچ لیگ اور بلوچ نیشنل ورکرز پارٹی) کے ارکان کو عظیم تر بلوچستان کے قیام کے جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اپنے سیاسی مقاصد کے علاوہ پرنس، شاہی خاندان کے ایک فرد اور صوبہ مکران کے سابق گورنر تھے۔ پاکستان کی طرف سے خانیت کے زبردستی الحاق اور سردار بائی خان گچکی کی مکران کے حکمران کی حیثیت سے قبولیت نے انہیں مضطرب کردیا۔ مدد کے حصول اور تحریک آزادی کی تنظیم کے لیے انہوں نے افغانستان ہجرت کی۔

28 جون 1948ء کو پرنس کریم نے خان کو خط لکھا جس میں اپنی ہجرت کی وجوہ بتائیں۔ اپنے طویل خط میں انہوں نے خاران اور لسبیلہ کے غیر آئینی الحاق، صوبہ مکران کے غیر منصفانہ انضمام اور پاکستان میں قلات کے شامل ہونے کی نشاندہی کی جس کے باعث انہیں افغانستان ہجرت کرنی پڑی:

"۔۔۔اس بے چینی کی اصل وجہ پاکستانی عوام کے جبری اور غیر قانونی اقدامات ہیں۔ ایوانِ بالا اور ایوانِ زیریں، دونوں نے متفقہ طور پر انضمام کے خلاف فیصلہ دیا اور وہ آزادی برقرار رکھنے کی خاطر آخری دم تک لڑنے کو تیار تھے۔ آپ، عالی جناب نے مختلف مواقع پر زبانی اور تحریری بیانات میں انہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ کیا میں ان تمام حالات کا ذمہ دار ہوں؟ اگر پاکستانی عوام ریاست قلات کی آزادی چھین رہے ہیں، میری ہجرت کے باعث نہیں بلکہ ایک منصوبے کے تحت کررہے ہیں۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں، تب سے بالکل خاموش ہوں لیکن وہ ہماری آزادی اور قومیت کو تباہ کرنے کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مستونگ میں بلوچ ریاستوں کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ کی تعیناتی، سارا وان میں ناظم کی تقرری، مرکز میں ایک نائب وزیراعظم کی تعیناتی، ریاست کے غداروں کی حمایت اور وفاداروں کے لیے ظلم وستم۔۔۔ان سب چیزوں سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ کیا ان سب حالات کی طرف سے لوگوں کی آنکھیں بند ہیں؟ آپ، عالی جناب اور آپ کی ہدایت کے تحت بلوچ قوم نے

Scanned by CamScanner

برطانوی آقاؤں کی ناراضی کے باوجود پاکستان کے حصول کے لیے تمام اخلاقی اور مادی مدد فراہم کی لیکن اس کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ آپ عالی جناب، ابھی تک اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ بانی پاکستان آپ عالی جناب کے دوست ہیں اور اس دنیا میں بلوچ قوم کو خوش اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ قوم کی امنگوں کے خلاف انضمام کے باوجود آپ، عالی جناب سے کیا جانے والا سلوک اخلاقی، مذہبی اور سماجی قوانین کے قطعی برعکس ہے۔ صوبہ مکران کو بغیر کسی وجہ کے قلات سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی کارروائی ہے جو کافر برطانوی عوام بھی انجام دینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بجائے اس کے کہ ہم ان کی خدمت بجالائیں، ہم نہ صرف ایک دو بار بلکہ خان مہراب خان کے دورِ حکومت سے لے کر سابقہ عظیم جنگ کے خاتمے تک ان سے مسلح جنگیں لڑتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستانی عوام، نہ صرف برطانوی عوام سے کہیں زیادہ جارح ہیں بلکہ وہ اپنے دوستوں سے غداری کرنے کی عادت میں مبتلا ہیں۔ ان کی فطرت کیا ہے اور وہ کس قسم کے انسان ہیں، محض اس حقیقت سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

اپنی روانگی کے وقت، برطانویوں نے لسبیلہ اور خاران کے علاقے، آپ کی خودمختار حیثیت کے پیش نظر آپ، عالی جناب کو واپس کر دیئے۔ آپ، عالی جناب، قائداعظم کے مقصد کے ساتھ اس قدر مخلص تھے کہ مشکل حالات میں وہ آپ کی کوششوں سے متاثر ہوئے کہ انہوں نے آپ کو اپنا بیٹا قرار دیا۔ یوں برطانویوں کی نسبت منصفانہ مطالبوں کو انہیں آگے بڑھ کر پورا کرنا چاہیے تھا اور ایک باپ کی حیثیت سے کیا انہوں نے نوشکی، کوئٹہ، بولان اور نصیر آباد کے لیز شدہ علاقے آپ، عالی جناب کو واپس کر دیئے ہیں کیوں کہ ان کی لیز قانون کے تحت پہلے ہی منسوخ ہو چکی ہے۔ لیکن آپ کے خلوص کا جواب ظلم و ستم سے دیا گیا۔ لسبیلہ اور خاران کے انضمام اور مکران کے الحاق کو تسلیم کرنے کے باوجود، آپ اور بلوچ قوم کی کھلم کھلا توہین کی گئی۔ ان تمام حالات کے باوجود، آپ نے جھوٹی امیدوں کا دامن نہیں چھوڑا اور نہ اپنے بیٹے ہونے کی حیثیت سے دستبردار ہوئے اور خود کو نام نہاد باپ کے سامنے جھکا دیا اور قوم سے درخواست کی کہ اس الحاق کو خوش دلی سے قبول کر لیں اور انصاف کی امید رکھیں۔ طویل عرصے تک بلوچ قوم اس امید پر خاموش رہی کہ وہ جلد ہی ریڈیو پر سنیں گے کہ خانِ قلات کے تمام حقوق اسے واپس کر دیئے گئے ہیں، کہ مکران بدستور قلات کا حصہ رہے گا، اور یہ بھی کہ قلات کو لسبیلہ اور خاران پر خودمختارانہ حقوق حاصل ہوں گے، نیز یہ بھی کہ لیز شدہ علاقے ریاست قلات کے براہ راست انتظام

Scanned by CamScanner

میں ہوں گے۔ لیکن جب اعلان ہوا تو اس میں وہی ظالمانہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مکران کو خالی کر دیا جائے اور اس کا انتظام وانصرام، سردار بائی خان، غدار کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت، ان کے درمیان نااتفاقی کا سبب ہے لیکن کیا پاکستان کے عوام، جو اپنی مملکت کے امور چلا رہے ہیں اور جن کے رسم ورواج کی بنیاد عدم مواخات، عدم مساوات، ناانصافی اور ظلم وستم پر ہے، کیا وہ یہ سب کچھ محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے، میری آپ سے درخواست ہے کہ ان جھوٹی امیدوں پر تکیہ بے سود ہے جس سے مراد صرف یہ ہے کہ اس شخص کو دوبارہ آزمایا جائے جو پہلے ہی اپنی آزمائش میں ناکام ہو چکا ہے۔ ہم جس زاویے سے پاکستان کی حکومت پر نظر ڈالیں، ہمیں پنجابی فسطائیت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جہاں عوامی رائے کی کوئی وقعت نہیں۔ اس نظام کے تحت فوج اور اسلحہ کا راج ہوتا ہے اور اخلاقیات یا انصاف کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ مفاد پرستی اور ظلم وستم کا دور دورہ ہوتا ہے، نیز یہ ایک غیر اخلاقی فوجی حکومت ہے جو برطانوی جمہوریت سے کوسوں دُور ہے۔ اس حکومت میں بلوچوں، سندھیوں، افغانوں یا بنگالیوں جیسی کسی بھی دیگر اقوام کے لیے کوئی جگہ نہیں یہاں تک کہ وہ خود کو برابر کے طاقت ور نہ بنالیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ایسا سوچا یا یہ کہا بھی نہیں جاسکتا کہ پاکستان، دنیا کا پانچواں بڑا ملک اور سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے اور اپنے وسیع وسائل کے ذریعے مسلم اتحاد اور اخوت کا مرکز بن سکتا ہے کیوں کہ اس کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر استوار نہیں کی گئی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے متعلق تو بات ہی نہ کی جائے کیوں کہ ان کا برائے نام احترام بھی نہیں ہے۔ بدکاری وزنا کاری کے اڈے اور شراب کی دکانیں حسب معمول پھل پھول رہی ہیں اور ہر طرف مکمل پنجابی فسطائیت کا راج ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر اسے اپنی مضبوطی اور ترقی کی خاطر سامراجی قوتوں پر بھروسا کرنا پڑتا ہے اور ان کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے اور یہاں مختلف اقلیتی اقوام کی امنگوں اور خواہشات کو زبردستی کچل دیا جاتا ہے۔ یہ ظلم وستم کا راستہ ہے اور یہ انسانی تجربے اور قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ ہر قسم کی مادی قوت کے باوجود ظلم وستم ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔ یہ ایمان میرا واحد سہارا ہے جس کے باعث میں نے ہجرت کی ہے۔ میری آپ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ پیغامات بھجوا کر مجھے غیر ضروری طور پر تفکرات میں مت مبتلا کریں۔ آپ، عالی جناب کے ہاتھ میں کچھ نہیں جو مجھے ہجرت ترک کرنے پر مجبور کر سکے۔

اگر مکران کا زبردستی انضمام واپس لے لیا جاتا اور قلات کا صوبہ واپس کر دیا جاتا تو مجھے

Scanned by CamScanner

اندھیرے میں کچھ امید نظر آتی۔ مکران کے انضمام کے باعث انہوں نے جو زخم لگائے، ان کے عوض اگر قلات کے تمام حقوق واپس دے کر اسلامی اخوت کا کوئی ثبوت دیا جاتا تو پھر معلوم ہوتا کہ کہاں تک پنجابی فسطائیت میں لچک پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ صرف اور صرف فوجی طاقت کے اظہار ہی میں اضافہ ہوا ہے جس کے تحت پُرامن لوگوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے، انہیں گولیاں ماری جا رہی ہیں اور تمام ملک میں میرے نام کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ میری آپ، عالی جناب سے درخواست ہے کہ میں اس وقت واپس آسکوں گا جب میری ہجرت کی وجوہ دُور ہو جائیں گی یا پھر مجھ میں اس قدر طاقت ہوگی کہ میں ان وجوہ کو ختم کر سکوں۔"[52]

روانگی سے قبل، خان کی طرف سے اس اقدام کی منظوری کی علامت کے طور پر خان کی بیوی نے مالی مدد کے لیے سونا چاندی دیا کیوں کہ خان، کریم کی جدوجہد کے معترف تھے اور انہیں اپنے شاہی استحقاق کے بحال ہونے کی کچھ امید تھی۔[53] بہرحال، فیل نے خان اور پرنس کے درمیان کسی بھی قسم کے تعلق کی موجودگی سے انکار کیا[54] جو خانیت کی حکومت کے کچھ فوجی اور سرکاری عملے کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ کچھ ممتاز سیاسی رہنما جوان کے ساتھ شامل ہوئے، محمد حسین عنقا (بلوچ لیگ کے سیکریٹری اور ہفتہ وار بولان، مستونگ کے مدیر)، ملک سعید دہوار (ریاست قلات کی نیشنل پارٹی کے سیکریٹری)، قادر بخش نظامانی، بلوچ لیگ کے ایک رکن اور کمیونسٹ پارٹی، سندھ بلوچستان شاخ کے ایک ممتاز رکن کے علاوہ مولوی محمد افضل، جمعیت علمائے بلوچستان کے ایک رکن تھے۔[55]

بلوچ مجاہدین، جیسا کہ وہ خود کو اسی نام سے پکارتے تھے، افغانستان میں داخل ہو گئے اور صوبہ قندھار کے مقام سرلاتھ پر پڑاؤ کیا۔ ان کے قیام کے دوران، آزادی کے لیے جنگ لڑنے والے بلوچوں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر درج ذیل اقدامات کیے:[56]

(i) مشرقی اور مغربی بلوچستان کے بلوچ سرداروں کو پیغامات بھجوائے جن میں ان سے کہا گیا کہ وہ ان کی جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔

(ii) بلوچستان میں ایک پراپیگنڈا مہم کا آغاز کیا گیا جس کا مقصد تھا کہ بے چینی، افراتفری اور بغاوت پیدا کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ قومی تحریک آزادی کے لیے فوج تیار کی جائے۔

(iii) بین الاقوامی حمایت، خصوصاً افغانستان اور سوویت یونین کی مدد و حمایت حاصل کی جائے۔

رودینی قبیلے کے میر غلام فاروق، سردار مہراب خان، سردار میر جمعہ، میر وزیر خان سنجرانی

آف چاغی اور کئی ایک دیگر سرداروں کو پیغامات بھجوائے گئے۔[57]

پراپیگنڈا مہم کا آغاز دو محاذوں سے کیا جانا تھا:

(A) قومی ثقافتی محاذ

(B) مذہبی محاذ

قومی ثقافتی محاذ سے پارٹی نے بلوچستان میں پاکستان کے ظالمانہ راج کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کے کتابچے تقسیم کیے:

''محمد علی جناح اور ان کے ساتھی جن کے ہاتھ میں برطانویوں نے حکومت دی، ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں اور ہماری عزیز سرزمین وطن (بلوچستان) کو ہتھیا لینا چاہتے ہیں جس کے ہر انچ کی ہمارے آباواجداد نے خون کی قربانی دے حفاظت کی لیکن اب اس غیر ملکوں نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ اپنے وطن کی سرزمین کے ہر انچ کی آزادی کے لیے جنگ لڑیں گے۔

محمد علی جناح اور ان کے ساتھی ہماری تہذیب وثقافت کو تحلیل کر دینا چاہتے ہیں تا کہ آئندہ ہم خود کو بلوچ نہ کہہ سکیں، ہم اپنی مادری زبان نہ بول سکیں اور اپنے قدیم رسم ورواج کو ترک کر دیں اور ان کے راستوں پر چلیں۔ ہم پُرعزم ہیں کہ ہم اپنی تہذیب وثقافت کو بچائیں گے اور اپنی مادری زبان کو بھی ترک نہیں کریں گے اور آخری دم تک اپنے عزت ووقار کا دفاع کریں گے۔''

مذہبی محاذ پر ایک ممتاز مذہبی رہنما، مولوی محمد افضل نے ایک فتویٰ جاری کیا جس کے مخاطب پاکستان کے سرکاری ملازم اور فوجی تھے۔ فتوے میں مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان کے مسلمان، خصوصاً فوجیوں کو چاہیے کہ وہ پاکستان کی غیر اسلامی حکومت کے خلاف جہاد میں شریک ہوں۔ فتوے میں اعلان کیا گیا کہ پاکستان کے حکمران، جناح، مذہب کے لحاظ سے خوجہ ہیں اور ان کے وزرا، لیاقت علی خان، رفزی (بدعتی)؛ عبدالرب نشتر، دہریہ اور ظفراللہ خان قادیانی کافر ہیں۔ وہ کبھی بھی اسلام کے خیر خواہ نہیں ہوسکتے۔[58] فتوے میں پاکستانی فوج سے اپیل کی گئی کہ وہ غیر اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ایک حقیقی اسلامی روح اور جذبے کے ساتھ بلوچ لبریشن فورس میں شامل ہوجائیں۔ فتوے میں مسلمان فوجیوں کو خبردار کیا گیا کہ جو اسلامی جہاد میں ہمارے خلاف لڑتے ہیں، عام اصطلاح میں انہیں سؤر کہا جاتا ہے اور وہ خدا اور اس کے رسول کے بدترین باغی ہوں گے۔''[59]

ثقافتی اور مذہبی مہم کے علاوہ، پرنس نے فوج برائے آزادی بھی منظم کی جسے ''بلوچ مجاہدین''

Scanned by CamScanner

کہا جاتا اور جس میں خانیت کی حکومت کے سابقہ فوجی اور افسر شامل تھے۔ پرنس کو سپہ سالار اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ پرنس نے بلوچ عوام سے اپیل کی کہ فوج میں بھرتی ہوں۔ جو شخص 100 افراد بھرتی کراتا، اسے میجر کا عہدہ پیش کیا جاتا اور جو شخص 50 افراد بھرتی کراتا، اسے کیپٹن کا عہدہ پیش کیا جاتا۔ بلوچ لبریشن آرمی کا ایک خفیہ شعبہ تھا جسے جانثار کہتے تھے جس کا کام، معلومات کی فراہمی، نظام مواصلات کی تباہی اور غداروں کی سرگرمیوں کی نگرانی تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور خفیہ شعبہ تھا جسے جانباز کہتے تھے اور اس کا کام غداروں کو ہلاک کرنا تھا۔ جانباز، شعبہ جانثار کے ماتحت تھا۔ اس شعبے کے صدر دفتر کو بابِ عالی کہا جاتا اور اس کا سربراہ پرنس کریم تھا۔ جانثار کی کُل تعداد 30 تھی جب کہ جانباز کی تعداد کے متعلق کچھ علم نہیں ہوسکا۔ بابِ عالی کے طرف سے پہلے جاری ہونے والے حکم سے جانباز سمیت جانثار کے کردار کے متعلق معلومات مہیا ہوتی ہیں:

''بابِ عالی ''جانثاروں'' کی ان اطلاعات اور تجاویز کے ساتھ متفق ہے کہ بلوچ قوم اور قلات کے غداروں کو موت کی گھاٹ اتار دیا جائے، اس لیے بابِ عالی ''جانباز'' کو یہ قطعی حکم جاری کرتا ہے کہ یکم جون 1948ء سے اس حکم پر نہایت احتیاط سے عمل کیا جائے اور اگر اپنی جان کی قیمت پر اگر کوئی جانثار، بابِ عالی کا مخصوص نشان دکھانے کے بعد جانباز کو غدار کا نام بتاتا ہے تو پھر یہ جانباز کا فرض ہے کہ غدار کی زندگی ختم کردی جائے اور اسی مخصوص جانثار کے ذریعے اس کی اطلاع اس دفتر کو دی جائے۔''[60]

بہر حال، مدد کے لیے افغانستان کی طرف سے انکار اور سٹالن کے روس کی خاموشی کے باعث پرنس نے آزادی کی جنگ شروع نہیں کی۔ سرلٹھ میں اپنے قیام کے دوران، پرنس عبدالکریم نے ملک سعید اور قادر بخش نظامانی کو اپنے نمائندے مقرر کیا تا کہ حکومت افغانستان کے علاوہ کابل میں موجود دیگر سفارت خانوں سے رابطہ کیا جائے اور اخلاقی و مادی مدد و حمایت حاصل کی جائے۔ نظامانی کے مطابق، افغان حکام نے کسی بھی قسم کی مدد فراہم کرنے سے انکار کردیا اور انہیں بتایا کہ وہ قندھار میں سیاسی پناہ گزیں کی حیثیت سے قیام کریں یا واپس چلے جائیں۔ افغان حکام نے افغانستان کی سرزمین سے باغی گروہ کو کارروائی کرنے کی بھی اجازت نہ دی۔ نظامانی نے بلوچ مطالبات سے ایرانی سفارت خانے کو بھی آگاہ کیا۔ ایرانی سفارت کاروں نے تشویش کا اظہار تو کیا لیکن کسی بھی قسم کی مدد فراہم کرنے کی پیشکش نہ کی۔ اگرچہ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ باغی گروہ کو ایران میں پناہ دی جاسکتی ہے۔ پرنس کے نمائندوں کی آخری امید سوویت سفارت خانہ تھا۔ سوویت سفارت کاروں نے نظامانی

Scanned by CamScanner

کی بات نہایت غور سے سنی۔ اگر چہ انہوں نے بھی کسی بھی قسم کی مدد فراہم نہیں کی لیکن انہوں نے اس ضمن میں ماسکو کو مطلع کرنے کا وعدہ ضرور کیا۔[61]

اس مرحلے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان کی حکومت جو پاکستان کی مخالف تھی، بلوچ نیشنل لبریشن کی مدد کرنے میں ناکام ہوگئی اور کیا وجہ تھی کہ سٹالن کے روس نے مارکسزم لینن ازم کے اصولوں کے تحت بلوچوں کے حق خود ارادیت کی حمایت نہیں کی، جب کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لینن نے افغانستان میں سوویت نمائندوں کو ہدایات جاری کی تھیں کہ بلوچ انقلابیوں کے ساتھ روابط قائم کیے جائیں اور ان کی حمایت کی جائے۔ نیز کیا وجہ تھی کہ ایرانیوں نے ایرانی پالیسی کے برعکس، بلوچ مسئلے میں دلچسپی ظاہر کی کیوں کہ ایرانی پالیسی کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ بلوچوں، کردوں اور آذری ترکوں کی قومی تحریکوں کو کچلا جائے۔ یہ سوالات تاریخی جائزے اور تجزیے کے متقاضی ہیں۔

احمد شاہ کے اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی افغانی، 1758ء کو ہونے والی بلوچ افغان جنگ تک بلوچستان کو ایک محکوم ریاست سمجھتے رہے جب دونوں فریقین کے درمیان ''معاہدہ عدم مداخلت'' طے پایا۔ انیسویں صدی میں شجاع اور امیر عبدالرحمٰن جیسے افغان حکمران، بلوچستان پر قبضہ کرنے کی خواہش میں مبتلا تھے۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنی توسیع پسندانہ پالیسی کا اظہار اپنے جانشینوں کے نام اپنی وصیت میں کیا:

''اگر افغانستان کو سمندر تک رسائی حاصل ہو جاتی تو پھر بلاشبہ ملک دولت منداور خوش حال ہوتا۔۔۔ اگر میری زندگی میں ایسا کوئی موقع نہیں آتا تو پھر میرے بیٹوں اور جانشینوں کو یہ مقصد اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور اپنی آنکھیں اس کو نئے ''بلوچستان'' پر مرکوز رکھنی چاہئیں۔''[62]

1947ء میں حکومت افغانستان نے چترال اور گلگت سے بحر ہند کے بلوچ ساحل تک پھیلے علاقے کو پشتونستان کی حیثیت سے تخلیق کرنے کا مطالبہ کیا۔[63] حکومت افغانستان نے اپنے بیانات اور مطبوعات میں بلوچستان کو ''جنوبی پشتونستان'' کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ افغانستان کی توسیع پسندانہ پالیسی، زمین میں گھری ہوئی ریاست کے معاشی مفادات کی عکاس تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت افغانستان کے لیے اپنے قومی مفادات کو نظر انداز کرنا اور ایک آزاد عظیم تر بلوچستان کی تحریک کی حمایت کرنا، ناممکن تھا جو افغانستان میں واقع بلوچ علاقے کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ مشرق میں سٹالن کے حواریوں نے لینن کی پالیسی پر عمل نہ کیا اور ہندوستان میں سٹالن کے حواریوں نے پاکستان کی تحریک کی

Scanned by CamScanner

حمایت کی جس کی بنیاد مذہب تھی۔ مزید برآں، ماسکو کی سٹالن حکومت، افغانوں یا برطانویوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی جو ایک آزاد بلوچستان کے خلاف تھے۔

جہاں تک ایرانی پالیسی کا تعلق ہے، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی، بلوچ رہنماؤں کو ایران آنے کی دعوت دے کر انہیں دھوکا دینا چاہتے تھے تاکہ بعد ازاں انہیں پاکستانی حکام کے حوالے کر دیا جائے۔ (ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ یہ شاہ ایران ہی تھا جس نے سب سے پہلے پاکستان کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا)۔

دریں اثنا، 24 مئی 1948ء کو ایک فرمان (شاہی حکم) کے ذریعے پرنس اور اس کی پارٹی کو یہ کہتے ہوئے ایک باغی گروہ کی حیثیت سے ممنوع قرار دے دیا گیا کہ پرنس یا اس کی پارٹی سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق رکھا جائے نہ ہی خوراک کے ذریعے ان کی مدد کی جائے، اور اگر باغی گروہ کے کسی بھی رکن نے جرم کا ارتکاب کیا تو اسے سزا دی جائے گی۔[64] حکومت پاکستان نے اپنی فوجیں افغانستان کی سرحد کے قریب کوہ پنجپائی، چمن چشمہ کی فوجی چوکیوں میں منتقل کر دیں تاکہ باغیوں کے خوراک کے ذخیرے پر قبضہ کیا جا سکے جو آزادی کے حمایتی عناصر کی طرف سے بھیجا جا رہا تھا، نیز باغیوں کی سرگرمیوں یا ان کی طرف سے کسی حملے کا سدباب کیا جا سکے۔

بلوچستان میں عوامی بے چینی کو روکنے کے لیے خان نے اپنے ماموں، حاجی ابراہیم خان اور حاجی تاج محمد کو سرلٹھ بھیجا تاکہ پرنس عبدالکریم کو واپس قلات لایا جائے۔ کریم نے اپنے خط مورخہ 18 مئی 1948ء میں اپنے واپسی کو مشروط قرار دیا:[65]

(1) بلوچ، افغانوں کی مانند ایک علیحدہ قوم ہیں جن کی اپنی تہذیب وثقافت اور زبان ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ اور جغرافیہ نے تسلیم کیا ہے۔ انہیں ایک آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے رہنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

(2) قلات، بلوچوں کا ایک قدیم مرکز ہے۔ وہ علاقے جن کی حد بندی کی گئی ہے اور اب وہ پاکستانی حکومت کے زیر تسلط ہیں، اگر وہ دوبارہ بلوچستان میں شامل ہونا چاہیں تو پاکستان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

(3) پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلق کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد قلات کو اپنی خودمختاری برقرار رکھنی چاہیے۔

Scanned by CamScanner

پرنس اور اس کی تحریک آزادی، ملکی اور بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی۔ مزید برآں، بلوچ قوم پرست، دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ عنقا اور ملک سعید، گوریلا جنگ کی صورت میں مسلح جدوجہد کے حمایتی تھے جب کہ میر غوث بخش بزنجو اور دیگر ممتاز رہنما، پاکستان کے ساتھ فوجی ٹکراؤ کے نظریہ پر خاموش تھے۔[66] ان کی کوئی تیاری تھی اور نہ ہی انہیں اندرونی و بیرونی حمایت حاصل تھی۔

مندرجہ بالا حقائق کی بنا پر پرنس کو خانیت میں واپس آنے اور اپنے مطالبات کے ضمن میں پُرامن مذاکرات کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ 8 جولائی 1948ء کو جب پرنس کی واپسی کی خبر قلات پہنچی، وزیراعظم ڈی وائی فیل (D.Y.Fell)، خان کا پیغام پہنچانے کے لیے قلات کی ریاستی فوج کے ساتھ پرنس کو ملنے ہربوئی (Harboi) پہنچ گیا۔

اس ملاقات کے دوران وزیراعظم نے پرنس کے کچھ مطالبات تسلیم کر لیے اور انہیں یقین دلایا کہ اگر وہ اپنے لشکر کو غیر مسلح کر دیں تو انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ پرنس نے ایسا ہی کیا۔ ایک اور روایت کے مطابق، پاکستانی اعلیٰ حکام نے ہربوئی کے مقام پر پرنس کی پارٹی کے ساتھ محفوظ طرزِ عمل پر مشتمل ایک معاہدہ طے کیا اور مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید پر اپنے اس معاہدے پر پابند رہنے کا حلف اٹھایا۔ بہرحال، یہ معاہدہ اس وقت ٹوٹ گیا جب پرنس اور 142 افراد پر مشتمل ان کے جتھے پر پاکستانی فوج نے گھات لگا کر حملہ کیا۔[67]

پاکستان کے سرکاری موقف کے مطابق، عبدالکریم، افغانستان کی مدد سے بلوچستان میں داخل ہوئے اور جھلاوان کے علاقے میں زرکزئی قبیلے کے ایک بارسوخ قبائلی رہنما میر گوہر خان زہری کی مدد سے پاکستان کے خلاف بغاوت کا آغاز کر دیا۔ مزید برآں، یہ بھی کہا گیا کہ ساتویں رجمنٹ کے سربراہ میجر جنرل اکبر خان کو باغیوں پر حملہ کرنے اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کا حکم دیا گیا۔[68]

پرنس کریم کو ان کے 142 ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور انہیں مچھ کے علاوہ کوئٹہ قید خانے میں قید کر دیا گیا۔ روزنامہ ڈان، مورخہ 14 اگست 1960ء میں شائع شدہ ایک مضمون بعنوان "Early Reminiscences of Soldier" میں جنرل اکبر خان کی طرف سے ایک مفصل اور دلچسپ بیان سامنے آتا ہے۔ اس مضمون میں جنرل اکبر خان نے اس امر کی تصدیق کی کہ خانیت پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا، نیز وہ پاکستانی فوج اور پرنس کریم کی قیادت میں باغی فوج کے ساتھ

Scanned by CamScanner

جھڑپ کا احوال بھی بیان کرتے ہیں۔ جنرل اکبر کا کہنا ہے کہ جناح نے ہدایات جاری کی تھیں کہ یہ خبر اخبارات میں شائع نہ ہونے پائے۔

میجر جنرل اکبر خان نے لکھا، ''جناح صاحب نے مجھے گفتگو کے لیے طلب کیا۔ میں نے ان کے سامنے (حملے کا) منصوبہ پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمیں ریاست پر اس طرح حملہ نہیں کرنا چاہیے کہ دنیا کو پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا موقع مل جائے۔ اس منصوبے کے مطابق، جناح صاحب نے بلوچستان اور اس کی ریاستوں کو یورش زدہ علاقے قرار دیا۔ مجھے آٹھویں رجمنٹ کا کمانڈار مقرر کیا گیا۔ یہ تمام واقعات ماہِ رمضان میں پیش آئے۔ میں نے آٹھویں رجمنٹ کو ریاست کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے کرنل گلزار نے چند ایک اونٹ جمع کیے۔ ہم نے جنگی سامان ان اونٹوں پر لادا اور اس طرح ریاست میں داخل ہوئے کہ ہم پر کسی کو شک نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح ہماری فوج ریاست میں داخل ہوئی اور قلات کی مرکزی سڑک پر پہنچ گئی۔ خانِ قلات نے دانستہ اپنا محل چھوڑ دیا تھا تا کہ پرنس عبدالکریم اس پر قبضہ کر کے ریاست کی آزادی کی جنگ کا اعلان کر سکے۔''[69]

اکبر خان نے مزید لکھا: ''خان کو بے وقوف بنانے کے لیے میں نے خان کے ساتھ عشائیے میں شرکت کی جس کا اہتمام اس نے پاکستانی فوج کے اعزاز میں کیا تھا۔ ریاستی حکام نے عوامی رقص اور موسیقی کا انتظام کیا تھا۔

ان تقریبات کے دوران ہی میں میجر بختیار کے اصرار پر وہاں سے چلا آیا اور موٹر میں بیٹھ کر سیدھا شاہی مہمان خانے پہنچا اور پھر عقبی دروازے کے ذریعے وہاں سے نکل گیا۔ میں نے فوجی جیپ پر وہ جگہ چھوڑی۔ اس شام کو ریاستی فوج کو حملے کے اطلاعات وصول ہو چکی تھیں۔ اس کے فوجی ایک پہاڑی کی چوٹی پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے اور وہ روزے سے تھے۔ اچانک پاکستانی فوج نے ریاستی افواج پر حملہ کر دیا۔ لڑائی چار گھنٹے جاری رہی۔ دریں اثنا، کرنل گلزار کی بٹالین نے پیش قدمی شروع کر دی۔ جب ڈگلس فیل کو میرے منصوبے کے متعلق علم ہوا تو اس نے میری معزولی کے احکامات جاری کر دیئے۔ جب نصف شب کو میں اپنی فوج کے ساتھ آن ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ پاکستانی بریگیڈیئر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا ہے کیوں کہ وہ ہر قدم پر اپنے انگریز سیاسی ایجنٹ کے ساتھ مشورہ کر رہا تھا۔ وہ (انگریز) اپنے کردار سے انصاف نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے معزول کر دیا اور اس کی

جگہ محمد زمان کو مقرر کر دیا۔[70] اس طرح پرنس کریم اور اس کی تحریک آزادی کی فوج کی کوشش ناکام ہوگئی۔

مقدمہ

پرنس اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد، A.G.G. نے تفتیش کا حکم دیا جس کے لیے کوئٹہ کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خان صاحب عبداللہ خان کو تفتیشی افسر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے 12 ستمبر 1948 کو اپنی رپوٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پرنس کی کارروائیاں اور تحریک آزادی کی فوج کی طرف سے شائع شدہ خطوط اور دستاویزات تھیں۔ تفتیش کے بعد کوئٹہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آر کے ساکر نے ایک خاص جرگہ مقرر کیا جس میں مندرجہ ذیل افراد شامل تھے:

1) خان بہادر صاحبزادہ، ایم ایوب خان عیسیٰ خیل، ایک پشتون جن کا تعلق پشین سے تھا۔
2) کے بی باز محمد خان جوگیزئی، ایک پشتون جن کا تعلق لورالائی سے تھا۔
3) عبدالغفار خان اچکزئی، ایک پشتون جن کا تعلق پشین سے تھا۔
4) ایس بی وڈیرہ، نور محمد خان، قلات کے ایک بلوچ سردار۔
(5) سید اورنگ شاہ، ان کا تعلق قلات سے تھا۔
6) شیخ باز گل خان، ایک پشتون جن کا تعلق ژوب سے تھا۔
7) وہاب خان پانیزئی، ایک پشتون جن کا تعلق سبی سے تھا۔
8) سردار ڈوڈا خان مری، ایک بلوچ جن کا تعلق سبی سے تھا۔

جرگہ کو ان حالات کا جائزہ لینے کی ذمہ داری تفویض کی گئی جن کے باعث بغاوت ہوئی، نیز اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اپنی سفارشات بھی پیش کرنے کا کہا گیا۔ 10 نومبر 1948ء کو جرگہ نے ملزمان کی شہادتوں کی سماعت کی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اپنی سفارشات پیش کر دیں۔ 17 نومبر 1948ء کو حکومت پاکستان کی رضامندی سے پرنس کو لورالائی پیش کرنے اور دیگر جرمانوں کا اعلان کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے 27 نومبر کو اپنے حکم میں جرگہ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے پرنس کو دس برس قید بامشقت کی سزا کے علاوہ 5000 روپے کا جرمانہ بھی کیا۔ ان کے دیگر ساتھیوں کے لیے مختلف قسم کی سزاؤں اور جرمانوں کا اعلان کیا گیا۔[71] اس طرح بلوچوں کی آزادی کے لیے پہلی قومی کوشش کو حکومت پاکستان نے کچل دیا۔

Scanned by CamScanner

اختتامی کلمات

اس مقالے کے ذریعے بلوچ قوم پرستی کے مختلف پہلو، بلوچستان خانیت کی حکومت کے زوال کے مختلف عناصر و حقائق سامنے آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ 48-1947ء میں بلوچ قوم پرست ایک آزاد قومی ریاست کے حصول میں کس طرح ناکامی سے دوچار ہوئے۔

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب و ثقافت اور تاریخ، بلوچ قوم پرستی کو بہت بڑا جواز فراہم کرتے ہیں اور نسلی شعور کو تقویت بخشتے ہیں جب کہ جغرافیائی محل وقوع نے بھی مثبت کے علاوہ منفی اثرات مرتب کیے۔ بلاشبہ، مختلف پہاڑی اور صحرائی علاقوں نے تاریخی طور پر اپنی آزادی کی حفاظت کی۔ حملہ آور، بلوچ علاقے کو اپنے زیر نگیں کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے علاوہ، سخت موسم اور پانی کی قلت نے بلوچستان کو یہ موقع فراہم نہ کیا کہ وہ ایک جاگیردارانہ قوم کی حیثیت سے ابھر سکے۔ بلیدیوں، رودائیوں اور خانِ قلات کی طرف سے بلوچستان کو ایک جاگیردارانہ قوم بنانے کی مختلف کوششیں کی گئیں لیکن یہ عمل، مختلف حملوں مثلاً ڈیرہ جات کے درانی حملے کے علاوہ، برطانوی مداخلتوں اور بلوچستان پر برطانویوں کی بلاواسطہ حکومت کی اندرونی چپقلشوں کے باعث جاری نہ رہ سکا۔ سخت موسم اور پانی کی قلت کے باعث، بلوچ، خانہ بدوشانہ یا نیم خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے یا برصغیر پاک و ہند، وسطی ایشیا، مشرقی افریقہ یا پھر عرب مشرق وسطیٰ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

بلوچستان پر برطانوی قبضے کا آغاز 1840ء کی دہائی میں ہوا اور اس کی تکمیل 1893ء میں ہوئی۔ برطانویوں کو اپنی فوجی اور جغرافیائی و سیاسی وجوہ کی بنا پر بلوچستان میں دلچسپی تھی تاکہ روس، فرانس اور جرمنی جیسی توسیع پسند قوتوں سے اپنی نوآبادی (ہندوستان) کو محفوظ رکھ سکیں اور اپنے دائرہ رسوخ (افغانستان اور خلیج فارس کا علاقہ) میں برطانوی مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ برطانویوں نے بلوچستان کو اس طرح کئی حصوں میں تقسیم کر دیا کہ ہر حصہ اپنی علیحدہ آئینی اور سیاسی حیثیت کا مالک تھا۔ انہوں نے بلوچستان کو معاشی استحصال کے لیے استعمال نہیں کیا لیکن ہندوستان کے معاشی وسائل کو برطانویوں نے جی بھر کر لوٹا اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مثال کے طور پر برطانویوں نے اس حقیقت کے باوجود برآمدی سہولیات فراہم کرنے کے لیے بلوچستان میں سمندری بندرگاہ قائم نہیں کی کہ بلوچستان کے پاس بہت ہی طویل ساحلی علاقہ موجود ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے ''سنڈیمن کا نظام'' یا ''سرداری نظام'' قائم کرنے کے ذریعے ایک نیا سماجی و سیاسی نظام تشکیل دیا۔ 1854ء میں برطانویوں

Scanned by CamScanner

کے دباؤ کے زیر اثر خانِ قلات نے بلوچستان کے لیے زیر تحفظ ریاست کا درجہ قبول کرلیا۔ 1876ء میں برطانویوں نے خان اور اس کے سرداروں کے درمیان اختلاف کی صورت میں انہیں حتمی ثالث کے طور پر قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نئی پالیسی کے تحت، خان بلوچ صوبوں اور لیز شدہ علاقوں میں اپنے مطلق اختیارات سے محروم ہوگیا۔ 1876ء کے معاہدے نے بلوچ معاشرے میں نئی سیاسی طاقتوں کو جنم دیا جس کے نتیجے میں خان کے مطلق العنان اختیارات ختم ہوگئے اور سرداروں کی صورت میں ایک نئی مطلق العنان اشرافیہ نے جنم لیا۔ سنڈیمن نظام نے قبائلی علاقوں کو مکمل خود مختاری عطا کر دی۔ سردار (ہم منصب سرداروں کا سربراہ) کا منصب، مطلق العنان سربراہ میں تبدیل ہوگیا اور قبائلیوں کو ان کی رعایا قرار دے دیا گیا۔ ان سرداروں نے برطانوی حاکمیت تسلیم کرلی۔ اس نئے نظام کے تحت، ایک منتخب ''مجلس'' یا ''جرگہ'' کے ذریعے اپنے اختلاف طے کرنے کی قدیم بلوچ روایت ختم ہوگئی۔ بے تحاشا اختیارات کے حامل موروثی سرداروں پر مشتمل ایک نیا نظام (سرداری اور شاہی جرگہ) تشکیل دیا گیا جس کے تحت قبائلی سرداروں کو اپنی رعایا کی زندگیوں اور مال و اسباب پر تصرف حاصل تھا۔ اس نئے نظام کے ذریعے بلوچ سرداروں کو امن وامان کا بھی ذمہ دار بنا دیا گیا۔ یہ نظام برطانویوں کے لیے بلوچ قوم پرستی کے رجحانات کو کچلنے میں مددگار ثابت ہوا۔ درحقیقت، سنڈیمن نظام کے تحت، بلوچ سردار کے منصب کو اس کے اپنے ہی قبیلے میں بلند کر دیا گیا تھا۔ اسے زمینوں کے علاوہ مالی و عدالتی اختیارات بھی دیئے گئے جو اسے 1876ء سے قبل حاصل نہ تھے۔ اس طرح، بلوچ معاشرے کے اندر سرداروں اور عوام کے درمیان ایک واضح طبقاتی چپقلش کا آغاز ہوگیا۔ نئے نظام کے تحت بلوچ معاشرے میں قبائلیوں اور غاصبوں یعنی سرداروں کے درمیان براہ راست ٹکراؤ کی ابتدا ہوئی۔ ان حالات میں ان سرداروں سے لڑنا بہت ہی مشکل تھا جنہیں برطانویوں کی حمایت حاصل تھی۔ حالات کے جبر کے نتیجے میں بلوچ عوام نے سامراج مخالف جدوجہد شروع کر دی۔ سرداروں نے یہ کوششیں برطانویوں کی مدد سے ناکام بنا دیں۔ سرداروں اور ان کے سرپرستوں کے خلاف لڑنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ترقی پسند قوم پرستوں پر مشتمل سیاسی تحریک کی قیادت میں بلوچ عوام منظم ہو جائیں۔

1929ء میں قوم پرستوں کو اس وقت اس حقیقت کا ادراک ہوا جب انہوں نے اپنی سیاسی تیاریوں کی طرف توجہ دی۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ انہیں سرداروں اور برطانویوں کے خلاف لڑنا ہے جو آسان نہ ہوگا۔ اپنی جدوجہد میں انہوں نے خان (جسے برطانویوں نے سرداروں کی حمایت سے اس

Scanned by CamScanner

کے اختیارات سے محروم کردیا تھا) کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تعلیمی اصلاحات کے لیے مگسی نے بھی برطانویوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سرداروں اور برطانویوں کی مخالفت کے باعث یہ تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ 1939ء میں خان، جو برطانویوں اور سرداروں کے گٹھ جوڑ سے خوف زدہ ہوگیا تھا، قوم پرستوں کی حمایت سے دستبردار ہوگیا۔

قوم پرست تحریک کی ناکامی سے سب سے بڑی وجہ، قومی تعمیر کے لیے جدید سماجی بنیاد کا فقدان تھی۔ سرداروں نے جدید اداروں اور اصلاحات کی مخالفت کی۔ 1929ء سے 1948ء تک کالجوں یونیورسٹیوں یا صنعتوں کا وجود تک نہ تھا۔ یہاں صرف قبائلی اشرافیہ اور خانہ بدوشوں اور کسانوں کا مظلوم طبقہ موجود تھا۔ قوم پرست، جن کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا، قبائلی علاقوں میں بلوچ عوام کو متحرک کرنے کی اہلیت سے محروم تھے کیوں کہ ان قبائلی علاقوں میں ایک تو سرداروں کو بہت زیادہ عملداری حاصل تھی، دوسرے، برطانوی بھی قوم پرستوں کے مخالف تھے۔ قبائلی سرداروں کو کمزور کرنے کے لیے انہوں نے مدد کی خاطر بلوچستان کی سرحدوں سے باہر نظر دوڑائی اور آل انڈیا کانگریس (مسلم لیگ نے خان اور سرداروں کے ساتھ الحاق کے باعث برطانویوں کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کردیا تھا) کے ساتھ الحاق کرلیا۔ 1947ء میں بلوچ قوم پرستوں کو بلوچستان میں سرداروں کی عملداری ختم ہونے کے باعث ایک نئی سیاسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ سردار اپنے ایک نئے آقا کی تلاش میں تھے اور یوں انہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ الحاق کرلیا۔ اس کے عوض جناح کے ان کے مفادات کے تحفظ کا وعدہ کیا۔ قبائلی اشرافیہ، خان کے ساتھ الحاق نہ کرسکی جو قبائلی اور جاگیردارانہ مفادات کے تحفظ کی بجائے جدید ادارے متعارف کروانے کا خواہاں تھا۔

1948ء میں خان، سرداروں کے خلاف قوم پرستوں کی توقعات پوری کرنے میں نہ صرف ناکام ہوگیا بلکہ وہ بلوچستان کی آزادی کے لیے ایک ''طاقتور معاون'' بھی تلاش نہ کرسکا۔ اگر وہ سوویت روسیوں کے ساتھ رابطہ کرتا تو ممکن تھا کہ بحر ہند میں جہاز رانی کی سہولیات فراہم کرنے کے عوض اسے سوویت حمایت حاصل ہوجاتی۔

1948ء میں پہلی بلوچ بغاوت (زیر قیادت پرنس عبدالکریم) کے قائدین سردار، پاکستان اور برطانوی سامراجیت کے گٹھ جوڑ کا مقابلہ کرنے کے اہلیت سے محروم تھے۔ بلوچ قوم پرستی (1920-1948ء) کے پہلے دَور میں بلوچ قوم پرستوں کی ناکامی سرداری نظام، جدید سماجی بنیاد اور پھر

Scanned by CamScanner

خان کی طرف سے ''طاقتور حمایت'' نہ حاصل کر سکنے کا نتیجہ تھی جس کے ذریعے سرمایہ داری نظام کو نظر انداز کرتے ہوئے قبائلی معاشرے کو ایک جدید قومی ریاست میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال، بلوچ قوم پرستی کے اثرات بلوچستان میں محسوس کیے گئے جس کے باعث ملک میں کہیں زیادہ بیداری اور سیاسی آگہی پیدا ہوئی۔ بلوچستان کی موجودہ سیاست میں یہ اثرات بخوبی دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔[72]

Scanned by CamScanner

حصہ دوم

ضمیمہ جات

Scanned by CamScanner

ضمیمہ جات

(I) قلات کا معاہدۂ امن (1758ء) [1]

معاہدہ صلح نامہ 1758ء مابین میر نصیر خان اعظم واحمد شاہ ابدالی

☆ ''خانِ بلوچ، میر نصیر خان آئندہ شاہِ افغانستان کو کوئی خراج ادا نہیں کرے گا۔

☆ خانِ بلوچ، احمد شاہ ابدالی کو ''سان''، لشکر وغیرہ نہیں دے گا، البتہ جب کبھی شاہِ افغانستان کو اپنی حکومت سے باہر کسی دشمن کے خلاف لڑنا پڑا تو خانِ بلوچ فوجی دستہ بطور امداد دیا کرے گا۔ اس امداد کے عوض، شاہِ افغانستان، خانِ بلوچ کو سالانہ ایک لاکھ روپیہ نقد، بارود، اسلحہ، جنگ اور فوج کے اخراجات وغیرہ، بہ وقت ضرورت امداد دے گا۔

☆ خانِ بلوچ کسی ایسے سدوزئی شہزادہ یا کسی افغان سردار کو اپنی پناہ یا امداد وغیرہ نہیں دے گا جو حکومتِ افغانستان سے باغی ہو کر اس کے پاس آ گیا ہو، نیز افغان بادشاہ بھی قلات شاہی خاندان احمدزئی کے کسی ایسے شہزادے اور قبائلی سردار کو اپنی پناہ اور امداد وغیرہ نہیں دے گا جو حکومتِ بلوچ کا مخالف یا باغی ہو کر اس کے پاس آ گیا ہو۔

☆ شاہِ افغانستان آئندہ خانِ بلوچ کے اندرونی معاملات، تنازعات اور بلوچستان سے متعلق دیگر معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔

☆ خانِ بلوچ کے جو علاقہ جات اس وقت شاہ افغانستان کے پاس ہیں، ان کو آج سے خانِ بلوچ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

مہرِ شاہی، خانِ بلوچ ۔ مہرِ شاہی، شاہِ افغانستان

Scanned by CamScanner

(II) حکومت قلات کا میمورنڈم

(جسے سر سلطان احمد نے تیار کیا اور 1946ء میں ایم اے جناح نے کیبنٹ مشن کو پیش کیا)

1. اس میمورنڈم میں ریاستِ قلات کے درج ذیل معاملات کا ذکر کیا گیا ہے:

(i) قلات کی آئندہ حیثیت

(ii) لسبیلہ اور خاران کے متعلق دعوے

(iii) مری اور بگتی قبائل کے متعلق دعوے

(i) قلات کی آئندہ حیثیت

قلات کی سٹریٹجک حیثیت

2. اپنے زیر تسلط علاقوں سمیت ریاستِ قلات کی سرحدیں شمال میں افغانستان اور برطانوی بلوچستان، مشرق میں پنجاب اور سندھ کے صوبوں، جنوب میں بحرِ ہند اور مغرب میں ایران، قلات کے ساتھ ملتی ہیں، اس لیے یہ ایک اہم بفر (دو بڑی ریاستوں کے درمیان تصادم روکنے کے لیے چھوٹی ریاست) ریاست ہے۔[2]

(a) ہندوستان اور افغانستان کے درمیان اور

(b) ہندوستان اور ایران کے درمیان

ہندوستان، افغانستان اور ایران کے درمیان بین الاقوامی تجارتی شاہراہ بھی قلات کے علاقوں سے گزرتی ہے۔ قلات کی سٹریٹجک اہمیت پر زور دیتے ہوئے سر ولیم میریویدر (Sir William Merewether) نے 1869ء میں یوں لکھا: ''ہمیشہ سے ہی اور قدرتی طور پر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ قلات ایک آزاد اور خودمختار ریاست رہی ہے، ہمارا عظیم تر مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہمارے لیے ممکن ہو، اس ملک کے اندر اس کے دائرۂ رسوخ میں اضافہ کیا جائے اور اس کی طاقت کو تقویت بخشی جائے۔ اپنی عوام کے ایک حصے کی طرف سے غیر قانونی سرگرمیوں کے ارتکاب کے متعلق پریشانیوں سے نجات دلانے کا عمل بلاشبہ اس کے لیے کچھ حد تک طمانیت بخش ثابت ہوگا۔

لیکن اس مقصد کے حصول کی خاطر اگر عوام پر اس کی کمزوری ظاہر ہو جائے تو اس کا باقی عوام پر بھی بہت برا اثر مرتب ہوگا۔ اس قسم کی سہولیت قبول کرنے میں اس کی دانش مندی انتہائی قابل اعتراض ہوگی اور ہمارے لیے یہی بہتر ہوگا اور جہاں تک ہماری طرف سے اس پالیسی کو اپنانے کا تعلق

Scanned by CamScanner

ہے، تو ہمارے لیے اس پالیسی کو ترک کرنا جیسا کہ ہم جانتے ہیں، درست اور انتہائی تقویت بخش ہے اور اس ضمن میں ہماری مغربی سرحدوں کے تحفظ کا تمام تر معاملہ بھی زیرِ غور رکھا جا رہا ہے۔ جب تک خانِ قلات کی ریاست فردِ واحد کے ہاتھ میں ہے اور جب تک وہ برطانوی حکومت کے امنگوں کے مطابق عمل کرتا ہے، ہمیں شمال سے جنوب تک اپنی سرحدوں کے متعلق تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کی آئندہ حکومت کی معیت میں قلات کی ایک مضبوط اور خودمختار بفر ریاست، ہندوستان کی مغربی سرحدوں پر امن وسکون کے لیے بہت ضروری ہے۔

قلات کے ساتھ برطانوی تعلقات

3. 1839ء کو اس وقت برطانوی حکومت کے ساتھ قلات کے تعلقات قائم ہوئے جب برطانوی حکومت اور خان کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کی رُو سے ملکِ قلات، کچھی، مکران، کیچ، بیلا اور سونمیانی بندرگاہ کے لیے خان کے لقب کو تسلیم کر لیا گیا اور یہ بھی مان لیا گیا کہ برطانوی حکومت کبھی بھی خان اور اس کے ماتحتوں اور رعایا کے درمیان مداخلت نہیں کرے گی۔ بہرحال، اس معاہدے کی رُو سے خان کے مطلق اور خودمختار اختیارات پر کوئی اندرونی یا بیرونی قدغن نہیں لگی۔ مزید برآں، 1841ء میں ایک نیا معاہدہ طے پایا جس کے مطابق خانِ قلات، اس کے وارثوں اور جانشینوں نے خود کو پابند کر لیا کہ وہ برطانوی حکومت یا کابل کے ملک معظم شاہ شجاع کی منظوری کے بغیر غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ سیاسی رابطہ کریں گے اور نہ ہی کوئی معاہدہ کریں گے۔ (شاہ شجاع، افغانستان کا ایک جلاوطن حکمران تھا جس نے ریاستِ قلات میں پناہ حاصل کر رکھی تھی اور برطانوی حکومت کے علاقہ ریاستِ قلات کی بھی خواہش تھی کہ تختِ کابل کے دوبارہ حصول کے لیے اس کی مدد کی جائے، ورنہ اس امر کا کوئی قابل اعتماد ثبوت میسر نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ افغانستان اور کابل کے درمیان تعلقات کی بنیاد کوئی اور چیز نہیں بلکہ محض باہمی افہام وتفہیم رہے ہیں)۔ 1854ء میں اس معاہدے کی بجائے ایک اور معاہدہ طے پایا (ضمیمہ A لف ہے)، جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

(i) شاہِ افغانستان کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلقات کے ضمن میں گزشتہ معاہدے کی شق حذف کر دی گئی۔

(ii) اس معاہدے کی رُو سے برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے درمیان مستقل دوستی کی شق شامل کی گئی۔

Scanned by CamScanner

(iii) اس معاہدے کی رُو سے برطانوی حکومت کی منظوری کے بغیر دوسری ریاستوں کے ساتھ بات چیت ممنوع قرار دے دی گئی۔

(iv) اس معاہدے کی رُو سے خان اور وارثوں کو پابند کیا گیا کہ جتنا ممکن ہو سکے، برطانوی حکومت کے دشمنوں کی مخالفت کریں اور اپنی رعایا کی طرف سے ہر قسم کی لوٹ مار اور اشتعال کا سدباب کریں۔

(v) اس معاہدے کی رُو سے خان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے برطانوی حکومت، خان، اس کے وارثین اور جانشینوں کو سالانہ پچاس ہزار روپے نقد امداد دینے پر رضامند ہوگئی۔

معاہدے کی رُو سے قلات کی حیثیت:۔

(i) قلات کی آزاد اور خودمختار حیثیت کا احترام؛

(ii) خانِ قلات کو بہ وقت ضرورت اپنی عملداری برقرار رکھنے کے لیے امداد کی یقین دہانی؛ اور

(iii) بیرونی حملوں کے خلاف خان کے علاقوں کے تحفظ کی ذمہ داری

اپنی طرف سے خانِ قلات نے یہ اقرار کیا کہ

(i) برطانوی حکومت کے دشمنوں کی زیادہ سے زیادہ مخالفت کی جائے گی؛

(ii) برطانوی حکومت کی ماتحت حیثیت سے اس کے ساتھ تعاون کیا جائے گا؛ اور

(iii) سردارانِ قلات کے ساتھ جھگڑے کے باعث ملک میں امن وامان کی صورتِ حال خراب ہونے کی صورت میں برطانوی حکومت کے ثالثی فیصلے کو قبول کیا جائے گا۔

اس معاہدے کے تحت خان کی طرف سے مندرجہ بالا امور قبول کر لینے کے باعث قلات کی خودمختاری پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا کیوں کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ریاست کی خودمختاری کے باعث بذاتِ خود ریاست پر کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے خراج دینے کا پابند بناتا ہے جہاں اس کی ادائیگی 1830ء سے قبل کے Barbary Powers کے تحت کی گئی جو محتاجی کی علامت کے طور پر نہیں بلکہ کسی مفاد کے حصول کی قیمت کے طور پر ہے۔[3]

بین الاقوامی مستقل عدالت انصاف نے بھی اس موقف کی پُرزور تصدیق کی ہے۔

''عدالت، کسی معاہدے کی رُو سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی جس کے تحت ریاست اپنی خودمختاری کے متعلق کوئی بھی قدم اٹھاتی ہے یا اختراز کرتی ہے۔ بلاشبہ کوئی بھی کنونشن جو اس قسم کی ذمہ داری تخلیق کرتا ہے، اس لحاظ سے کہ اسے اپنی ذمہ داری ایک خاص طریقے سے ادا کرنی ہے، ریاست کی طرف سے اپنے

Scanned by CamScanner

خودمختارانہ حقوق کے استعمال پر پابندی درکار ہے۔ لیکن ایک بین الاقوامی معاہدہ طے کرنے کا عمل ایک خودمختار ریاست کی خصوصیت ہے۔[4] جیسا کہ کیلوو (Calvo) بتاتا ہے کہ ایک عارضی اطاعت گزاری جو ایک حکومت، دوسری حکومت کے احکامات کے سامنے اختیار کرتی ہے، یا پھر بیرونی رسوخ، جس کے سامنے بالآخر اسے جھکنا پڑتا ہے، کے ذریعے کوئی بھی خودمختار ریاست اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ مثال کے طور پر کریکو (Cracow) کے شہر کو 1815ء میں ویانا کی کانگریس نے روس، آسٹریا اور پروشیا کے زیرتحفظ ایک آزاد اور غیر جانبدار ریاست تسلیم کرلیا۔ بہرحال، وہ طاقتور رسوخ جس کا ان تین ممالک نے کریکو کی آزاد ریاست پر اطلاق کیا، اس باعث یہ ریاست 1846ء تک ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے موجود رہی کہ جب اسے آسٹریلیا نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔[5] ان مصدقہ بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ 1876ء کے معاہدے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اندرونی خودمختاری کے لحاظ سے حکومتِ قلات اور خانِ قلات کی طرف سے خودمختاری کے دعوے کو غلط قرار دے سکے۔ بہرحال، یہ معاہدہ ریاست کے بیرونی اختیار پر ایک اہم پابندی عائد کرتا ہے۔ اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ خانِ قلات برطانوی حکومت کی رضامندی کے بغیر دیگر ریاستوں سے کسی بھی قسم کی بات چیت نہیں کرے گی لیکن ہمسایہ ممالک کے ساتھ معمول کی خط و کتابت پہلے کی طرح جاری رہے گی۔

اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا 1876ء کے معاہدے کے ذریعے بین الاقوامی مذاکرات پر پابندی کے تحت ریاست قلات کی حیثیت ایک زیرتحفظ ریاست کی سی ہے؟ بلاشبہ یہ سچ ہے کیوں کہ ویلہم (Wilhelm) کہتا ہے کہ بیرونی خودمختاری سے محرومی زیرتحفظ ریاستوں کا ایک لازمی عنصر ہے۔[6] بہرحال، اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کا الٹ بھی اسی طرح درست ہے۔ محض یہ حقیقت کہ ریاست نے بیرونی خودمختاری کے ضمن میں، دوسری حکومت کو اپنے حقوق بخش دیئے ہیں، اس کے باعث دونوں ریاستوں کے درمیان زیرتحفظ ریاست جیسے تعلقات قائم ہوگئے ہوں۔ اس لیے 1876ء کے معاہدے کی رُو سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قلات، برطانوی حکومت کی زیرتحفظ ریاست کی حیثیت حاصل کرچکی ہے بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلات اور برطانوی حکومت کے درمیان ایک جارحانہ اور دفاعی الحاق قائم ہوگیا ہے۔ اس لیے ریاستِ قلات کی حیثیت، ہندوستان کی مانند ایک زیرتحفظ ریاست کی سی نہیں بلکہ اس کی بجائے 1884ء کے کنونشن کے تحت جنوبی افریقہ کی جمہوریہ کی سی ہے کیوں کہ اس کنونشن کی شق کے تحت یہ جمہوریہ اورنج فری سٹیٹ (Orange Free State) کے سوا کسی بھی دیگر ریاست کے ساتھ

Scanned by CamScanner

اس وقت تک کسی بھی قسم کا معاہدہ نہیں کرسکتی جب تک برطانیہ کی ملکہ معظمہ کی منظوری حاصل نہ ہو۔ ریاست قلات کی حیثیت کیوبا کی مانند بھی ہے جو اگرچہ اقوام متحدہ کا رکن ہے لیکن اسے Platt Amendment کے تحت امریکہ کی منظوری کے بغیر کسی بھی بیرونی طاقت یا طاقتوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں جس کے ذریعے کیوبا کی آزادی متاثر ہوتی ہو یا پھر کسی بھی بیرونی طاقت یا طاقتوں کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہو کہ وہ نوآبادیت یا بحری یا فوجی مقاصد یا کسی بھی دیگر مقصد کے لیے کوئی بھی اڈا یا علاقہ حاصل کریں۔

برطانوی ہندوستان میں انتقالِ اقتدار کے اثرات

5. برطانوی ہندوستان میں انتقالِ اقتدار ہونے پر خانِ قلات اور برطانوی حکومت کے درمیان موجود معاہدے ختم ہوجائیں گے اور ان معاہدوں کی رُو سے خان پر جو ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہیں، فوراً ہی منسوخ قرار پائیں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاستِ قلات بیرونی اور اندرونی امور کے لحاظ سے ایک خودمختار اور آزاد ریاست بن جائے گی اور کسی بھی دیگر حکومت یا ملک کے ساتھ معاہدہ طے کرنے میں آزاد ہوگی۔ خانِ قلات اور اس کی رعایا مکمل طور پر آزاد اور خودمختار حیثیت کے خواہاں ہیں جو برطانوی ہندوستان میں انتقالِ اقتدار کے نتیجے میں وجود میں آئے گی۔ اس کی یہ حیثیت جاری رہنی چاہیے اور اسے مجوزہ انڈین یونین کے دائرۂ کار میں آنے کے لیے نہیں کہنا چاہیے۔

آزاد اور خودمختار حیثیت برقرار رکھنے کی وجوہات

قلات کے عوام اور ہندوستانی لوگوں کے درمیان کوئی مماثلت نہیں:۔

6. بہت سی پُرزور اور مضبوط وجوہ کی بنا پر خان اور اس کی رعایا نے یہ طرزِ عمل اپنایا۔ پہلے تو یہ کہ نسلی اور جغرافیائی لحاظ سے قلات اور اس کے زیرتسلط علاقوں کے عوام اور ہندوستانی لوگوں کے درمیان کوئی مماثلت نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، قلات کا شاہی خاندان بروہی النسل نہیں بلکہ عربی النسل ہے۔ اس خاندان کا تعلق مرواری قبیلے کے شاخ احمدزئی سے ہے جس نے بنیادی طور پر اومان سے مکران کی کولواوادی کی طرف ہجرت کی۔ بروہیوں کے علاوہ تمام اہم اور بارسوخ قبیلے غیر ہندی النسل ہیں۔ مری اور بگتی قبائل، جن کا کوہ سلیمان کے زیادہ تر جنوبی پہاڑی سلسلے پر قبضہ ہے، رند بلوچ ہیں، جو تقریباً عربی النسل ہیں۔ وہ سندھ میں عرب فاتحین کے ساتھ آئے یا پھر ان کی سندھ آمد عرب

Scanned by CamScanner

فاتحین کے بعد ہوئی اور وہ مقامی ہندوؤں کے ساتھ رچ بس گئے۔ عرب النسل بلوچ تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ نفیس ترین اور بہترین بلوچ انسانوں پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح ایرانی لوگ (تاجک) بھی ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور تقریباً ہر جگہ پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ایک زمانے میں ایک غالب قبیلے کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن زیادہ تر ان کی پہچان کاشتکاروں کی حیثیت سے تھی جو مکران بھر میں موجود ہیں اور انہیں دہوار یا درزاد کہا جاتا ہے۔ مزید برآں نوشیروانی بھی ہیں جو خالص ایرانی النسل ہیں، ان کی بلوچستان آمد تاریخی ادوار میں ہوئی اور وہ زیادہ تر خاران کے صحرا کے علاوہ ماشکیل میں آباد ہیں۔ بروہی، جو جنوبی بلوچستان کے علاوہ مشرقی پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور کثرت سے ہیں، وہ واحد قبائل ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق دڑاوڑی نسل سے ہے لیکن عصر حاضر میں ان کی ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ کوئی مماثلت اور تعلق نہیں اور صدیوں سے ہی ہندوستانی لوگوں کے ساتھ ان کے روابط منقطع ہیں۔

بروہی زبان کی کسی بھی ہندوستانی زبان کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں

7. جہاں تک زبان کا تعلق ہے، ہندوستان اور قلات کے درمیان خفیف سی مماثلت پائی جاتی ہے۔ بروہی زبان کا تعلق، ہندی یورپی لسانی خاندان کی ایرانی شاخ سے ہے۔ اس کی دو بڑی بولیاں ہیں جو بروہی بولنے والوں لوگوں کی پٹی، جن کا سارا وان اور جھالاوان کی پہاڑیوں پر قبضہ ہے، اور لسبیلہ میں علیحدہ علیحدہ بولی جاتی ہیں۔ بلوچی زبان، قلات کے مغرب میں بولی جاتی ہے جسے مکرانی بھی کہتے ہیں جس میں مشرقی بولی کی نسبت زیادہ تر فارسی کے الفاظ اور تاثرات موجود ہیں۔ موخرالذکر میں عام چیزوں کے لیے مستعمل الفاظ تقریباً خالص بروہی زبان کا مفہوم ادا کرتے ہیں اور باقی زبان فارسی، سندھی اور پنجابی سے مستعار لی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بروہی زبان، دراوڑی زبان ہے لیکن اس کا وسطی ہندوستان کی گونڈ بولی کے علاوہ کسی بھی ہندوستانی زبان سے کوئی تعلق نہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے قلات، ہندوستان کا حصہ نہیں:۔

8. جغرافیائی لحاظ سے قلات، ہندوستانی سرحدوں میں واقع نہیں۔ شمال میں اسے کوہ سلیمان کا جنوبی پہاڑی سلسلہ ہندوستان سے جدا کرتا ہے جب کہ جنوب میں قلات کا ناقابل تصور ویران صحرا موجود ہے جو سندھ کے صحرا کے ساتھ جا ملتا ہے جس کا دامن ہندوستانی سرحد تشکیل دیتا ہے۔ یہ بروہی زبان کی سرزمین ہے اور چونے کے پتھر کی سرحد کی ستواں دیوار، تمام ہندوستانی سرحد کی جداگانہ حیثیت

Scanned by CamScanner

کی نہایت ہی نمایاں خصوصیت ہے۔ کراچی کے نزدیک سمندر سے 60 میل کے فاصلے پر دریائے حب اس کی سرحد ہے۔ علاقے بھر میں طویل پہاڑی چوٹیاں اور ریت کے ڈھیر موجود ہیں جہاں سے مکران کو جانے والی ایک سڑک مل سکتی ہے۔ لیکن جس جگہ سے سرحد دریائے حب سے علیحدہ ہوتی ہے، وہاں سے کیرتھر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہیں سے 150 میل پر ٹھوس چٹانی دیوار کی ابتدا ہوتی ہے جو ہندوستان کے ریتلے علاقوں سے کئی ہزار فٹ بلند ہے۔ ریاست کے ان ناقابل رسائی علاقوں میں رکنے کی ایک جگہ مسطح، ٹاپو پر مشتمل صحرا ہے جو بلوچستان کے پہاڑی نظام میں داخلے کا ایک راستہ تشکیل دیتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے قلات کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا

9. تاریخی لحاظ سے قلات کبھی بھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔ اس ریاست کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اس کے متعلق سب سے پہلا احوال جو ہمیں معلوم ہوا، اس کا راوی ارائن (Arrain) ہے۔ وہ اس علاقے میں سکندر کی پیش قدمی کے متعلق بتاتا ہے۔ آٹھویں صدی میں اس ملک پر خلیفہ کی فوج نے حملہ کیا۔ موجودہ خاندانی سلطنت کا بانی قمبر تھا جو پہاڑی قبائل کا ایک رہنما تھا۔ مختلف کامیابیوں اور فتوحات کے بعد قمبریوں نے گنداوا کے زرخیز میدانی علاقے کے قابل ذکر حصے پر مشتمل ایک خودمختار ریاست قائم کرلی۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب نادرشاہ نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایران سے پیش قدمی کی اور خانِ قلات نے فوج اور نقد رقم کے ساتھ شاہ کی مدد کی، جسے ایک فرمان کے ذریعے تمام بلوچستان کا "Beglar Begi" (شہزادوں کا شہزادہ) مقرر کیا گیا۔ نادرشاہ کی وفات کے موقع پر خانِ قلات نے احمد شاہ درانی کو بحیثیت شاہ کابل تسلیم کرلیا۔ بہرحال 1758ء میں خان نے خود کو ایک خودمختار اور آزاد حکمران قرار دیا جس پر احمد شاہ نے اپنے ایک وزیر کی زیرقیادت اس کے خلاف ایک فوج روانہ کی۔ یہ مہم، امن کے ایک معاہدے کے بعد ختم کردی گئی جس کے مطابق خان، کابل کی افواج اور شاہِ افغانستان کے لیے فوجی فراہم کرنے پر رضامند ہوگیا جس کے عوض شاہ افغانستان نے نقد رقم دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس زمانے سے 1839ء تک جب برطانوی فوج نے افغانستان جانے کے لیے درۂ بولان کے راستے پیش قدمی کی، قلات مکمل طور پر خودمختار اور آزاد تھا اور ہندوستان یا کسی بھی ملک کا اطاعت گزار نہ تھا۔

قلات، ہندوستانی ریاست نہیں

10. قلات، ہندوستانی ریاست نہیں اور کبھی بھی اس کی حیثیت ایک ہندوستانی ریاست کی سی

Scanned by CamScanner

نہیں رہی۔ برطانوی حکومت نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کی حاکمیت کا اطلاق قلات کے ساتھ تعلقات پر بھی ہوتا ہے نہ ہی قلات نے یہ تسلیم کیا کہ برطانوی حاکمیت کا اطلاق اس اور اس کی حکومت پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس، برطانوی حکومت کے بہت سے نمائندوں نے قلات کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست قرار دیا ہے۔ 1872ء میں سر ڈبلیو ایل میرویدر (Sir W.L.Merewether) جو قلات کے ساتھ تعلقات کے امور کے شعبے کا سربراہ تھا، نے یوں بیان کیا: ''کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا اور اس ضمن میں بہت کم شبہ ہے کہ قلات یا بلوچستان کے متعلق وہ راستہ اختیار کیا جائے کہ اسے درست انداز میں پکارا جائے۔۔۔ ''ملک معظم خان اس ملک کا عملی اور حقیقی حکمران ہے۔ اس کے ساتھ ہم نے معاہدے طے کیے ہیں جن کے تحت خان اس امر کا پابند ہے کہ وہ اپنی رعایا کو برطانوی علاقے یا لوگوں کو نقصان پہنچانے سے باز رکھے اور تجارت کی حفاظت کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمارا معاہدہ بطور حکمران ہے اور کسی بھی معاہدے کے تحت ہم کسی بھی طرح براہ راست مداخلت نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی حکومت کا انتظام وانصرام کس طرح کرتا ہے۔''[7] قلات کے امور کے ایک اور مستند برطانوی ماہر، سر بارٹل فریئر (Sir Bartle Frere) نے بھی اسی قسم کے موقف کا اظہار کیا۔ قلات کے متعلق حکومت برطانیہ کی پالیسی کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے سر بارٹل فریئر نے 1876ء میں یوں لکھا: ''یہ ہمارا بنیادی اصول تھا کہ خانِ قلات کی خودمختار حیثیت کو منتشر کرنے کے لیے بلوچ قبائل پر طاقت آزمانے کی کوئی کوشش نہ کی جائے، خواہ یہ کوشش علامتی یا عملی ہو بلکہ اپنی طاقت کے ذریعے اس کی خودمختار اور مطلق حیثیت قائم رکھنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جائیں۔ خان کو ہمارا آزاد اور خودمختار حلیف سمجھا جاتا تھا جو اپنے اندرونی معاملات میں آزاد تھا لیکن بیرونی امور میں وہ برطانوی حکومت کا ماتحت تھا جو اس کی اپنی سرحد سے باہر اثر انداز ہو سکتے تھے۔۔۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، ہم نے قلات کے بارے میں وہی طرزِ عمل اختیار کیا، جو طرزِ عمل ہم نے بلجیم یا سوئٹزرلینڈ کے متعلق اپنایا۔''[8] انارکی کے باوجود حکومت ہندوستان نے مقامی حکام کی امنگوں کے خلاف یہی پالیسی اپنائی رکھی جو 1876ء کا معاہدہ طے پانے تک جاری رہی۔ مزید برآں، حکومت ہند نے اپنی برتری اور تسلط جتانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے علاوہ حکومت ہند نے سالانہ ادا کی جانے والے امدادی رقم کو خرچ کرنے کے علاوہ متعدد معاہدات کے تحت حاصل ہونے والے اختیارات بھی استعمال میں لانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس وقت کے وزیر خارجہ برائے ہند لارڈ سالسبری (Lord Salisbury) نے حکومت ہند کی پالیسی کی منظوری دیتے ہوئے گورنر جنرل ان

Scanned by CamScanner

کونسل (Governor-General-in-Council) کو لکھا: ''اس ریاست کے خلاف مسلح کارروائی غیر دوستانہ ہوتی جس کے ساتھ آج تک ہمارے تعلقات خوشگوار ہیں جب کہ اس کارروائی کا نتیجہ اس ملک پر ہمارے طویل قبضے کی صورت میں برآمد ہوتا اور دیگر حلقوں کے ساتھ ہمارے آئندہ تعلقات خراب ہو جاتے۔۔۔ ملک معظم کی حکومت کو یہ یقین ہے کہ 1854ء کے معاہدے کے تحت خانِ قلات کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے قیام کے لیے پہلے دستیاب موقع سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے اور اس طرح برطانوی حکومت کے مفاد میں درکار پالیسی کو دوبارہ جاری کرنا چاہیے، جو قلات کی مستقل آزاد اور خودمختار حیثیت جاری رہنے کے لیے ضروری ہے۔''[9]

بلاشبہ یہ سچ ہے کہ حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء کے تحت، قلات کو ایک ہندی ریاست سمجھا جاتا ہے اور وفاقی مقننہ میں اسے نمائندگی بھی دی گئی ہے لیکن اس ضمن میں ریاست قلات کے ساتھ اس قانون کے مسودے کی تیاری میں مشاورت کی گئی نہ ہی ریاست قلات اس قانون کے حوالے سے کسی بھی طرح ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھی۔ برطانوی پارلیمان کے قانونی عملداری کی حدود سے باہر ہونے کی حیثیت سے ریاست قلات کے علاقوں پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ بہرحال، خانِ قلات نے اس قانون کی شقوں کے خلاف احتجاج کیا جو اس کے مطابق اس کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی، نیز اس نے 1876ء کے معاہدے کی ازسرنو رسمی توثیق کا بھی مطالبہ کیا۔ تاجِ برطانیہ کے نمائندے ملک معظم نے اپنے ذاتی خط کے ذریعے اسے یقین دلایا کہ اس قسم کی ازسرنو توثیق غیر ضروری ہے، نیز ملک معظم کے نزدیک 1876ء کا معاہدہ ہر لحاظ سے قابل عمل ہے اور یہ برطانوی حکومت اور ریاست قلات کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بنیاد ہے۔

ریاست کے مستقبل کے متعلق حکومت قلات کا موقف

11. اندریں حالات، حکومت قلات نے درج ذیل موقف اختیار کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ قلات کے عوام، حکومت قلات کے اس موقف کی متفقہ طور پر حمایت کرتے ہیں:

(a) کہ ریاست قلات ایک آزاد اور خودمختار ریاست ہے جس کے برطانوی حکومت کے ساتھ تعلقات 1876ء کے معاہدے کے مطابق قائم ہیں۔

(b) کہ ریاست قلات کی آزاد اور خودمختار حیثیت کے پیش نظر خان، اس کی حکومت اور اس کی رعایا اس امر پر کبھی بھی رضامند نہیں ہوں گے کہ قلات کو وفاق ہند میں شامل کیا جائے۔

Scanned by CamScanner

(c) کہ برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدہ کی منسوخی کے بعد ریاست قلات، مکمل آزادی اور خودمختاری پر مشتمل معاہدے سے قبل کی حیثیت دوبارہ اختیار کرلے گی اور آئندہ کے لیے کوئی بھی طرزِ عمل اپنانے میں آزاد ہوگی۔

بہرحال، خان اور اس کی حکومت کی شدید خواہش ہے کہ ہندوستان کے ساتھ دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں، نیز حکومت قلات کسی بھی ایسی مخلوط حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگی جو قطعی طور پر باہمی مفاد اور خودمختاری کے اصول پر برطانوی حکومت کی جگہ اقتدار سنبھالے۔

(ii) لسبیلہ اور خاران کے متعلق دعوے

لسبیلہ کی حاکمیت کی ابتدا

12. ہندوستان میں برطانوی حکام نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ خانِ قلات، بلوچستان کا ایک آزاد اور خودمختار حکمران ہے۔ سر ولیم میریویدر نے 1876ء میں لکھا: ''سندھ کی سرحد کے ساتھ صرف ایک ملک واقع ہے جس کا حکمران خان ہے اور مختلف قبائل کے سردار اس کے اطاعت گزار ہیں۔''[10]

ان میں سے ایک سردار، جام لسبیلہ ہے جو ریاست قلات کی ایک ذیلی ریاست رہی ہے اور لسبیلہ کے موجودہ خاندان کی تخلیق کے باوجود، یہ ریاست، قلات کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ 1742ء کا زمانہ تھا جب جاموٹ قبیلے کے سردار، جام علی نے لسبیلہ پر مشتمل علاقوں کو فتح کرنے کے لیے خانِ قلات سے مدد طلب کی۔ خان نے بروہیوں کی ایک طاقت ور فوج روانہ کی۔ اس فوج کی مدد کے ذریعے جام علی اپنی عملداری قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور فوجی خدمات کے علاوہ آمدن کے نصف حصے کی شرط پر اسے خان کی طرف سے یہ علاقے پاس اپنے رکھنے کی اجازت دی گئی۔

خانِ قلات اور جام لسبیلہ

13. 1776ء میں جام میر خان اوّل نے لسبیلہ کی حاکمیت سنبھالی اور خانِ قلات کی بیٹی سے شادی کرلی جس نے لسبیلہ پر نصف آمدن کی ادائیگی ضروری قرار دے دی جو 1742ء سے خان وصول کررہا تھا۔ بہرحال، لسبیلہ بدستور خانِ قلات کی حاکمیت میں رہا اور زمانۂ جنگ میں جام کے لیے 4,500 فوجی میدانِ جنگ میں بھیجنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ اس حیثیت کو برطانوی حکومت نے 1839ء کے معاہدے کی شق (1) کے تحت تسلیم کیا تھا جس میں بیان کیا گیا ہے: ''جس طرح سوگوار احمد شاہ درانی کے

Scanned by CamScanner

زمانے سے ہی نصیر خان اور اس کے جانشین، اس کا قبیلہ اور بیٹے، ملکِ قلات، کچھی، خورستان، مکران، کیچ، بیلا اور سونمیانی کی بندرگاہ پر قابض تھے، عین اسی طرح وہ آئندہ بھی اپنے ملک کے نگران اور منتظم رہیں گے۔"

جام لسبیلہ کی بغاوتیں

14. 1830ء میں جام میر خان دوم نے لسبیلہ کا اقتدار سنبھالا۔ اس نے خانِ قلات کی بیٹی سے شادی تو کر لی لیکن وہ خان کے خلاف سازش سے باز نہ آیا۔ اس نے جھالاوان کے سرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور خاران کے آزاد خان کی مدد سے ریاستِ قلات کے خلاف تین بغاوتیں کیں۔ ان بغاوتوں میں اسے مقامی برطانوی حکام کی معاونت حاصل رہی جنہوں نے 1861ء میں اس کے ساتھ ہندی وایرانی ٹیلی گراف لائن کی حفاظت کے لیے براہ راست معاہدہ کر لیا۔ حالاں کہ برطانوی حکومت نے جام کو خانِ قلات کا محکوم تسلیم کر رکھا تھا۔ سندھ کے کمشنر سر ولیم میریویدر نے ان حالات کو اعلیٰ حکام کے گوش گزار کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بالکل نہ کیا۔ اس نے ضلع سندھ کی ضلعی سرحدی انتظامیہ کے نام اپنے ایک خط مورخہ 30 ستمبر 1876ء میں کہا: "عمومی طور پر جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، ریاست قلات کے تمام افراد، سرداروں یا دیگر لوگوں کے ساتھ معاملات سندھ کے بالائی سرحدی ضلع کے پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ اور خان کے ذریعے طے کیے جاتے تھے لیکن ایک معاملہ ایسا ہے جس کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے مضبوط معاہدے کی خلاف ورزی کے مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ خان اور اس کی حیثیت کو نظر انداز کرنے کا عمل جو واقعی انجام پایا اور اس طرح کے عمل کے ذریعے خان کے اختیارات کو کم کرنے کے خطرے کو اس وقت کے پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ کے گوش گزار کیا گیا لیکن سندھ کے کمشنر نے اسے نظر انداز کر دیا۔ معاملہ، مکران کے ساحل سے خلیج فارس تک ٹیلی گراف لائن بچھانے کا تھا۔۔۔ اگرچہ سردار کی حیثیت سے جام، خان کا محکوم تھا لیکن اس کے ساتھ ایک معاہدہ براہِ راست طے کیا گیا۔ یہ سردار ہمیشہ سے یہ ایک ناعاقبت اندیش محکوم ثابت ہوا جو خان کے لیے مسلسل پریشانیاں پیدا کرتا رہا اور خان کے خلاف بغاوتوں میں بھی ملوث رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خان کی آزاد اور خود مختار حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس میں بھی اپنی ایک آزاد ریاست قائم کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔"[11]

15. ان تین بغاوتوں میں سے پہلی بغاوت جولائی 1865ء میں ہوئی۔ لیکن خان کی فوج کے

Scanned by CamScanner

ہاتھوں شکست کھانے کے بعد جام گرفتار ہوگیا۔ خان نے اسے معاف کرنے کے علاوہ اسے رِہا بھی کردیا لیکن 1868ء کے اواخر میں اس نے ایک اور بغاوت کی تیاری شروع کی۔ اس بغاوت میں خاران کا سردار آزاد خان اس کا سب سے بڑا معاون تھا۔ بہر حال، دوبارہ مذاکرات ہوئے اور وقتی طور پر باغی اپنی فوجوں کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے لیکن اس کے بعد جلد ہی ایک کھلی بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت بھی ناکامی کا شکار ہوئی اور بالآخر جام معافی کا طلبگار ہوا اور اسے دوبارہ معافی دے دی گئی۔ 1869ء میں جام نے خان کے خلاف دوبارہ بغاوت کی لیکن اسے خان کے فوجیوں کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ کراچی فرار ہوگیا۔ اسے اس شرط پر برطانوی حکومت نے پناہ دی کہ وہ اپنے مسلح ساتھیوں کو چھوڑ دے گا اور برطانوی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ کسی بھی جگہ رہائش اختیار کرے گا، نیز برطانوی علاقے میں رہتے ہوئے وہ خان کے قلات کے امور یا اس کی سابقہ محکوم ریاستوں کے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔

خانِ قلات کی طرف سے جام اور لسبیلہ کی انتظامیہ کی بے دخلی

16. اپنے علاقوں سے جام کی بے دخلی کے بعد برطانوی حکومت نے خانِ قلات کو لسبیلہ کی انتظام کاری کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا اور مسلسل اس ضرورت پر زور دیتے رہے کہ علاقوں پر قبضہ کرنے اور ان کے انتظام وانصرام کے لیے ایک اہلکار مقرر کیا جائے۔ جنوری 1872ء میں سندھ میں برطانوی کمشنر نے خان کو لکھا کہ ''صوبہ جھلاوان میں باغیوں نے لسبیلہ پر قبضہ کرلیا ہے اور عالی جناب کے حکام آپ کی عملداری بحال کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔'' 22 اپریل 1873ء کو ایک مرتبہ پھر خان کو خط لکھا گیا: ''میں، ملک معظم، خان کی توجہ ایک نہایت ہی ضروری معاملے کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی لسبیلہ جیسے دولت مند ضلع کی انتظام کاری کے متعلق آپ کو بتایا گیا تھا۔ کئی مہینوں سے لسبیلہ میں آپ کا کوئی بااختیار نمائندہ موجود نہیں۔ وہاں کی عوام کے ساتھ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ آپ کے لیے مفید بھی ہے کہ لسبیلہ سے آنے والی کثیر آمدن سے اپنے خزانے کو بھر لیں۔''

3 مئی 1873ء کو سندھ میں تعینات کمشنر نے اس معاملے سے بمبئی کے گورنر کو آگاہ کیا: ''ایک سال سے زائد عرصے سے ضلع لسبیلہ میں گورنر موجود نہیں کیوں کہ باقاعدہ افواج کی کارروائی کے نتیجے میں شاہ گاسی گلام جام کو یہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔ امن وامان بحال ہونے کے بعد گزشتہ موسم گرما میں میجر ہیریسن نے خان سے اس کی سلطنت کے اس اہم حصے میں اپنا نمائندہ تعینات کرنے کے لیے

Scanned by CamScanner

مسلسل اصرار کیا لیکن خان ابھی تک اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ دراصل علی خان جاموٹ کے علاوہ خان کا کوئی حریف نہیں لیکن وہ ایک معمولی سردار ہے جس کے پیروکار بھی بہت کم تعداد میں ہیں۔ ریاست لسبیلہ کے باعث بہت پریشانی پیدا ہو رہی ہے اور اس وقت ضروری ہے کہ خان کو کہا جائے کہ اس علاقے میں ایک بار پھر مناسب حکمران مقرر کیا جائے۔ لسبیلہ کے ایک اہم قبیلے، رونجھا کے علاوہ کچھ دیگر قبائل نے بھی خان سے درخواست کی کہ بغیر کسی تاخیر کے یہاں گورنر بھیجا جائے جس کا وہ نہایت خوشی سے استقبال کریں گے اور بخوشی اس کی اطاعت کریں گے۔'' بلاشبہ، 1873ء میں خان کے خلاف حکومت ہند کی طرف سے کی جانے والی شکایتوں میں ایک شکایت یہ بھی تھی: ''لسبیلہ میں اچھی حکمرانی کے لیے بہتر انتظامات کرنے اور اس علاقے سے گزرنے والے برطانوی تاجروں پر مظالم کی روک تھام کے ضمن میں خان نے غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔'' برطانوی حکومت کا یہ طرزِ عمل خانِ قلات کے قانونی حقوق اور فرائض کے بالکل عین مطابق تھا۔ لہٰذا، بالآخر خان نے لسبیلہ کی انتظام کاری کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

17. لسبیلہ میں خان کی عملداری کو اس وقت برطانوی حکومت نے تسلیم کر لیا جب کہ لسبیلہ کے سابق جام کو خان کی گزشتہ معافیوں کے بغیر قلات آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے خط نمبر 1250-P مورخہ 4 جون 1872ء میں حکومت ہند کے خارجہ سیکریٹری نے حکومت بمبئی کو مطلع کیا کہ ''جام لسبیلہ کو واضح طور پر بتا دیا جائے کہ خان کی منظوری کے بغیر اس کو قلات واپس آنے کی اجازت نہیں۔''

خانِ قلات کی حاکمیت کے سامنے جام کی اطاعت گزاری

18. 13 جولائی 1876ء کو مستونگ میں خانِ قلات کے علاوہ ساراوان اور جھالاوان کے سرداروں کے اعزاز میں حکومت برطانوی نمائندوں کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیے میں ''میر جام علی خان اور سردار ملا محمد نے سرداروں کی طرف سے عالی جناب کو جواب دیا۔ انہوں نے خان کو یقین دلایا کہ وہ اس سے وفادار اور مخلص رہیں گے کہ وہ انہیں اپنے اعتماد اور مہربانی کے قابل سمجھتا ہے اور وہ اپنے خان کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے سرداروں کے لیے بنائے گئے قواعد وضوابط کی پابندی کریں گے۔'' جولائی 1876ء میں برطانوی نمائندوں کی طرف سے ''ملک معظم خانِ قلات، میر خداداد خان اور اپنے باپ، جام میر خان کی طرف سے میر جام علی آف لسبیلہ کے علاوہ بلوچستان کے بروہی سرداروں کے درمیان'' امن کی شرائط طے کی گئیں۔

Scanned by CamScanner

اس معاہدے کی شق 2 یوں بیان کی گئی ہے: ''ہم، ساراوان اور جھالاوان سردار، خانِ قلات، میر خداداد خان کے سامنے اپنی وفاداری اور اطاعت کا اعلان کرتے ہیں جو ہمارے قدیم رسم ورواج کے مطابق ہے۔ عالی جناب نے (قدیم رسم ورواج کے مطابق) ہمارے سابقہ حقوق اور مراعات بحال کردی ہیں، نیز قدیم رسم ورواج کے مطابق انہوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ بشرطیکہ ریاست قلات کی وفاداری اور اطاعت گزاری، ان کے ساتھ آئندہ شفقت ومہربانی کا سلوک کیا جائے گا۔'' اس معاہدے کے مطابق لسبیلہ کے سابق جام کی رہائی کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس معاملے کی متعلقہ شق نمبر 4 یوں تھی: ''ہم، جام میر خان کے بیٹے، میر جام علی خان، ساراوان اور جھالاوان کے سردار نے، جنہوں نے قدیم رسوم ورواج کے مطابق عالی جناب کے سامنے علی لاعلان اپنی وفاداری اور اطاعت کا اظہار کیا ہے، عالی جناب کے سامنے یہ درخواست پیش کی ہے کہ جام میر خان کی رہائی کے لیے، جو اس وقت برطانوی حکومت کے پاس نظر بند ہے، برطانوی حکومت سے مداخلت کا کہیں۔ چونکہ عالی جناب نے ہماری یہ درخواست منظور کر لی ہے، اس لیے عالی جناب سے درخواست ہے کہ اس درخواست کو مہر بند لفافے میں شاہی مہر کے ساتھ میجر سنڈیمن کو پہنچا دیا جائے اور اسے کہا جائے کہ یہ درخواست حکومت ہند کو اس موقف کے ساتھ پہنچا دی جائے کہ جام میر خان کو رِہا کیا جا رہا ہے۔ ہم برطانوی حکومت کے غور کے لیے اپنی اس خواہش کا دوبارہ اظہار کرتے ہیں۔''

برطانوی حکومت نے یہ درخواست قبول کر لی مگر درج ذیل شرائط عائد کر دیں:

(i) کہ قدیم رسوم ورواج کے مطابق جام کو خان کی حاکمیت تسلیم کرنی ہوگی۔

(ii) کہ اسے معاہدے کی ان شرائط کا احترام کرنا ہوگا جو اس کے بیٹے، قائم مقام جام نے مستونگ کے مقام پر جولائی 1876ء میں تسلیم کی تھیں۔

(iii) کہ اسے اور اس کے جانشینوں کو معاہدے کی ان تمام شرائط کو قبول کرنا ہوگا جو برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے درمیان ان کی متعلقہ عوام اور حکام کی طرف سے طے پائی ہیں کہ یہ تمام شرائط دانش مندانہ اثرات کی حامل ہیں یا اس پر لاگو ہوتی ہیں۔

19. یہ درست ہے کہ کچھ عرصے کے لیے انتظامی بنیادوں پر حکومت برطانیہ، لسبیلہ کے ساتھ براہ راست معاملات طے کرتی رہی ہے اور اس کے ساتھ کم وبیش خانِ قلات کی محکوم ریاست کی حیثیت سے طرزِ عمل اختیار کرتی رہی ہے لیکن اس قسم کی معاہدے کے سلسلے میں خان سے کبھی مشاورت کی گئی نہ ہی

Scanned by CamScanner

خان نے کبھی اس معاہدے کے ضمن میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا، نیز لسبیلہ کے متعلق اس کے حقوق اور اختیارات 1876ء معاہدے کے مطابق بدستور قائم ہیں۔

20. مندرجہ ذیل احوال سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

(i) کہ لسبیلہ، جھلاوان کے صوبے میں ریاست قلات کا ایک ضلع سمجھا جاتا رہا ہے، اس لیے یہ قلات کی سرزمین کا ایک حصہ ہے۔

(ii) چونکہ جام لسبیلہ، جھالاوان کے سرداروں میں سے ایک سردار ہے اور اسے خانِ قلات کے دربار میں نشست حاصل ہے، اس لیے جام، ریاست قلات کا محکوم ہے۔

(iii) کہ لسبیلہ کے عوام، ریاست قلات کی رعایا ہیں۔

(iv) کہ خانِ قلات، لسبیلہ میں امن وامان کا ذمہ دار ہے، اس لیے اسے اس کی انتظام کاری کے ضمن میں مکمل اختیارات حاصل ہیں۔

(v) کہ خانِ قلات کے اختیارات کے تحت جام لسبیلہ کو اندرونی خودمختاری کے ضمن میں کچھ اختیارات حاصل ہیں۔

خاران کی حاکمیت

21. سرزمین بلوچستان کی حدود میں خاران کی ایک ریاست ایسی تھی جس کے متعلق برطانوی حکومت نے خانِ قلات کو خودمختار قرار دیا تھا۔ ''ساتویں صدی کے اواخر میں ہی خاران یا اس کے حاکم سردار معلوم تاریخ میں واضح حیثیت کے ساتھ نمودار ہوئے۔ اس زمانے کے بعد سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروانیوں کے چھوٹے سے خاندان میں ہی تمام اختیارات مرتکز ہوگئے تھے جن کی آج تک تعداد 9 خاندانوں سے زیادہ نہیں ہوسکی، انہیں ان تمام گروہوں کی قیادت حاصل تھی جن میں خاران کی آبادی منقسم تھی۔ یہ لوگ مغرور، جرأت مند، قابل اور بے ایمان کے علاوہ ظالم بھی تھے لیکن دوسروں پر مظالم برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک طاقت وقوت ان کا ہی حق تھا، وہ سازشی اور باوسائل تھے اور مجبوری کے عالم میں اطاعت اختیار کر لیتے۔ نیز ملحقہ ایران، افغانستان یا قلات کے ممالک کے لیے مناسب خدمات مہیا کرتے تھے، اور انہی تمام خصوصیات کی بنا پر وہ غالب قوت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔[12]

22. یہ 1730ء کا زمانہ ہے جب پہلی بار قلات سے خاران کا تعلق سامنے آتا ہے۔ یہ وہ موقع تھا

Scanned by CamScanner

جب نادر شاہ نے افغانستان پر حملہ کیا اور خاران کے حاکم، پُر دل خان کو خانِ قلات کے ذریعے نادر شاہ نے طلب کیا کیوں کہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ یہ سردار، خان کی خود مختار حیثیت کے زیر تسلط ہے۔

لیکن 1751ء کے اواخر اور نصیر خان اوّل کے دورِ حکومت میں، خاران، خانِ قلات کی زبردست طاقت کے زیر تسلط آیا۔ پوٹنگر بیان کرتا ہے کہ خاران، عملی طور پر 1810ء میں اس کے دورے سے چھ برس بعد قلات سے آزاد ہوا۔ بہر حال، یہ درست معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ بعد کے دورِ حکومت میں یہ خانِ قلات ہی تھا جس نے خاران کے حاکم اور اس کی رعایا کے درمیان مداخلت کر کے ایک مصالحتی معاہدہ طے کروایا۔ اس لیے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت تک قلات کی خود مختار حیثیت بدستور قائم رہی جب 1831ء اور 1838ء کے برسوں میں آزاد خان، خاران کا حاکم بنا۔ ''بنیادی طور پر آزاد خان کی صلاحیت، توانائی اور پالیسی کا مقصد، خاران کی عملی آزادی تھی۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اس نے خان کی عملداری صرف اور صرف مجبوری کی حالت میں قبول کی جب کہ افغانستان کے لیے اس کی اطاعت حقیقی نوعیت کی بجائے پیشہ ورانہ تھی۔[13] اس نے خانِ قلات اور بروہی سرداروں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور وہ سرداروں کی طرف سے خان کو اقتدار سے ہٹانے کے ضمن میں کی گئی مسلسل کوششوں کا سب سے زیادہ ذمہ دار تھا۔ 1870ء میں سندھ کے برطانوی کمشنر نے یہ بتایا کہ ''خان کے دورِ حکومت میں اور موجودہ دورِ حکومت شروع ہونے پر بھی وہ شر انگیز عناصر موجود رہے ہیں جو خاران کے آزاد خان کے علاوہ جام لسبیلہ کے سازشانہ منصوبوں کی شکل میں موجود تھے۔''

خانِ قلات کی عملداری کی قبولیت

23. 1870ء میں سراوان کے سردار ملا محمد نے آزاد خان اور خانِ قلات کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے کوششیں کیں اور اس نے آزاد خان کی طرف سے شرائط پیش کیں لیکن خان نے یہ شرائط مسترد کر دیں۔ یہ حالات نہایت ہی واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ آزاد خان، خانِ قلات کے زیر تسلط تھا۔ یہ شرائط یوں تھیں: ''عالی جناب مرحوم میر محمود نصیر خان اور میر خداداد خان کی مہروں کی رُو سے سردار نوردین اور آزاد خان نوشیروانی کو سارا وان کے علاوہ جھالاوان میں عطا کردہ انعامات اور جاگیریں مکمل طور پر بحال کر دی جائیں گی۔ سردار ملا محمد، خانِ قلات کو سارا وان اور جھالاوان میں ہونے والے جانی و مالی نقصان سے بری الذمہ قرار دینے پر رضامند ہو گیا۔ آج، بروز جمعہ، مورخہ 10 رمضان سے اگر کسی بروہی نے عالی جناب، خان کے علاقے میں کوئی شرارت کی تو اسے ملا محمد وکیل

Scanned by CamScanner

کے حوالے کر دیا جائے گا تا کہ اسے ملا محمد کی مرضی کے مطابق سزا دی جائے۔ یہ بھی کہ نوردین اور آزاد خان سرداروں نے جو بھی شر پسندانہ کارروائیاں کی ہیں، انہیں معاف کیا جاتا ہے لیکن آئندہ انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی کہ عالی جناب، خان، ایک خود مختار حکمران تھے اور وہ ان کی رعایا ہیں۔''[۱۴۰]

یہ جو شرائط نواب محمد خان کی طرف سے قلات کے برطانوی ایجنٹ کو پہنچائی گئی تھیں، خاران پر خانِ قلات کی واضح عملداری کا اعتراف تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا کہ نوردین اور آزاد خان سرداروں کی طرف سے بپا ہونے والی بغاوتوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا، اور آئندہ اس وجہ سے کسی بھی بغاوت میں حصہ نہیں لیا جائے گا کہ قدیم رسم و رواج کے مطابق عالی جناب، ملک کے بادشاہ ہیں۔ آئندہ، گزشتہ برسوں کی مانند، ہم ہمیشہ خان کے خدمت گزار رہیں گے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ 1872ء میں خاران کے آزاد خان نے خانِ قلات کے بڑے بیٹے کے نام خط میں خانِ قلات کی واضح اطاعت کا اعتراف کیا۔ اس نے کہا، ''تمہارا باپ، خانِ بلوچستان ہے اور ملک میں ہونے والے تمام غلط اور درست اقدامات کا ذمہ دار ہے۔ درست ہے کہ تمہارے باپ نے خاران کے خلاف فوج بھیجی اور میرے آدمیوں اور غلاموں کو اٹھا لیا۔ آدمیوں کو تو اس نے رِہا کر دیا لیکن غلاموں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ کسی ملک کا حکمران ہر ممکن طریقے سے جنگ کرتا ہے لیکن مفتوح عوام کو غلام نہیں بناتا۔ تمہارے باپ نے ایسا ہی کیا ہے۔''

پنجگور کا معاہدہ:۔

24. 1883ء میں برطانوی نمائندے کی مداخلت کے باعث خان اور خاران کے سردار کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت آزاد خان نے خانِ قلات کی برتری کو تسلیم کر لیا اور اسے ریاست قلات کے سراوان کے ایک سردار کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔

بعد ازاں، جس طرح لسبیلہ کے معاملے کا تعلق ہے، برطانوی حکام نے خاران کے ساتھ کم و بیش ایک محکوم ریاست کی مانند طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ سب کچھ انتظامی سہولیات کے ضمن میں تھا جس کے باعث کسی طرح بھی خان کے حقوق متاثر نہیں ہوتے تھے۔

خاران کے متعلق خانِ قلات کے حقوق و اختیارات:۔

25. مندرجہ بالا واقعات و حالات کی روشنی میں حکومت قلات کا موقف ہے کہ

(i) ہمیشہ سے ہی اور آج بھی خاران، ریاست قلات کا حصہ ہے؛

Scanned by CamScanner

(ii) خاران کا حکمران، قلات کے سارا وان سرداروں میں سے ایک سردار ہے اور سے خانِ قلات کے دربار میں ایک نشست عطا کی گئی ہے، اور یوں وہ ریاست قلات کا محکوم ہے؛

(iii) خاران کے عوام، ریاست قلات کی رعایا ہیں؛

(iv) خاران کے حاکم کو خانِ قلات کی رضامندی سے خاران کے اندرونی معاملات میں کچھ اختیارات حاصل ہیں۔

لسبیلہ اور خاران کے حوالے سے خانِ قلات کا لقب

26. حکومت قلات کا موقف ہے کہ خانِ قلات کے لقب کا اطلاق لسبیلہ اور خاران کے علاقوں پر ہوتا ہے اور خان کی عملداری مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے:

(i) برطانوی حکومت کی طرف سے اعترافات۔ ''خودمختار بلوچستان'' جیسے الفاظ کے استعمال، ''سلطنت کا یہ اہم حصہ''، ''لسبیلہ کا ضلع'' اور ''حقیقی و عملی حکمران'' کے ذریعے واضح اور صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ان علاقوں کے لیے خان کا یہ لقب تسلیم کر رکھا تھا۔

(ii) لسبیلہ اور خاران کے سرداروں کی طرف سے خانِ قلات کی عملداری کا اعتراف۔ ''رعایا''، ''اطاعت'' اور ''قدیم رسم و رواج کے مطابق ملک کا بادشاہ'' جیسے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعترافات واضح طور پر خانِ قلات کے دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔

(iii) ان علاقوں میں خودمختار حیثیت کا عملی اظہار یا پھر مشرقی گرین لینڈ کے معاملے میں عالمی مستقل عدالت انصاف کے الفاظ کا استعمال، ''خودمختار حیثیت کا اظہار'' اور ''حکومتی پالیسی کا اظہار''۔ اس قسم کا ''اظہار'' خانِ قلات کی طرف لسبیلہ کا انتظام سنبھالنے اور خاران کے سردار کے حق میں اس کی امداد کی ضبطی کے عمل کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرداروں کو قلات کے درباروں میں جگہ دی گئی۔

قلات اور اس کی عملداری میں سرداروں کے متعلق برطانوی حکومت کی پالیسی

27. قلات کی عملداری میں موجود سرداروں کے متعلق پالیسی کا اظہار، برطانوی حکومت کی طرف سے سندھ کے برطانوی کمشنر کے خط مورخہ یکم مئی 1869ء میں کیا گیا۔ ''جس پالیسی کے متعلق میری خواہش ہے کہ اسے اختیار کیا جائے، وہ یہ ہے کہ ہمارا دوست ملک معظم، خان ہی بلوچستان میں ایک ایسا شخص ہے جس پر ہمارا کوئی حق ہے یا جس کے ساتھ ہم کسی بھی قسم کا رابطہ یا بات چیت کر سکتے

Scanned by CamScanner

ہیں۔ مزید یہ کہ ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم اس اور اس کے معززین اور عوام کے درمیان براہ راست مداخلت کریں اور اس پالیسی پر منصفانہ اور صاف وشفاف انداز میں عمل کریں، نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے عمل سے یہ کسی بھی طرح ظاہر نہ ہو کہ ہم اس کے دشمنوں کے حمایت کے ذریعے اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔'' کمشنر نے بھی بمبئی کے گورنر کے نام اپنے خط مورخہ 5 اپریل 1872ء میں اسی بات پر زور دیا۔ اس نے کہا، ''میرے خیال کے مطابق یہ ممکن نہیں اور اس میں خفیف سا شبہ بھی نہیں کہ قلات یا بلوچستان کے متعلق کس قسم کی پالیسی اختیار کی جائے کیوں کہ اسے درست طور پر سمجھنا چاہیے۔ ملک معظم خان، اس ملک کا عملی اور قطعی حکمران ہے۔۔۔ سرداروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ خان ان کا خود مختار حکمران ہے اور اپنے مفادات کے حصول اور شکایات کے ازالے کے لیے صرف اسی کی طرف دیکھنا چاہیے۔ نیز انہیں یہ بھی محسوس کرنا چاہیے کہ ان اور خان کے مفادات میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو اور کوئی بھی چیز جس سے اس کے اختیار میں کمی واقع ہوتی ہو یا پھر اس کا انہیں ذرہ بھر بھی شائبہ ہوتا ہو، یا پھر ان کی طرف سے کسی باغیانہ رویے کو کسی بھی طرح برطانوی حکومت کی طرف سے تسلیم کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس سے قبل فریب اور دھوکے میں مبتلا ہوں لیکن انہیں بتا دینا چاہیے کہ گزشتہ باغیانہ اقدامات کی مانند ان کے کسی قدم کے باعث، ان کے لیے برطانوی حکومت کی حمایت فی الفور واپس لے لی جائے گی۔''[15]

10 فروری 1871ء کے اپنے روزنامچے میں بمبئی کے گورنر نے بھی اسی طرح واضح موقف کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا: ''اس لیے جو پالیسی ہمیں اختیار کرنی چاہیے، وہ وہی ہے جس کی سفارش سر ولیم میریویدر نے کی اور جسے پہلے ہی حکومت نے منظور کر لیا تھا کہ صرف اور صرف خان کی عملداری کو تسلیم کیا جائے اور اس کے سرداروں کو اس کی رعایا کے علاوہ کوئی حیثیت نہ دی جائے، اس کے معاملات میں ہر قسم کی مداخلت سے باز رہا جائے، کسی بھی دیگر شخص کے مطلق اختیار تسلیم کرنے سے گریز کیا جائے کیوں کہ اس کا مخالف عمل ہمارے مفاد میں ہے نہ اس ملک کے مستقبل کے مفاد میں۔''

پالیسی میں تبدیلی اور برطانوی حکومت کی براہِ راست مداخلت

28. بہر حال، بعد ازاں برطانوی حکومت نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی اور جام لسبیلہ کے ساتھ براہ راست معاہدہ کر لیا جس کے تحت حکومت کو انتظامی اختیارات کے علاوہ لسبیلہ کے سردار کے جانشین کے حقوق بھی حاصل ہو گئے۔ 1889ء میں جام علی خان کی طرف سے لسبیلہ کی حکومت سنبھالنے کے موقع

Scanned by CamScanner

پر پہلا معاہدہ عمل میں آیا۔ اس معاہدے کی رُو سے لسبیلہ کے انتظام وانصرام کے ضمن میں جام پر گورنر جنرل کے ایجنٹ کے مشورہ پر عمل کرنے کی پابندی عائد ہوگئی، نیز اسے اپنے ایک وزیر کی تعیناتی کے لیے گورنر جنرل کے ایجنٹ منظوری حاصل کرنا ہوتی۔ جام نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ملک کے رسم ورواج یا انتظامی نظام میں کسی قسم کی اہم تبدیلی گورنر جنرل کے ایجنٹ کی رضامندی کے بغیر نہیں کرے گا۔ 1896ء میں اسی قسم کا ایک اور معاہدہ میر کمال خان نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر کیا۔ 1925ء میں جو معاہدہ میر غلام محمد خان نے برطانوی حکومت کے ساتھ کیا، اس کی شرائط بھی یہی تھیں۔

29. برطانوی حکومت نے بھی خاران کے سردار کے ساتھ براہ راست تعلقات کا آغاز کر دیا اور آزاد خان کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا جس کے تحت اس نے سالانہ چھ ہزار کی وصولی کے عوض کچھ مخصوص قبائلی خدمات انجام دینے کا وعدہ کیا۔ اس کی وفات پر اس کے جانشین کے ساتھ بھی یہ معاہدہ جاری رہا۔ 1909ء میں برطانوی حکومت اور خاران کے سردار کے درمیان ایک اور معاہدہ طے پایا اور 1911ء میں اس معاہدے کی تجدید ہوئی۔

برطانوی حکومت کی طرف سے براہِ راست مداخلت کی نوعیت عارضی تھی

30. حکومت قلات کا موقف تھا کہ لسبیلہ اور خاران میں برطانوی عملداری کی اندرونی حیثیت کے قطع نظر، ان علاقوں کے متعلق خانِ قلات کے حقوق واختیارات بدستور برقرار ہیں اور ان میں کسی بھی قسم کا کوئی رخنہ واقع نہیں ہوا۔ برطانوی حکام کی اندرونی حیثیت، خانِ قلات کی واضح رضامندی کے ساتھ تھی اور اس کی بنیاد میں مہم جوئی اور انتظامی وجوہ تھی۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ، لارڈ سالسبری نے حکومت ہند کی پالیسی میں تبدیلی کے موقع پر 8 جولائی 1875ء کو گورنر جنرل اِن کونسل کے نام خط میں لکھا: ''ملکہ معظمہ کی حکومت کو قلات کے خراب حالات پر افسوس ہے اور ان کی طرف سے آپ کی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ خان کی طرف سے برطانوی حکومت کے لیے کسی بھی جارحانہ احساس کے نسبت اپنی عوام پر قابو پانے کی نااہلیت کہیں زیادہ اہم ہے۔۔۔ اگر خان کو مہیا کی جانے والی مدد واپس لے لی جائے اور اُن قبیلوں کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کر لیے جائیں تو پھر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں جن کے ساتھ برائے نام طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعی ملکہ کے زیر تسلط نہیں۔۔۔ غیر یقینی ہیں۔۔۔ کیا جن طریقوں کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے، ان کے ذریعے متوقع نتائج سامنے آنے چاہئیں۔ ملکہ معظمہ کی حکومت کو یقین ہے کہ 1854ء کے معاہدے کی رُو سے

Scanned by CamScanner

قائم ہونے والے دوستانہ تعلقات کے از سرِ نو قیام کے لیے اوّلین موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

ریاستِ قلات کا موقف

31. مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں حکومت قلات سمجھتی ہے کہ قلات کے معاملات میں برطانوی حاکمیت کی اندرونی حیثیت، عارضی نوعیت کی تھی۔ اس لیے ان کا موقف ہے کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے خاتمے کے بعد لسبیلہ اور خاران کے متعلق برطانوی حکومت کا اختیار خانِ قلات کو منتقل ہو جائے گا اور برطانوی ہند میں انتقالِ اقتدار سے قبل اس حوالے سے ایک قطعی اعلان کیا جائے گا۔

(iii) مری اور بگتی قبائل کے متعلق موقف

مری بگتی ملک

32. مری اور بگتی قبائل کے زیرِ تسلط علاقے بلوچستان کے سلیمانی سلسلے کی جنوبی سرحد پر واقع ہیں۔ شمالی حصے کے تقریباً 3200 مربع میل علاقے پر مریوں کا قبضہ ہے اور تقریباً 3800 مربع میل جنوبی حصہ، بگتیوں کے قبضے میں ہے۔

قلات اور قبیلوں کے درمیان تعلقات

33. سر رابرٹ سنڈیمن نے لکھا: ''برطانوی راج سے بہت عرصہ قبل ایک زمانے میں ہرند (ڈیرہ غازی خان کا ایک قصبہ) سے سمندر تک، تمام بلوچستان پر قلات کے نصیر احمد خان کی حکومت تھی جو ایک ایسا حکمران تھا جو اپنے انصاف اور شجاعت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس نے وسطی ایشیا سے قافلہ روٹ پر مریوں، بگتیوں اور دیگر قبیلوں کو اسی طرح نہایت ہی بہترین انداز میں رہائشی سہولیات فراہم کیں جس طرح اس نے میدانی علاقے کے عوام کو اچھے طریقے سے رکھا۔۔۔ جب 1838ء میں پہلی بار ہمارے کچھ افسران اس ریاست سے آشنا ہوئے تو اس ملک کی حکومت خان اور معززین علاقہ کی اطاعت گزار تھی۔ نیز مری، بگتی اور گورچانی قبیلے، خان کی حکومت کے محکوم تھے۔۔۔ اس دَور میں جب میں یہ سب کچھ تحریر کر رہا ہوں، مری، بگتی اور گورچانی قبیلے، سارا وان میں شامل تھے اور وہ نہ صرف ریاست کے لیے خدمات مہیا کرتے تھے بلکہ خان قلات کو خراج بھی ادا کرتے تھے۔''[16]

34. نصیر خان کی وفات کے بعد حکومت کی عملداری ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے جانشینوں کے ناقص اور کمزور راج کے دوران، مری اور بگتی قبیلوں نے اپنی سرگرمیاں پھیلا دیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہلاکت

Scanned by CamScanner

آفریں اور خونریز لڑائیوں میں بھی مصروف ہوگئے۔ 1845ء میں سرچارلس نیپیئر (Sir Charles Napier) نے بگتی قبیلے کے خلاف ایک فوجی مہم شروع کی، یہ مہم جزوی طور پر کامیاب ہوئی۔ 1847ء میں سرجان جیکب (Sir John Jacob) نے بگتی قبیلے کے کچھ افراد کو سندھ میں کاشتہ زمینوں پر آباد کیا لیکن ان میں سے اکثر جلد ہی اپنے آبائی پہاڑوں کی طرف فرار ہوگئے۔

35. 1854ء میں برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے درمیان معاہدہ طے پا جانے کے بعد دونوں قبیلوں کو خان نے اپنا محکوم بنا لیا لیکن ان کے طرزِ عمل میں کوئی بہتری رونما نہ ہوئی۔ ان قبائلی علاقوں کے حالات اس قدر خراب ہوگئے کہ 1859ء میں خانِ قلات نے ایک فوجی مہم کی قیادت کی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور ڈیرہ بگتی کے علاوہ مری قبیلہ کے مرکز کاہان پر قبضہ کرلیا گیا۔ بہرحال، اس کے نتائج زیادہ اطمینان بخش نہیں تھے، اس لیے خان کو 1862ء میں دوبارہ فوجی مہم جوئی کے لیے مجبور ہونا پڑا لیکن اس کی فوجی مہم بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئی کیوں کہ ان قبیلوں کی طرف سے حملے اور چھاپہ مار کارروائیاں بدستور جاری رہیں۔

پنجاب پالیسی

36. ''1876ء سے قبل، پنجاب کے حکام نے بگتی قبیلے کے کچھ سرداروں کو مفت زمین دینے اور سرحدی فوج میں بھرتی کرنے کے ذریعے بگتی قبیلے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بہرحال، یہ پالیسی دیگر قبائلی سرداروں کے اس حسد کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی کہ ان کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کیا گیا۔ نیز یہ پالیسی اس وجہ سے بھی ناکام رہی کیوں کہ حکومت سندھ نے اپنی سرحد پر متعین اس قبیلوں کے کچھ افراد کے ساتھ مختلف پالیسی اختیار کی تھی۔ 1867ء میں کیپٹن سنڈیمن نے اس پالیسی کو مری قبیلے تک پھیلانے کی کوشش کی جنہیں اس وقت تک برطانویوں کے ساتھ تمام دوستانہ معاہدوں سے خارج کردیا گیا تھا۔ جہاں تک پنجاب سرحدی علاقے کا تعلق ہے، وہاں کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن ان قبیلوں نے سندھ کی سرحد پر حملے اور چھاپوں کا سلسلہ جاری رکھا۔''[17]

پنجاب پالیسی کی توسیع

37. 1870ء میں نہایت ہی خراب حالات کے سبب، مری اور بگتی قبائل کے متعلق آئندہ مناسب بندوبست کا سوال برطانوی حکومت کے زیرِغور آیا۔ اس ضمن میں سندھ کے کمشنر نے درج ذیل تجاویز پیش کیں: ''میری تجویز یہ ہے کہ وہ منصوبہ جو پنجاب کی سرحد پر کامیاب ہو، اسی پر ہی عمل درآمد کرنا

Scanned by CamScanner

چاہیے، یعنی مری اور بگتی قبیلوں کے کچھ مرکزی سرداروں اور خاص ارکان کو تنخواہوں پر بھرتی کر لینا چاہیے۔ بہرحال، یہ پالیسی خان کے نام پر اختیار کرنی چاہیے اور جو بھی رقم ان قبیلوں کو دینی مقصود ہو، وہ خان کے اہلکاروں کے ذریعے تقسیم ہونی چاہیے۔[18] یہ تجویز قبول کر لی گئی اور حکومت بمبئی کے سیکریٹری نے سندھ کے کمشنر کو درج ذیل خط لکھا: ''ہز ایکسی لینس اِن کونسل پہلے ہی اپنی اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ان قبائل، جنہیں خان کا محکوم سمجھا جاتا ہے، انہیں دی جانے والی رقم خان کے نام پر دی جائے۔ جن خدمات کے لیے انہیں بھرتی کیا گیا ہے، وہ قلات کے علاقے پر مشتمل ہیں۔ اور جب کہ، ایک طرف اس ادائیگی کے باعث حکومت کو کچھ خاص فائدہ پہنچنے کی توقع نہیں لیکن دوسری طرف اگر ان قبائل کو اس ادائیگی کے ذریعے عملی طور پر خان کی وفاداری کی طرف راغب کیا جائے تو خان کی عملداری کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔ براہ راست ادائیگی کے باعث یہ پالیسی مفید ثابت نہ ہوگی جو کئی برس سے جاری ہے جس کے تحت ان قبائل کو خان کے محکوم سمجھا گیا۔''[19]

قلات دربار 1876ء

38. بہرحال، خان کے خلاف 1871ء کی بغاوت اور اس کے باعث ہونے والے خراب حالات کے باعث یہ طریقے اختیار نہ کیے جا سکے۔ اس لیے پنجاب اور سندھ سے انتظام کاری کے دہرے نظام کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قبیلوں کے طرزِ عمل کا اجتماعی لحاظ سے جائزہ لیا گیا اور سندھ کے کمشنر کے تحت ڈیرہ غازی خان کے کمشنر کو مری اور بگتی قبائل کے ساتھ ابلاغی رابطہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ نومبر 1875ء میں کیپٹن سنڈیمن کو پہاڑوں میں تعینات کیا گیا تا کہ قبائلی تنازعات کا کوئی قابل قبول اور متفقہ حل تلاش کیا جا سکے۔ وہ اپنی اس کوشش میں اس طرح کامیاب ہوا کہ مری اور بگتی قبیلوں کے سردار اس کے ساتھ خان کے دربار میں جانے کے لیے تیار ہو گئے جس کا انعقاد 4 جنوری 1876ء کو طے پایا تھا۔ اس موقع پر کیپٹن سنڈیمن نے سرداروں کو بتایا کہ یہ دن بہت ہی خوش قسمت ہے جب قلات کے بہت سے سردار اس ملک کے حکمران کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ مری قبیلے کے سرداروں کی حیثیت کے متعلق خان نے جو کچھ کہا، وہ درج ذیل ہے: ''زمانۂ قدیم سے ہی تم میری رعایا ہو اور ایک زمانے میں تم حکومت قلات سے وفادار اور مخلص تھے۔ جب سے تم نے لوٹ مار اور غارت گری شروع کی، مجھے تم لٹیروں اور غارت گروں کا محض ایک گروہ ہی نظر آئے لیکن اس کے بعد تم نے فوجیوں پر حملہ کیا، انہیں ہلاک کیا اور میری بندوقوں پر قبضہ کر لیا۔۔۔ اس وقت سے ہی تم میری نظر میں بے وفا اور

Scanned by CamScanner

غدار ٹھہرے۔۔۔ جب شاہ نواز خان نے میرے باپ، میر مہراب خان کی مخالفت کی، مری سردار دین محمد اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور اچھی خدمات بجالائیں، اور اس کے عوض، میرے باپ میر مہراب خان نے اسے ٹونا کی جاگیر عطا کی۔ اس کے برے طرزِ عمل کے باعث میں نے یہ جاگیر ضبط کر لی لیکن اگر تم، مری قبیلے کے لوگو، آئندہ اپنے برے طرزِ عمل سے باز آ جاؤ اور اپنا رویہ درست کر لو تو پھر ٹونا کی جاگیر تمہیں واپس کر دی جائے گی۔"[20]

39. بہر حال، دربار میں ان سرداروں کی حاضری کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوئی کیوں کہ ان کی طرف سے حملے اور چھاپہ مار کارروائیاں مسلسل جاری رہیں۔ اس لیے کیپٹن سنڈیمن نے 1876ء میں ایک دوسرا مشن قلات روانہ کیا جس کے ذریعے معاہدۂ جیکب آباد طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت خان اور اس کے باغی سرداروں کے درمیان مصالحت ہو گئی۔ اس معاہدے کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ 1875ء سے ادا کی جانے والے امدادی رقم جاری کر دی جائے گی اور ان سرداروں سے خان کے علاوہ معاملات طے کیے جائیں گے۔

خانِ قلات کی عملداری کے اعترافات

40. حکومت قلات کا موقف ہے کہ مری اور بگٹی قبیلے ہمیشہ سے ہی اور آج بھی خانِ قلات کی رعایا ہیں اور ان کے مقبوضہ علاقے ریاست قلات کا حصہ ہیں۔ اس حیثیت کو برطانوی حکومت مسلسل تسلیم کرتی رہی ہے۔ اپنے روزنامچے مورخہ 10 فروری 1871ء میں بمبئی کے گورنر نے یوں اعلان کیا: "یہ امر واضح، نہایت ہی واضح ہے اور اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم خانِ قلات کو ایک آزاد اور خودمختار حکمران تسلیم کرتے ہیں جس کے ساتھ ہمارے حلیفانہ معاہدے ہیں لیکن ہم اسے دوستانہ مشورہ دینے کے سوا اس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے سرداروں کے ساتھ معاملات کے ضمن میں ہمیں غیر جانب دار رویہ اپنانا چاہیے لیکن ملا محمد کے معاملے میں جس نے خان کی خودمختاری کے خلاف بغاوتیں کیں اور اس کی معتدل شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تاکہ اسے معاف کر دیا جائے اور اس کی موروثی جاگیر اسے واپس کی جائے، ہمیں خان کے فیصلے سے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"[21]

سندھ کے برطانوی کمشنر، سر ولیم میریویدر کا بھی یہی موقف تھا۔ بالائی سندھ کے سرحدی پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ کے نام ایک خط میں سر ولیم میریویدر نے اگست 1881ء میں لکھا: "یہ امر کہیں زیادہ

Scanned by CamScanner

درست ہوتا اور برطانوی حکومت اور ملک معظم خانِ قلات کے درمیان موجود تعلقات کے کہیں زیادہ مطابق ہوتا، اگر کیپٹن سنڈیمن یہی کلمات خرم خان کے سامنے کہتے۔ کیوں کہ یہ لازمی طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو کچھ بھی شکایتیں مری قبیلے کو ہیں، وہ ملک معظم خان کی رعایا ہیں، اور یہ اس پالیسی کے مطابق نہیں جس کی منظوری حکومت نے دی تھی اور نہ ہی اس کے ساتھ منصفانہ رویہ ہے جس کے ساتھ ہمارا اتحاد ہے بلکہ یہ اس حکمران کے خلاف کھلی مخالفت ہے اور اس کی عملداری میں واضح اور صاف مداخلت ہے اور اخلاقی طور پر سخت ناپسندیدہ ہے۔''

اس نے اپنے انہی خیالات کا اظہار اپنے میمورنڈم مورخہ 9 مئی 1872ء میں کیا: ''اگر سندھ کی سرحد کے ساتھ ملحق ملک میں امن وامان مطلوب ہے تو وہاں ایک مستقل حکومت اور ذمہ دار حکمران ہونا چاہیے۔ اگر سرداروں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان کی حمایت کی گئی تو یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ حال ہی میں وہ اپنی خودمختاری کے قیام کے لیے مزاحمت کر رہے تھے اور اس کوشش میں خود کو درست ثابت کر رہے تھے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ہماری یہ سچی اور مخلصانہ پالیسی ہونی چاہیے کہ ملک معظم، خانِ قلات کی عملداری کو تقویت دیں اور سرداروں کی طرف سے اس کی عملداری کو نقصان پہنچانے کی کوششوں کی حمایت نہ کریں۔ یہ سب کچھ موخرالذکر کو نہایت ہی واضح انداز میں سمجھ لینا چاہیے اور وہ خان کی حمایت کرنے کو اپنے بہترین مفاد میں پائیں گے۔ نیز چاہیے کہ اپنے مفاد کی خاطر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''[22]

حکومت ہند کے نام ایک اور مراسلے میں اس نے یہ موقف زیادہ پُرزور انداز میں یوں بیان کیا: ''جو پالیسی شروع ہی سے امورِ قلات کے متعلق اختیار کی گئی ہے، یہ تھی کہ اس کی حکومت میں براہ راست مداخلت سے ہر ممکن احتراز کیا جائے۔ ملک معظم، خان میر خداداد خان، ملک کا عملی حکمران ہے اور ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اسے بتائیں کہ اسے اپنے سرداروں اور رعایا کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ جب تک وہ اپنی حکومت اور ملکہ کے درمیان ہندوستان میں اپنے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور جب تک ہماری سرزمین پر کوئی جارحیت نہیں کی جاتی یا اس کے عوام ہماری سرزمین میں کوئی یورش نہیں بپا کرتے، ہمیں اس کے حق حکمرانی کا احترام کرنا ہوگا۔''[23]

اسی موقف کو حکومت ہند نے بھی اپنایا: ''ہز ایکسی لینس اِن کونسل کی خواہش ہے کہ خان کی سرزمین کے طول وعرض میں اس کی حکمرانی نہایت شدومد سے قائم رہے؛ یہ بھی کہ برطانوی حکومت یہ

صورتِ حال برقرار رکھنے کے لیے اسے اپنی مشاورت سے بھی نوازے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے تمام قانونی اقدامات کی حمایت کرے گی۔ مزید برآں برطانوی حکومت کسی بھی ایسے شخص یا سرداروں کی حمایت نہیں کرے گی جو اس کے خلاف بغاوت میں ملوث ہوں گے یا اس کی جائز عملداری کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ سرداروں سے بھی ان اور ان کی عوام کے بہترین مفاد میں مشاورت کی جائے گی اور تاجروں کی حفاظت کے علاوہ ڈکیتی اور پُرتشدد کارروائیوں کے سدباب کے ذریعے امن وامان قائم کرنے میں ان کی معاونت کی جائے گی۔''[24]

اسی موقف کو بذاتِ خود قبیلوں نے بھی بارہا تسلیم کیا۔ مثال کے طور پر، مری قبیلوں کے سردار نے کیپٹن سنڈیمن کے روبرو 1872ء میں درج ذیل بیان دیا: ''میری حکومت سے درخواست ہے کہ مجھ سے وہ مطالبہ نہ کیا جائے جو میرے لیے ناممکن ہو۔ مجھ میں تن تنہا شیر دل اور خوٹ منڈائی مریوں سے نمٹنے کی اہلیت موجود نہیں جس کی وجہ میں بیان کر دیتا ہوں۔ خوٹ منڈائی مری پر اس سے پہلے کڑی نظر رکھی جاتی تھی لیکن اس وقت مری تمنداروں کو خان کی حکومت کی معاونت حاصل تھی، اور قبیلے کا ایک سردار، منڈائی میں رہائش پذیر تھا جس کی ذمہ داری یہ تھی خان کے نام پر ملک کی حفاظت کی جائے۔ مثال کے طور پر اپنے عم زاد گمن خان کا نام ایسے شخص کے طور پر لے سکتا ہوں جس نے اس طرح خان کی مدد کی۔ خان نے مری قبیلے کے سرداروں کے لیے سالانہ 12,000 روپے کا وظیفہ مقرر کیا تاکہ وہ قبیلے میں اپنی حیثیت کے مطابق چھوٹے سردار بھرتی کر سکیں جو قبیلے میں امن وامان برقرار رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ قبیلے کے سرداروں کو خان کی طرف سے ٹونا نامی گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔ یہ تمام انتظامات خان کے نام پر کیے گئے اور ان کا اہتمام نہایت ہی مناسب انداز میں ہوا کیوں کہ وہ ملک کا حکمران ہے۔''

قلات کا موقف

41. اوپر بیان کیے گئے حالات کی روشنی میں حکومت قلات کا دعویٰ ہوگا کہ ہندوستان میں برطانوی عملداری کے خاتمے کے بعد مری اور بگتی قبائل کے ضمن میں جو اختیار برطانوی حکومت کو حاصل تھا، خانِ قلات کو منتقل ہو جانا چاہیے۔ نیز یہ بھی کہ ان قبائل کے مقبوضہ علاقے بلاشک وشبہ خان کی عملداری میں ہونے چاہئیں۔

ضمیمہ A

برطانوی حکومت اور قلات کے سردار، نصیر خان کے درمیان طے پانے والے معاہدے پر

برطانوی حکومت کی طرف سے میجر جان جیکب نے دستخط کیے جس کے لیے اسے ہندوستان کے گورنر جنرل مارکوئیس آف ڈلہوزی، کی طرف سے مکمل اختیارات دیئے گئے تھے۔ یہ معاہدہ گورنر جنرل آف انڈیا مارکوئیس آف ڈلہوزی اور قلات کے سردار کے درمیان 1854ء میں طے پایا۔

جیسا کہ نئے حالات کا تقاضا تھا کہ برطانوی حکومت اور قلات کے سردار میر نصیر خان کے درمیان ایک نیا معاہدہ کیا جائے، اس ضمن میں مذکورہ حکومت اور ملک معظم کے درمیان مندرجہ ذیل شقوں پر اتفاق طے پایا۔

شق 1: 6 اکتوبر 1841ء کو برطانوی حکومت اور قلات کے حکمران میر نصیر خان کے درمیان طے پانے والا معاہدہ جس پر میجر اوترم نے دستخط کیے، منسوخ کیا جاتا ہے۔

شق 2: برطانوی حکومت اور قلات کے سردار، میر نصیر خان، اس کے ورثا اور جانشینوں کے درمیان ہمیشہ دوستانہ تعلقات قائم رہیں گے۔

شق 3: میر نصیر خان، خود، اس کے وارث اور جانشین عہد کرتے ہیں کہ برطانوی حکومت کے دشمنوں کی زیادہ سے زیادہ مخالفت کریں گے اور تمام معاملات میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے اور اس کی رضامندی کے بغیر کسی دوسری حکومت سے مذاکرات نہیں کریں گے لیکن دوسری ہمسایہ حکومتوں کے ساتھ معمول کے دوستانہ تعلقات جاری رہیں گے۔

شق 4: اگر قلات کی سرزمین پر برطانوی فوجیوں کا قیام ضروری ہوا تو پھر برطانوی حکام کے تجویز کردہ مقام پر انہیں ٹھہرایا جائے گا۔

شق 5: میر نصیر خان، خود، اس کے ورثا اور جانشین عہد کرتے ہیں کہ برطانوی علاقے کے قریب یا اس کے اندر اس کی رعایا کی طرف سے کسی لوٹ مار یا غارت گری کا سدباب کریں گے، برطانوی حکومت اور افغانستان کے درمیان تجارتی راستے کی حفاظت کریں گے خواہ یہ راستہ سندھ کا ہو یا پھر سونمیانی کی بندرگاہ ہو، یا پھر مکران کی بندرگاہیں ہوں۔ نیز برطانوی حکومت اور میر نصیر خان کے درمیان طے شدہ محصول سے زائد ادائیگی نہیں کی جائے گی اور یہ رقم اس معاہدے کے ساتھ لف گوشوارے میں درج کی جائے گی۔

شق 6: ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے میر نصیر خان، اس کے وارثین اور جانشینوں کو سال بہ سال اطاعت گزاری پر مشتمل کارکردگی کی شرط پر برطانوی حکومت سالانہ 50,000 روپے ادا کرنے کا

Scanned by CamScanner

عہد کرتی ہے۔

شق 7: اگر کسی سال کے دوران، میر نصیر خان، اس کے وارثین اور جانشینوں کی طرف سے مندرجہ بالا شرائط بخوبی پوری نہیں کی گئیں تو پھر برطانوی حکومت کی طرف سے 50,000 روپے کی رقم انہیں ادا نہیں کی جائے گی۔

ضمیمہ B

برطانوی حکومت اور ریاستِ قلات کے درمیان معاہدہ 1876ء جب کہ برطانوی حکومت اور نصیر خان، خانِ قلات کے درمیان 1854ء کے معاہدے کی تجدید کی ضرورت ہے۔ لہٰذا دونوں حکومتوں کے درمیان دوستی اور اخلاص کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے اس معاہدے میں برطانوی حکومت کی طرف سے عالی جناب ایڈورڈ رابرٹ بلورلٹن، بیرن لٹن آف نیبورتھ (انگلستان کی کاؤنٹی ہرٹفورڈ میں)، ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل، نیز Grand Master of the Most Exalted Order of the Star of India ایک طرف اور دوسری طرف قلات کے حکمران، ملک معظم میر خداداد خان کے درمیان درج ذیل شقیں باہمی رضامندی سے شامل کی گئی ہیں۔

شق 1: برطانوی حکومت اور خانِ قلات، میر نصیر خان کے درمیان 14 مئی 1854ء کو طے پانے والے معاہدے کی تجدید اور توثیق کی جاتی ہے۔

شق 2: برطانوی حکومت اور میر خداداد خان، خانِ قلات، اس کے وارثین اور جانشینوں کے درمیان دوستی بدستور جاری رہے گی۔

شق 3: جب کہ میر خداداد خان، خانِ قلات، اس کے وارثین، اس کے جانشین اور اس کے سردار عہد کرتے ہیں کہ وہ معاہدہ 1854ء کی تیسری شق کی دفعات کی بخوبی پابندی کریں گے اور برطانوی حکومت اپنی طرف سے خان کی آزادی اور خودمختاری کا احترام کرے گی اور اس کی عملداری کو برقرار رکھنے اور بیرونی حملے سے اس کے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے بہ وقت ضرورت اس کی مدد کے لیے اپنی مرضی کے مطابق مناسب ذرائع کرے گی۔

شق 4: دونوں حکومتوں کے درمیان دوستی کو مضبوط کرنے اور اس کی تجدید کرنے کے لیے باہمی اتفاق کیا گیا ہے کہ ایک طرف مناسب حفاظتی دستوں کی معیت میں برطانوی ایجنٹوں کو برطانوی حکومت کی طرف سے اختیار کے تحت خان کے دربار اور اس کے علاقے میں کہیں بھی، قیام کرنے کو کہا

Scanned by CamScanner

جائے گا، اور دوسری طرف ملک معظم کی طرف سے اختیار شدہ ایک مناسب نمائندے کو حکومت ہند میں تعینات کیا جائے گا۔

شق 5: خان اور خان کے سرداروں کے درمیان کوئی بھی جھگڑا اور اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ملک معظم کے دربار میں موجود برطانوی ایجنٹ ان کے درمیان ایک قابل عمل اور دوستانہ معاہدہ کروانے کے لیے اپنے منصب اور عہدے کا استعمال کرے گا جس میں ناکامی کی صورت میں معاملہ برطانوی حکومت کی رضامندی سے ثالثی کے لیے اس کے سامنے پیش کیا جائے گا اور فیصلہ خوش دلی سے قبول کیا جائے گا۔

شق 6: جب کہ خانِ قلات نے اپنی اور اپنے سرداروں کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اس ملک سے برطانوی فوجیوں کو واپس بلایا جائے، نیز برطانوی حکومت، معاہدہ 1854ء کی چوتھی شق کے مطابق اور دونوں ممالک کے درمیان موجود مخلصانہ اور گہرے تعلقات کے اعتراف میں ملک معظم کی خواہش کا احترام اس شرط پر کرتی ہے کہ فوجی اس حیثیت سے تعینات کیے جائیں گے جہاں ضروری سمجھا جائے اور حکومت کی رضامندی سے واپس بلا لیے جائیں گے۔

شق 7: اس امر پر بھی باہمی رضامندی ظاہر کی گئی ہے کہ ٹیلی گراف یا ریلوے لائن بچھانے کے لیے جو دونوں ممالک کے مفاد میں ہو، خان کے علاقے میں گاہے گاہے اس شرط پر تعمیر کی جائیں گی کہ اس تعمیر کی شرائط حکومت اور ملک معظم کی حکومت کے درمیان گزشتہ معاہدے کے مطابق ہوں گی۔

شق 8: ریاست قلات اور برطانوی حکومت کے درمیان علاقے میں ان شرائط پر مکمل طور پر تجارت کی آزادی ہوگی جو کسی بھی وقت قلات کے خان کی رضامندی سے مالی مفادات کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھی جائیں۔

شق 9: 1854ء کے معاہدے کے تحت عائد کی گئی ذمہ داریاں بخوبی طور پر ادا کرنے میں میر خداداد خان، اس کے وارثین اور اس کے جانشینوں کی مدد کے لیے برطانوی حکومت، خان، اس کے وارثین اور اس کے جانشینوں کو اس وقت تک سالانہ ایک لاکھ روپے کی رقم ادا کرے گی جب تک وہ نہایت ایمان داری سے اس معاہدے پر عمل کرتے رہیں گے۔

شق 10: برطانوی حکومت نے مزید عہد کیا ہے کہ ملک معظم کے علاقوں میں اس شرط پر چوکیاں اور ذرائع نقل و حمل تعمیر کرنے کے لیے بیس ہزار کی رقم دے گی کہ خان، برطانوی حکومت کی منظوری سے اس رقم کو خرچ کرے گا۔

Scanned by CamScanner

(ماخذ: میر احمد یار، خانِ قلات، IOR: L-P+S.13/1847)

(III) کوئٹہ، نوشکی اور نصیر آباد کی واپسی کے لیے میمورنڈم

(جسے سر سلطان احمد نے تیار کیا اور ایم اے جناح نے 1946ء میں کیبنٹ مشن کو پیش کیا)

1883ء کا معاہدہ کوئٹہ (ضمیمہ A)

1876ء کے معاہدے کی چھٹی شق یوں ہے: ''جب کہ خانِ قلات نے اپنی اور اپنے سرداروں کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اس ملک سے برطانوی فوجیوں کو واپس بلایا جائے، نیز برطانوی حکومت، 1854ء کی چوتھی شق کے مطابق اور دونوں ممالک کے درمیان موجود مخلصانہ اور گہرے تعلقات کے اعتراف میں ملک معظم کی خواہش کا احترام اس شرط پر کرتی ہے کہ فوجی اس حیثیت سے تعینات کیے جائیں گے جہاں ضروری سمجھا جائے اور حکومت کی رضامندی سے واپس بلا لیے جائیں گے۔'' اس شق کے تحت معاملات طے کرنے کے حوالے سے گورنر جنرل ان کونسل نے وزیر خارجہ برائے ہند کے نام 20 مارچ 1877ء کو یوں لکھا: ''اس شق کے متعلق اگر ہمارے سامنے خواہ یہ ہوتا کہ خان، اس کے سرداروں اور اس کے قبیلوں کی خواہش کے مطابق خان کی ریاست میں برطانوی فوجی تعینات کیے جائیں، تو ہم اس قدم سے رضامندی ظاہر کرنے سے قبل ہچکچاتے۔ لیکن برطانوی حکومت کے فوجی پہلے ہی قلات میں موجود تھے جہاں ان کی موجودگی کو اس ملک کے عوام نے نہایت خوش دلی سے قبول کیا۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس اقدام کو عملی شکل دی جائے جس کا اہتمام 1854ء کے معاہدے کے تحت کیا گیا ہے اور یہ اس معاہدے کی شقوں اور مقاصد کے عین مطابق ہے۔'' اس لیے برطانوی حکومت نے فوجی اور سیاسی، دونوں وجوہ کی بنا پر فوجیوں کو واپس بلانے کے ضمن میں صدر دفتر کے طور پر قلات کی بجائے ترجیحاً کوئٹہ کا انتخاب کیا۔ 1879ء میں اس امر پر رضامندی ظاہر کی گئی کہ کوئٹہ کی نیابت اور انتظامیہ کا انصرام وانتظام برطانوی حکومت کی طرف سے کچھ شرائط اور کچھ وقت کے لیے کیا جانا چاہیے، نیز فالتو آمدن کو خان کے حوالے کر دینا چاہیے۔ بہر حال، اس کی بجائے ایک دوسرا معاہدہ کیا گیا جو 1883ء کو خان اور برطانوی حکومت کے درمیان طے پایا، نیز موجودہ انتظامات اس معاہدے کے ذریعے انجام دینے چاہئیں تھے جس کے تحت

خانِ قلات نے برطانوی حکومت کو یہ ذمہ داری تفویض کر دی کہ ''ضلع کوئٹہ کی تمام تر انتظام کاری اور قطعی نیابت اور تمام حقوق اور مراعات کے علاوہ تمام آمدن، دیوانی اور فوجداری عملداری اور انتظام کاری کے تمام دیگر اختیارات، اس واضح شرط پر عمل میں لائے جائیں گے کہ ضلع اور نیابت کا انتظام، برطانوی حکومت کی طرف سے اس یا ان افسران کے ذریعے کیا جائے کہ جسے گورنر جنرل، اس مقصد کے لیے مقرر کرے۔ برطانوی حکومت نے خان کو 25,000 روپے مقرر شدہ سالانہ کرایہ دینا منظور کر لیا، جس طرح اس نے کہا، ضلع اور نیابت کا انتظام برطانوی حکومت کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت، خان نے برطانوی حکومت کو مکمل دیوانی اور فوجداری عملداری دینے کے علاوہ، درۂ بولان کی حدود میں انتظامی اختیارات دینے پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ اس کے علاوہ خان نے اس امر پر بھی رضامندی ظاہر کی کہ بولان سے برطانوی ہند اور افغانستان کے علاوہ کچھی اور خورستان کے درمیان، یا دیگر تجارتی راستوں کا محصول بھی برطانوی حکومت کو دیا جائے، یا برطانوی حکومت اور ضلع سبی، کوئٹہ اور پشین کے درمیان تجارتی سفر کے سلسلے میں محصول برطانویوں کو دیا جائے۔ اس کے عوض، برطانوی حکومت نے کسی منہائی کے بغیر خان کو سالانہ 30,000 کی رقم دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

معاہدۂ نوشکی 1899ء (ضمیمہ B)

2. 1899ء میں خان کے ساتھ ایسا ہی ایک معاہدے طے کیا گیا جس کی رُو سے خان نے برطانوی حکومت کو نوشکی ضلع اور نیابت کے تمام تر انتظام اور تمام حقوق و مراعات، ریاستی یا ذاتی، اس کے علاوہ خاص طور پر آمدن، دیوانی یا فوجداری عملداری میں، اس کے علاوہ محصول وصول کرنے کا تمام تر اختیار اس واضح شرط پر تفویض کر دیا کہ نوشکی کی نیابت برطانوی حکومت کی طرف سے ایک ایسے افسر یا افسران کے ذریعے انجام دی جائے گی جنہیں گورنر جنرل اِن کونسل، اس مقصد کے لیے مقرر کرے۔ برطانوی حکومت نے اپنی طرف سے خان کو کسی منہائی کے بغیر سالانہ انتظام کاری کی لاگت کے طور پر 9000 روپے سالانہ کرایہ دینے کا بھی وعدہ کیا۔

معاہدۂ نصیر آباد 1903ء (ضمیمہ C)

3. 1903ء میں برطانوی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے خان نے برطانوی حکومت کو نصیر آباد ضلع اور نیابت کے تمام تر انتظام اور تمام حقوق و مراعات، ریاستی یا ذاتی، اس کے علاوہ خاص طور پر آمدن، دیوانی یا فوجداری عملداری میں، اس کے علاوہ محصول وصول کرنے کا تمام تر اختیار

Scanned by CamScanner

اس واضح شرط پر تفویض کر دیا کہ نوشکی کی نیابت برطانوی حکومت کی طرف سے ایک ایسے افسر یا افسران کے ذریعے انجام دی جائے گی جنہیں گورنر جنرل ان کونسل، اس مقصد کے لیے مقرر کرے۔ برطانوی حکومت نے اپنی طرف سے خان کو کسی منہائی کے بغیر سالانہ انتظام کاری کی لاگت کے طور پر 15,000 روپے سالانہ کرایہ دینے کا بھی وعدہ کیا۔ معاہدے میں مذکور زمینوں کا ایک حصہ بھی انہی شرائط پر ایک مقرر شدہ 2500 روپے سالانہ کرایہ پر برطانوی حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔ مزید برآں، خان، لہری بھیگ اور گنڈاوا جیتیابیٹ کے علاقے لیز پر برطانوی حکومت کے حوالے کر دیں جو بعد میں موجودہ برطانوی نہروں کے ذریعے سیراب کی جائیں جس کے لیے برائے نام کرایہ دیا جائے۔

معاہدوں کی نوعیت اور اثرات

4. اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے کسی بھی معاہدہ کی نوعیت لیز کی نہیں ہے بلکہ ان تمام معاہدوں کے ذریعے مذکورہ اضلاع اور نیابتوں کا مکمل انتظام تمام تر اختیارات کے ساتھ برطانوی حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔ اس لیے "حکومت کے اختیارات" تفویض کیے گئے۔ بلاشبہ، یہ درست ہے کہ لفظ "کرایہ"، ان تمام معاہدوں میں استعمال کیا گیا لیکن یہ رضامندی کے مفہوم کو تبدیل نہیں کرتا۔ درحقیقت، معاہدۂ کوئٹہ میں "کرایہ" کی اصطلاح کو سالانہ خالص خالصہ آمدن کے مفہوم میں لیا گیا ہے۔ معاہدۂ نوشکی میں بھی اسی قسم کا بیان موجود ہے۔ لیز کا سوال صرف منجوتی زمینوں اور لہری بھیگ اور گنڈاوا نابیٹ کے متعلق ہی ہے، ان تمام علاقوں کے متعلق برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے درمیان انتظامی نوعیت تمام معاہدات خاص مقاصد کے لیے تھے اور درج ذیل اثرات ناگزیر طور پر سامنے آئے۔

(i) خانِ قلات کی خودمختاری برقرار رہے گی؛

(ii) معاہدوں میں شامل علاقے، ریاست قلات کا بدستور حصہ رہیں گے؛

(iii) تمام انتظامی اختیارات برطانوی حکومت کو تفویض کیے گئے ہیں؛ اور

(iv) علاقوں پر برطانوی حکومت عملاً قابض رہے گی۔

اس لیے یہ تمام معاہدات، ان معاہدات جیسے معلوم ہوتے ہیں جنہیں بین الاقوامی استعمال کے لیے منظور کیا جاتا ہے جب کہ ایک ریاست عملی طور پر خودمختار ہوتی ہے اور قانونی طور پر بھی خودمختاری دوسری ریاست کو بھی تفویض ہوتی ہے۔ جس طرح اوپنہیم (Oppenheim) بتاتا ہے کہ یہ معاملہ ایک غیر ملکی طاقت کی طرف سے مالک ریاست کی رضامندی سے ایک علاقے کے امن وامان کا

انتظام کرنے کا ہے۔ اس لیے 1878ء میں قبرص کی سرزمین پر برطانیہ نے قبضہ کرنے کے علاوہ اس کا انتظام بھی سنبھال لیا لیکن اس کے لیے سلطان کے لیے متعدد مراعات بھی مقرر کی گئیں یعنی خالص آمدن سے 92000 پاؤنڈ اور ترکی کی رسمی خودمختاری۔ دوبارہ 1878ء کے بعد بوسنیا ہرزیگوینا کے ترکی صوبے کچھ عرصے کے لیے آسٹریا ہنگری کے زیر قبضہ اور زیر انتظام، ترکی کی خودمختاری کی شرط پر رہے۔ اوپنہم کا موقف ہے کہ ان تمام معاملات میں علاقوں کا دوسری حکومتوں کو حوالے کرنے پر رضامندی تمام عملی مقاصد کے لیے انجام پاتا ہے حالاں کہ قانون کے مطابق ان کا تعلق سابقہ مالک ریاست سے تھا۔ بہرحال، اس نے لیز شدہ علاقوں کے معاملات سے ان معاملات کو علیحدہ کر دیا جہاں مختلف علاقوں کو لیز پر دیا یا پھر مالک ریاست نے اپنے علاقے غیر ملکی طاقت کے پاس رہن رکھ دیئے۔[25] وزیر خارجہ بمقابل سردار رستم خان (1941 A.C.372) میں، پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کا موقف یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاہدۂ نصیر آباد اپنی نوعیت کے اعتبار سے لیز معلوم ہوتا ہے۔ عدالت کا فیصلہ دیتے ہوئے لارڈ ایٹکن (Lord Atkin) نے کہا، "اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس معاہدہ کا اس لحاظ سے جائزہ لیا جائے کہ اس کی قانونی حیثیت کیا تھی۔ مدعی کے مطابق، یہ محض ان کے وکیل کی طرف سے "تجارتی معاہدہ" کے طور پر اختیار کیا گیا جس کا محض مقصد یہ تھا کہ باسہولت طریقے کے ذریعے آمدن کو اکٹھا کیا جائے اور اس مقصد کے لیے اختیارات دیئے جائیں۔ لیکن معزز جج اس موقف سے متفق نہیں۔ اس طرح دستاویز کے سادہ الفاظ اور واضح تعمیر کی مخالفت کی گئی جب معاہدہ کو مجموعی طور پر لیا گیا۔ "نوشکی ضلع اور نیابت کے تمام تر انتظام اور تمام حقوق و مراعات، ریاستی یا ذاتی، اس کے علاوہ خاص طور پر آمدن، دیوانی یا فوجداری عملداری میں، اس کے علاوہ انتظام کاری کے تمام اختیارات" وہ الفاظ ہیں جو دو خودمختار ریاستوں کے درمیان حقوق تخلیق کر رہے ہیں جو ابھی تک کسی بھی تجارتی معاہدے میں نہیں پائے گئے۔ یہ درست ہے کہ حقوق کی دستبرداری ہی تمام تر "انتظام کاری" ہے اور اس کا معاوضہ سالانہ کرایہ ہے جو معاہدہ کے چوتھے پیرا میں واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ سودا، دراصل ایک مقررہ کرایہ پر مستقبل بنیادوں پر لیز ہے۔ بہرحال، قلات کی خودمختاری کے ذریعے برطانوی حکومت کو اس کے تمام حقوق دے دیئے حالاں کہ جس طرح حقوق کی دستبرداری لیز کی شکل اختیار کر لیتی ہے، ایسی حیثیت اختیار نہیں کرتا کہ برطانوی عملداری کا حصہ کر سکے، لیکن بدستور قلات کا علاقہ ہی برقرار رہتا ہے۔ اس لیے حکومت اس امر کی حق دار ہے کہ بہ وقت ضرورت Foreign Jurisdiction Act 1890 کی شقوں پر انحصار کیا جائے۔" یہ

Scanned by CamScanner

ملکہ معظمہ کے لیے قانونی ہے اور ہوگا کہ کسی بھی عملداری کو اپنایا جائے اور جو ملکہ معظمہ کو کسی بھی غیر ملک میں عین اسی طرح حاصل ہیں جس طرح ملکہ معظمہ نے علاقے کے الحاق یا فتح ہونے کے ذریعے عملداری کے حقوق حاصل کیے۔ یہ فیصلہ خاص طور پر معاہدے کے چوتھے پیرا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ پیرا بلاشبہ، چند مخصوص علاقوں کی لیز کے متعلق ہے لیکن اس کا تعلق انتظام کاری کے اختیارات سے نہیں ہے۔ بہرحال، معاہدہ کی کوئی بھی نوعیت ہو، نتیجہ وہی رہتا ہے۔ یہ تمام معاہدے، خواہ انہیں لیز سمجھا جاتا ہو یا نہ ہو، برطانوی حکومت کے لیے ذاتی نوعیت کے تھے۔ اسے بذاتِ خود معاہدوں میں ہی ایک مخصوص دفعہ کے ذریعے واضح کیا گیا ہے کہ متذکرہ علاقوں میں انتظام کاری سے ایک مخصوص شرط پر دستبرداری اختیار کی گئی کہ اس قسم کا انتظام برطانوی حکومت کی طرف سے ہوگا۔ اس لیے بعد میں آنے والی کوئی بھی حکومت یا برطانوی ہند میں حکومت، ان معاہدوں کے ذریعے پیدا ہونے حقوق و فرائض کو منسوخ کرنے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ جس طرح ہال (Hall) کہتا ہے: ''ریاست کی شخصیت کی حقیقت جواب تلاش کرنے کی کنجی ہے۔ جو حقوق حاصل کیے گئے ہیں، ان کے ساتھ اور فرائض جن کے متعلق سابقہ ریاست بطور حقوق و فرائض معاہدہ کیا گیا ہے، نئی ریاست کے کسی کام کے نہیں۔[26] اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے انتظام وانصرام ختم ہو جاتا ہے، معاہدوں کی قابل عمل حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور برطانوی حکومت کو دیئے گئے تمام حقوق و فرائض خانِ قلات کو واپس منتقل ہو جاتے ہیں۔

ضروری ملکیتوں کی واپسی اور حوالگی

5. مندرجہ ذیل بیان کی گئی وجوہ کے لحاظ سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خاتمے پر ان علاقوں کے متعلق خان کے حقوق کی واپسی کے متعلق سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ بہرحال، یہ کافی نہیں۔ انتقالِ اقتدار مکمل ہونے سے قبل علاقوں کی واپسی کے لیے خاص طور پر اعلان ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ان علاقوں کی عملی طور پر واپسی ہونی چاہیے، محض علاقوں کی واپسی کا معاہدہ کافی نہیں۔ یہ بین الاقوامی تسلیم شدہ قانون ہے کہ اگر حوالے کیا گیا علاقہ، پہلے ہی اس ملک کے پاس ہو جس کے حوالے علاقہ کیا گیا ہو تو پھر علاقہ حوالے کرنے کا عمل اس سے فوراً پہلے واقع ہو جانا چاہیے کہ بعد کی حکومت اپنی خودمختاری عمل میں لائے۔ امریکی معاملے میں، Davis v Police Jury of Concordia (9 Howard,280,at p289)، عدالت نے یہ فیصلہ دیا: ''یہ سچ ہے کہ کوئی علاقے دوسرے کے حوالے کر دینے کے معاہدے میں اس کا قومی کردار تمام قسم کے تجارتی مقاصد کے لیے جاری رہتا ہے لیکن اس

Scanned by CamScanner

پر عمل درآمد کے لیے مکمل خودمختاری اور اختیار اس قوم کو منتقل نہیں ہوتا جب تک اسے عملی طور پر منتقل نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دوسرے ملک کو اپنا علاقہ حوالے کرنے پر رضامند ملک کی طرف سے خودمختاری کا اظہار بظاہر تو ختم ہو جاتا ہے لیکن قطعی طور پر ملکی مقاصد خاص طور پر زمینوں کو دوسرے ملک کے حوالے کرنے کے لحاظ سے بدستور قائم اور برقرار رہتا ہے۔ اور دونوں معاملات میں اسی وجہ کے باعث، کیوں کہ معاہدہ طے پا جانے کے بعد ملکیت یا علاقے پر حق، دوسرے ملک کا قرار پاتا ہے۔ اس موقع پر برطانیہ کے عمومی قانون کو مدنظر رکھنا چاہیے۔'' اس معاملے میں موجود اصول مکمل طور پر بین الاقوامی طریقے اور استعمال کے عین مطابق ہے۔ جب حوالے ہونے والا علاقہ اس ملک کے قبضے میں نہ ہو جسے یہ علاقے حوالے کیا جا رہا ہو تو پھر علاقے کی ملکیت کی رسمی منتقلی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ 30 اپریل 1803ء کے معاہدے کی دوسری شق کے مطابق، فرانس نے لوزیانا کا علاقہ امریکہ کے حوالے کر دیا لیکن یہ صوبہ عملی طور پر 30 دسمبر 1803ء کو امریکہ کے حوالے کیا گیا۔ زبانی طور پر علاقہ حوالے کرنے کے موقع پر معاہدے میں شامل دونوں فریقوں کے کمشنروں نے سٹی ہال میں ملاقات کی اور فرانسیسی کمشنر نے ''نیو اورلینز (New Orleans) کے شہر کی چابیاں امریکی کمشنروں کے حوالے کر دیں۔ 27 فروری 1819ء کو سپین نے مشرقی اور مغربی فلوریڈا کی مکمل املاک اور حاکمیت، امریکہ کو سونپ دی۔ اس معاہدے کی ساتویں شق کے مطابق واضح طور پر کہا گیا کہ متذکرہ علاقے، معاہدے کی دونوں ممالک کی طرف سے توثیق کے بعد خالی کیے جائیں گے اور ان کا قبضہ امریکی نمائندوں کو دیا جائے گا۔ یوں، یہ علاقے امریکہ کے حوالے کرنے کے شاہی فرمان پر دستخط شاہ سپین کی طرف سے 24 اکتوبر 1820ء کو کیے گئے۔ ان علاقوں کو عملی طور پر حوالے کرنے کو بھی اس وقت ضروری سمجھا گیا جب روس نے 1867ء میں الاسکا کو امریکہ کے حوالے کر دیا۔ اس کی رسمی حوالگی 26 اکتوبر 1867ء کو سٹکا کے مقام پر عمل میں آئی۔ زبانی معاہدے میں کہا گیا کہ روسی نمائندے نے امریکی کمشنر کو مندرجہ بالا علاقے کا سرکاری سابقہ ریکارڈ، کاغذات، دستاویزات کے علاوہ اس علاقے کی املاک اور حاکمیت کے متعلق دستاویزات حوالے کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ گورنر ہاؤس، بندرگاہ کی گودیوں، گوداموں، فوجی قیام گاہوں، ہسپتالوں، بندرگودیوں اور سکولوں سمیت قلعے اور سرکاری عمارات کی دستاویز بھی امریکی کمشنر کے حوالے کر دیں۔ 1815ء کے معاہدۂ پیرس میں خصوصی طور پر اضافی معاہدے کی نویں شق کے تحت فرانس کی طرف سے حوالے کیے جانے والے علاقے کی رسمی حوالگی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا جس کا متن

Scanned by CamScanner

یوں ہے: ''معاہدے کے مطابق جو علاقے اور قلعہ لانڈوا اور سارلوئیس، جو اتحادیوں کے حوالے کرنا مقصود ہیں، اس معاہدے پر دستخط ہونے کے دس روز کے اندر فرانسیسی حکام کی طرف سے حوالے کیے جائیں گے۔'' اسی طرح 1866ء کے معاہدۂ ویانا کے تحت ایک خصوصی شق شامل کی گئی جس کے تحت حوالے کیے جانے والے علاقوں کا خالی کیا جانا مقصود تھا۔ 1895ء کے معاہدہ Shimonoseki کے تحت، چین کے اپنے بعض علاقوں کی مکمل حاکمیت جاپان کے حوالے کر دی۔

علاوہ ازیں، معاہدے میں ایک خصوصی شق بھی شامل کی گئی جس کے تحت متذکرہ علاقوں کی منتقلی ایک خاص مدت کے درمیان مکمل ہو جانی چاہیے تھی۔ امریکہ نے 1898ء کے معاہدے کے تحت سپین سے فلپائن کے جزیرے حاصل کر لیے۔ اس معاہدے میں ایک شق بھی شامل کی گئی جو علاقے کے قبضے کی منتقلی کے متعلق تھی۔ ان تمام معاملات میں ایک معاہدہ کے تحت محض حوالگی ہی کافی نہیں سمجھی گئی اور اس لیے علاقے کی عملی منتقلی کے لیے ایک خاص شق رکھی گئی۔ تمام بین الاقوامی ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ رسمی حوالگی کے بعد قبضے کی عملی حوالگی بھی عمل میں آنی چاہیے۔ مثال کے طور پر اوپنہیم کا کہنا ہے: ''جب تک نئی حکومت کے حوالے کیے جانے والا علاقہ پہلے ہی اس کے حوالے نہ کیا جا چکا ہو، رسمی حوالگی کے بعد یہ علاقہ عملی طور پر نئی حکومت کے حوالے کیا جانا چاہیے جیسے یہ حوالگی جنگ کے نتیجے میں ہو اور فوجی قبضے کے باعث یہ علاقہ پہلے ہی اس ملک کے قبضے میں ہو جس کے حوالے یہ علاقہ کیا جانا مقصود ہو۔ لیکن علاقے کی حوالگی محض زبانی طور پر جائز نہیں بلکہ حوالگی کی باقاعدہ دونوں فریقوں کی طرف سے توثیق ہونی چاہیے اور اس طرح نیا ملک اس علاقے کی رسمی وصولی کے بغیر ہی اسے تیسرے کے حوالے کر سکتا ہے۔ لیکن بلاشبہ، اس علاقے کا مالک نیا ملک اس وقت تک اس علاقے پر اپنی عملداری قائم نہیں کر سکتا جب تک عملی طور پر یہ علاقہ اس کے حوالے نہیں کر دیا جاتا۔''[28] اسی موقف کا اظہار بین الاقوامی عدالت برائے انصاف نے German Interest in Polish Upper Silesia(1926) اور Lighthouses in Crete and Samos(1937) کے متعلق اپنے فیصلے میں کیا۔ اس فیصلہ کا منطقی نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ یہ اصول حوالگی کے اختتام یا علاقوں کی واپسی پر بھی ہوتا ہے۔

6. مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر حکومت قلات نے نہایت ہی پُرزور انداز میں مطالبہ کرے گی کہ انتہائی ضروری ہے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنے سے پہلے اسے 1883، 1889 اور 1903ء کے معاہدات کے تحت حاصل کیے گئے کوئٹہ، نوشکی اور نصیر آباد کی نیابتوں اور

Scanned by CamScanner

اضلاع کی حاکمیت اور اختیارات کی رسمی واپسی کا اعلان کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ان علاقوں کو عملی طور پر بھی حکومت قلات کے حوالے کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بہت سی قانونی اور انتظامی مشکلات پیدا ہو جاتیں کیوں کہ ان متذکرہ علاقوں میں تعینات تمام افسر اور عدالتیں بغیر کسی قانونی اختیار کے کام کر رہی ہوتیں۔'' اپنے علاقے دوسری حکومت کے حوالے کرنے سے ان علاقوں پر ایک حکومت کی خودمختاری، عملداری اور اختیارات ختم ہو جاتے ہیں۔ امن وامان برقرار رکھنے کے اختیارات ان افسران کے پاس بدستور موجود رہ سکتے ہیں جو اس سے پہلے اس ملک میں تعینات تھے جس کے حوالے علاقہ کیا گیا تھا جب تک کہ مالک ملک کے افسر عملی طور پر متعین نہیں ہو جاتے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اختیارات سابقہ قوم کے پاس موجود رہیں۔''[29] اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب سپین کی خودمختاری اور علمداری، پورٹو ریکو سے واپس لے لی گئی تو تاجِ سپین کے گورنر جنرل اور دیگر افسران جن کا اختیار یہ تھا کہ شاہی فرائض ادا کیے جائیں، ان سے بھی اختیارات واپس لے لیے جائیں۔ یہی موقف اس وقت بھی اپنایا گیا جب جزائر ہوائی، امریکہ کے حوالے کیے گئے۔ اس موقع پر یہ موقف اختیار کیا گیا کہ جزائر ہوائی کی امریکہ حوالگی کے بعد وہاں تعینات افسران سرکاری زمینوں کے متعلق انتظام وانصرام کے اختیار سے محروم ہو گئے تھے۔ اگرچہ موجودہ معاملے میں عملداری اور خودمختاری ختم نہیں ہوئی تھی اور اس طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد عملداری اور خودمختاری کی منتقلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، برطانوی حکومت کو منتقل کیے گئے تمام اختیارات اور حقوق خانِ قلات کو واپس ہو جاتے اور بعدازاں اسی طرح کے نتائج برآمد ہوتے۔ یہ امر یکساں طور پر واضح ہے کہ منتقلی کی تاریخ کے بعد ہندوستان میں وہ حکومت یا حکومتیں جنہیں اختیارات وفرائض منتقل کیے گئے تھے، انہیں اختیار حاصل نہ ہوتا کہ وہ کوئٹہ، نوشکی اور نصیر آباد کے علاقوں میں تعینات افسروں کے اقدامات کو قانونی قرار دیتے کیوں کہ تمام اختیارات وفرائض عملی طور پر اس حقیقت کے نتیجے میں خانِ قلات کو واپس مل جاتے کہ برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے درمیان تمام معاہدے، ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کے بعد عملی طور پر منسوخ سمجھے جاتے۔ مزید برآں، حکومت قلات کو ان علاقوں میں تعینات افسروں پر کوئی اختیار اس وقت تک حاصل نہ ہوتا جب تک یہ علاقے عملی طور پر خانِ قلات کو واپس نہ مل جاتے۔

مزید برآں، حکومت قلات کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ اگر ہندوستان میں موجود وہ حکومت یا حکومتیں جنہیں قلات کے علاقے حوالے کیے گئے، اگر ان علاقوں کے ضمن میں کوئی بھی معاہدہ کرنا

Scanned by CamScanner

چاہتی ہیں تو وہ پھر اس حوا لے سے کسی بھی مناسب تجویز پر غور کرنے کے لیے تیار سو تیں لیکن انصاف اور مساوات کاتقاضا ہے کہ خان قلات کو بھی برطانوی حکومت سے معاہدے کرنے سے پہلے خان قلات کو بھی اسی حیثیت سے دیکا جائے۔

عوام کی آراء کے ساتھ مشادرت ضروری نہیں

یہ کہا جاتا ہے کہ متزکرہ علاقوں کی واپسی سے قبل ان علاقوں کے عوام کی رائے کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ بلاشبہ اس موقف کے حق میں دلچسپ مثالیں موجود ہیں لیکن ان سے یہ ثات نہیں ہوتا کہ عوامی رائے کے ساتھ مشاورت بین الاقوامی قانون اور طرقہ کار کے لحاظ سے ضروری ہے یا یہ اس کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اس ضمن میں ہال (hall(کہتا ہے:" یہ اصول کہ دوسری حکومت کو حوالے کیے جانے والے علاقوں کی عوام کی رائے کو مدنظر رکھاجائے،اسے بین الاقوامی طورپھر کہیں بھی اپنا یا گیا۔،،30 بہت سے سرکردہ ممالک کی پالیسی اور طریقہ کار ،اس اصول کے برعکس ہے۔ امریکہ نے اپنی طرف سے دوسرے ممالک کے علاقے اپنے ساتھ شامل کرنے (خواہجنگ یا امن مزاکرات کے نتیجے میں) کے حوالے سے اس طرقہ کار کے استعمال کی مخالفت کی ہے۔ جب جزائرہوئی۔ امریکہ کے حوالے کیے گئے اور اس بنیاد پر جاپان نے احتجاج کیا کہ عوام کی بہت کم تعداد اس الحاق کی حمائتی ہے تو تب کے امریکی وزیر خارجہ نے جاپانی وزیر کو درج ذیل تحریر بھیجی :" بین الاقوامی طریقہ کار کے مطابق قوم کی رائےکا تعین تسلیم شدہ حکومت کے ذریعے کیا جاتا ہے اور اس معاملے پر حکومت کو ہی کچھ کہنے کا حق حاصل ہے۔ اس کا اظہار جاپان کے ساتھ امریکہ کے تعلقات میں کیا گیا ہے۔ اس حکومت کا سلطنت کے ساتھ رابطہ اس مستند حاکمیت کے ساتھ ہوایے جو اگر چہ متنازع تو نہیں لیکن منقسم نوعیت کی حامل ہے۔ بعدازاں جب تمام اختیار اور قانون سازی اس سلطنت میں مرتکز ہوگئی تو پھر یہ حکومت ، رائے عامہ کی واحد نمائندہ ٹھہری۔"31 جہاں تک برطانیہکا تعلق ہے۔ لارڈسالسبری کی طرف سے دارالامراء میں ایک اعلان کیاگیا کہ " استصواب رائے اس ملک کا رواج نہیں۔،،اس لیے یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ بین الاقوامی قانون اور طریقہ کار کے مطابق عوامی رائے سے مشاورت ضروری نہیں۔مزیدبرآں، کوئٹہ ، نوشکی اور نصیرآباد کے معاملے کے لحاظ سے آبادی کی منتقلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ ریاست قلات کی خودمختاری بد ستور برقرار تھی ،نیز برطانوی حکومت کو منتقل کئے گئے علاقوں پر اس کا اختیار جوں کاتو موجودتھا،اور اس طرح علاقوں کی واپسی قومیت کی تبدیلی پر اثرانداز نہ ہتی۔ حکومت قلات نے یہ بھی

Scanned by CamScanner

بنایا ہو گا اگر برطانوی حکومت کی ہندی عایاان اضلاع اور نیانتوں میں اباد ہو چکی ہے تو پھر انہوں نے یہ کام اس حقیقت سے مکمل طورپر باخبر ریتے ہوئے کیا ہے کہ یہ علاقے برطانوی ہند کا حصہ نہیں اور یہ بھی کہ ان علاقوں پر ابھی تک خان قلات کی وعملداری قائم ہے۔

8 اور آخر میں حکومت قلات کی یہ تجویز ہوتی کہ برطانوی حکومت کی طرف سے متزکرہ علاقوں کی واپسی کے دوران برطانوی حکومت کو بغیر کسی اخراجات کے برطانوی حکومت کےزیر تسلط تمام املاک ،حکومت قلات کو واپس کر دہنا چاہیے یعنی وہ املاک جو خاص طور پر کوئٹہ ،نشکی اور نصیراباد کے علاقونمیں عوامی سہولیات اور خدمات ہم پہنچانے لےلیئے اسعمال ہوتی ہیں۔ تیزانتظامی اور عدالتی سرکاری دستاویزات اور ریکارڈ،جس کا تعلق مندرجہ یالاعلاقوں یا وہاں کی آبادی کے حقوق سے ہے۔یہ بینالاقومی طرقہکار اور استعمال کے عین مطابق ہے۔حکومت قلات اپنی طرف سے اس ضمن میں اعلان جاری کرنے کے تیارہے:

(1) یہ کہ علاقونکی واپسی کوئٹہ ،نوشکی اور نصیرآباد کے علاقں میں مقیم ہندی آبادی برطانوی رعایاہے،کی قومیت پراثراندازنہیں ہوگی؛

(2(یہ کہ متز کرہ بالا علاقوں کے مکین اپنے مزہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے کیوں کہ یہ اچھے طرزعمل اور اخلاقیات کے بنیادی اصولکے عین مطابق ہے؛

(3(یہ کہ علاقوں کی واپسی کے باعث واہا کے مکینوں کی املاک یا متاثرنہیں ہوں گے جو قانون کی روسے ہرقسم کی میونسپلٹیوں کی املاک کی ملکیت ،سر کاری یا نیجی املاک ،انیجی یا سرکاری اداروں یا پھر دیگر کسی اتجمنوں، نیجی افراد خن کی قومیت کچھ بھی ہو ،سے متعلق ہو جنہیں مندرخہ یا لاعلاقوں میناملاک کے حصول یا ان پر قبضہ کرنے کے حقوق حصل ہیں۔

(4(بی کہ علاقوں کی واپسی کے وقت زیر التواعدالتی کارروائی کا تعیون درج ذیل اصولوں کے مطابق کیا جائے گا:

(ا) متزکرہ یا لا تاریخ سے قبل نجی افراد یا فوجداری معاملات کے درمیان فوجداری مقدمات کے بارے کئے گئے فصیلے ،اور متزکرہ بالا علاقوں مینان کی واپسی کی تاریخ سے قبل ان کی فیصلوں کے ضمن میں جن کے متعلق کوئی بھی درخواست یا نضرثانی کی درخواست زیر اکتو انہیں ،تصور کئے جائیں گے اور با اختیار حکام کی صرف سے ان پر بعیتہ عمل کیا جائےگا۔

Scanned by CamScanner

(b) نجی افراد کے درمیان فوجداری مقدمات جن کا متذکرہ بالا تاریخ پر فیصلہ نہیں ہوا، انہیں اس عدالت میں پیش کیا جائے گا جہاں وہ زیر التوا ہیں یا انہیں کسی دوسری عدالت میں منتقل کر دیا جائے گا۔

(c) متذکرہ بالا تاریخ پر فوجداری مقدمات جو علاقوں کی واپسی سے قبل اعلیٰ فوجداری عدالت میں زیر التوا تھے، حتمی فیصلے تک جاری رہیں گے لیکن اگر اس ضمن میں فیصلہ صادر ہو چکا ہو تو یا اختیار الدارہ اس پر عمل کرے گا۔

میمورنڈم، تیار کردہ از سید سر سلطان احمد، K.C.S.I., D.L. بیرسٹر ایٹ لا،
اور سر ڈارڈی کے سکین، M.A. (Oxon)، B.C.L.، بیرسٹر ایٹ لا،

ضمیمہ A

ملک معظم خانِ قلات میر خداداد خان (فریق اوّل) اور سر رابرٹ سنڈیمن، K.C.S.I.، بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ (فریق دوم) کے درمیان معاہدہ، جس کی منظوری ملک معظم وائسرائے ان کونسل کی طرف سے توثیق سے مشروط ہے، جون کی 8 تاریخ 1883ء کو طے پایا۔

جب کہ 1879ء کے سال میں یا لآخر برطانوی حکومت اور ملک معظم میر خداداد خانِ قلات کے درمیان معاہدہ طے پایا جس کے تحت کوئٹہ کی تیابت اور ضلع بعض شرائط اور مخصوص وقت کے لیے برطانوی حکومت کے زیر انتظام دے دیا گیا، اور جب کہ اس معاہدے کے تحت مقرر کی گئی مدت تقریباً گزر چکی ہے اور جب کہ اور تجربے سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ دونوں حکومتوں کے مفاد میں ہے کہ کوئٹہ کا ضلع اور تیابت کا انتظام خاص طور پر برطانوی حکومت کے اختیار میں کے ذریعے کیا جائے اور جب کہ عزت مآب کی خواہش سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محصول کے تقاضے اور درہ بولان میں ملک معظم خانِ قلات کو برطانوی حکومت کی طرف سے درہ ہرنائی کھولنے کے باعث جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کے لیے اسی قسم کا ایک معاہدہ کیا جائے۔ اس ضمن میں باہمی رضامندی کے ذریعے درج ذیل معاہدہ طے پایا ہے:

1. اپنی، اپنے وارثین اور جانشینوں کی طرف سے میں، خانِ قلات، ضلع اور تیابت کوئٹہ کا مکمل انتظام و انصرام، ہر قسم کے حقوق اور مراعات کے علاوہ تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات میں تمام آمدنی اور انتظامیہ کے دیگر تمام اختیارات، مندرجہ ذیل شرائط کی بنیاد پر یکم اپریل 1883ء کو برطانوی حکومت کے حوالے کرتا ہوں:

(1) یہ کہ متذکرہ ضلع اور نیابت کا انتظام برطانوی حکومت کی طرف سے اس افسر یا افسران کے ذریعے کیا جائے گا جنہیں اس مقصد کے لیے گورنر جنرل ان کونسل کی طرف سے مقرر کیا جا سکتا ہے۔

(2) یہ کہ 1879ء کے متذکرہ بالا معاہدے کے تحت سالانہ فالتو آمدن کے عوض، برطانوی حکومت ملک معظم کو ہر سال 31 مارچ کو جس کا آغاز یکم مارچ 1884ء سے ہو رہا ہے، سالانہ کرایہ 25,000 روپے ادا کرے گی جو متذکرہ ضلع اور نیابت کی فالتو آمدن کو وصول کرنے کے حق کے منصفانہ طور پر مساوی طے پایا گیا ہے۔

(3) متذکرہ بالا 25,000 روپے کی رقم کسی بھی قسم کی انتظامی اخراجات کی منہائی کے بغیر اس وقت تک ملک معظم کو ادا کی جائے گی جب تک متذکرہ ضلع اور نیابت، برطانوی حکومت کے زیر انتظام ہیں۔

2. ملک معظم خان، 1854ء کے معاہدے کے مطابق برطانوی حکومت کو یکم اپریل 1883ء سے درۂ بولان سے برطانوی ہند اور برطانوی ہند سے درۂ بولان اور افغانستان کے ذریعے اور پھر کچھی سے خورستان تک، یا پھر برطانوی ہند اور ہی، کوئٹہ اور پشین کے اضلاع کے درمیان تجارتی سفر کے دوران محصول وصول کرنے کے تمام تر اختیارات کو برطانوی حکومت کو منتقل کرتا ہے۔

3. اس سے پہلے خان قلات کی طرف سے برطانوی حکومت کو جو اختیارات منتقل کیے گئے، اس کے عوض برطانوی حکومت خان کو تمام اقسام کی منہائی کے بغیر، چھ چھ ماہ کی دو اقساط میں یکم اکتوبر 1883 سے ہر سال یکم اپریل کو سالانہ 30,000 کی رقم ادا کرنے پر رضامند ہو گئی۔ اس کے علاوہ وائسرائے اور گورنر، سارا وان اور کرد سرداروں کو درہ میں بعض خدمات، یعنی راستے اور حفاظت کی فیسوں کے طور پر سالانہ ایک مقررہ رقم ادا کرنے پر رضامند ہو گئے۔

درۂ بولان میں اپنی طرف سے برطانوی حکومت کے لیے محصول اکٹھا کرنے کے بندوبست کے طور پر خان، برطانوی حکومت کو تمام دیوانی اور فوجداری عملداری کے علاوہ متذکرہ درے کی حدود اور برطانوی حکومت کے علاقے میں ریناالدی کے مقام پر ریلوے سٹیشن اور دیگر عمارات تعمیر کرنے کے ضمن میں تمام انتظامی اختیارات منتقل کرتا ہے۔

ضمیمہ B

ملک معظم خان قلات میر محمود خان، G.C.I.E (فرسٹ کلاس) اور کرنل ہنری وائلی، C.S.I بلوچستان میں گورنر جنرل کے قائم مقام ایجنٹ (فرسٹ کلاس) کے درمیان معاہدہ جس کی منظوری

وائسرائے اِن کونسل کی طرف سے توثیق سے مشروط ہے، یکم جولائی 1883ء کو طے پایا۔

جب کہ تجربے سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ یہ دونوں، برطانوی حکومت اور ملک معظم، میر محمد خان، خانِ قلات کے مفاد میں ہے کہ نوشکی کے ضلع اور نیابت کا انتظام خاص طور پر برطانوی حکومت کے افسران کے ذریعے کیا جائے۔ اس ضمن میں باہمی رضامندی کے ذریعے درج ذیل معاہدہ طے پایا ہے:

(1) یہ کہ متذکرہ ضلع اور نیابت کا انتظام برطانوی حکومت کی طرف سے اس افسر یا افسران کے ذریعے کیا جائے گا جنہیں اس مقصد کے لیے گورنر جنرل اِن کونسل کی طرف سے مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(2) یہ کہ برطانوی حکومت ملک معظم کو ہر سال یکم ستمبر کو جس کا آغاز یکم ستمبر 1899ء سے ہو رہا ہے، ایک مقررہ سالانہ کرایہ 9,000 روپے ادا کرے گی جو ملک معظم، خان کے متذکرہ ضلع اور نیابت کی فالتو آمدن کو وصول کرنے کے حق کے منصفانہ طور پر مساوی طے پایا ہے۔

(3) متذکرہ بالا 9,000 روپے کی رقم کسی بھی قسم کی انتظامی اخراجات کی منہائی کے بغیر ملک معظم کو ادا کی جائے گی۔

ضمیمہ C

ملک معظم خانِ قلات میر محمود خان، G.C.I.E. (فریق اوّل) اور عزت مآب کرنل سی ای ییٹ، G.S.I., C.M.G. بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ (فریق دوم) کے درمیان معاہدہ جس کی منظوری ملک معظم وائسرائے اِن کونسل کی طرف سے توثیق سے مشروط ہے، سبی میں 17 فروری 1903ء کو طے پایا۔

i. جب کہ تجربے سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ یہ دونوں، برطانوی حکومت اور ملک معظم، میر محمد خان، G.C.I.E.، خانِ قلات کے مفاد میں ہے کہ نصیر آباد کے ضلع اور نیابت کا انتظام خاص طور پر برطانوی حکومت کے افسران کے ذریعے کیا جائے۔ اس ضمن میں باہمی رضامندی کے ذریعے درج ذیل معاہدہ طے پایا ہے:

(1) یہ کہ متذکرہ ضلع اور نیابت کا انتظام برطانوی حکومت کی طرف سے اس افسر یا افسران کے ذریعے کیا جائے گا جنہیں اس مقصد کے لیے گورنر جنرل اِن کونسل کی طرف سے یکم اپریل 1903ء سے یا حکومت ہند کی طرف سے مقرر کردہ کسی بھی تاریخ سے مقرر کیا جاسکتا ہے۔

Scanned by CamScanner

(2) یہ کہ برطانوی حکومت ملک معظم کو ہر سال یکم اپریل کو جس کا آغاز یکم اپریل 1903ء سے ہو رہا ہے، ایک مقررہ سالانہ کرایہ 1,15,000 (مبلغ ایک لاکھ پندرہ ہزار) روپے ادا کرے گی۔

(3) متذکرہ بالا 1,15,000 روپے کی رقم کسی بھی قسم کی انتظامی اخراجات کی منہائی کے بغیر ملک معظم کو ادا کی جائے گی۔

ii. نصیر آباد کے ضلع اور نیابت کی حد بندی جو ملک معظم، خانِ قلات کے نائب، غوث بخش نے یکم جولائی 1902ء کو بیان کی، درج ذیل ہے:

''اس کے جنوب میں سندھ کی سرحد، شمال میں اس کی سرحد لینی برج سے مزاری سرحد کے ساتھ ساتھ بگتی پہاڑوں سے جنوب مشرق کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی سرحد پہاڑوں کے دامن سے گزرتی ہوئی مانک گڑھی نالا کی نزدیکی شاہراہ شاہ پور کے قریب ترین مقام جو مغربی طرف واقع ہے، پھیلی ہوئی ہے۔ یہ شاہراہ شاہ پور، جنوب کی طرف دیہہ شٹن کی زمینوں (جنہیں عام طور پر ڈوڈائیکا) کہا جاتا ہے، تک جاتی ہے اور پھر وہاں سے مغرب کی طرف ڈوڈائیکا سے اس مقام سے اوپر مڑتی ہوئی مغرب کی طرف نوروا سرنگ تک جاتی ہے جہاں پانی پہنچتا ہے۔ یہاں سے یہ درمحمد واہ تک جاتی ہے جسے اکثر نقشوں میں شاہیوا کے طور پر دکھایا گیا ہے جو مرکزی صحوائی نہر کا تسلسل ہے۔ اس جگہ سے یہ مغرب اور جنوب مغرب کی طرف راستے کے ساتھ ساتھ درمحمد واہ کی طرف جاتی ہے اور 368 ویں میل پر جٹ پور سٹیشن سے پانچ میل کے فاصلے پر اسے عبور کرتی ہے اور پھر یہ ان ستونوں کی ایک قطار کے ساتھ جا ملتی ہے جنہیں چار برس قبل مکسیوں اور جمالیوں نے اپنی مشترکہ سرحد کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ اس کے بعد یہاں سے جنوب کی طرف سندھ کی سرحد کی طرف جا نکلتی ہے اور اس مقام سے 500 گز مغرب کی طرف گزرتی ہے جہاں سونواہ کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔

iii. جب کہ یہ ممکن ہے کہ منجوتی زمینوں کا زیریں حصہ ایک سیدھی لکیر میں گھرا ہوا ہے جو اس مقام سے کھنچی ہوئی ہے جہاں درمحمد واہ، 368 ویں میل کے نزدیک ریلوے لائن کو عبور کرتی ہوئی جیکب آباد اور شاہراہ شاہ پور کی طرف 8 میل شمال کی طرف جاتی ہے جہاں سے درمحمد واہ نے اس شاہراہ کو عبور کیا تھا، جسے بعد ازاں زیر کاشت لایا گیا ہوگا۔ خانِ قلات، اپنی، اپنے وارثین اور اپنے جانشینوں کی طرف سے عین اسی طرح منجوتی کی سرزمین کو مستقل طور پر برطانوی حکومت کو منتقل ہونے پر رضامند ہے جس طرح نصیر آباد کا ضلع اور نیابت برطانوی حکومت کے حوالے کیا گیا، نیز اس امر پر بھی باہمی

Scanned by CamScanner

رضامندی ظاہر کی گئی کہ برطانوی حکومت، خان کو سالانہ اضافی کرایہ 2,500 روپے ادا کرے گی اور یوں کُل کرایہ 1,17,500 ہوگا جو اپریل 1904ء کی پہلی تاریخ کے بعد مسلسل سال بہ سال ادا کیا جائے گا۔

iv. اور جب کہ یہ کہا گیا ہے کہ ریاست قلات کی کوئی بھی مزید زمینیں جو نصیرآباد کے ضلع اور نیابت کی حدود سے باہر ہیں اور جو ممکنہ طور پر موجودہ برطانوی نہروں کی ذیلی نہروں اور شاخوں کے ذریعے کاشت کی جاسکتی ہیں، عین اسی طرح برطانوی انتظام کے تحت آگئی ہیں جس طرح نصیرآباد کا ضلع اور نیابت، برطانوی حکومت کے زیرنگیں آگیا تھا۔ ملک معظم، خان نے اس امر پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ لہری بھاگ اور گندھاوا نیابتوں میں کوئی بھی زمین مستقل طور پر برطانوی حکومت کے حوالے کردی جائیں جنہیں برطانوی نہروں کے ذریعے سیراب کیا جاسکے، نیز جائزہ مکمل ہونے پر مناسب کرایہ بھی متعین کیا جائے گا۔

(ماخذ: میر احمد یار، خانِ قلات، IOR: L-P+S.13/1847)

(IV) بلوچستان کی سیاسی حیثیت کے متعلق بمبئی کے بار ایٹ لاء آئی آئی چندریگر کا تیار کردہ ڈرافٹ میمورنڈم

i. ہندوستان اس وقت آئینی تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا ہے۔ کابینہ مشن اور ملک معظم وائسرائے نے 16 مئی 1946ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں برطانوی ہند کے آئین کے لیے بنیادی طریقہ کار کی سفارش کی گئی۔ اس بیان کے چودھویں پیرے میں وہ کہتے ہیں کہ ''اپنی سفارشات پیش کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی ہند کے ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات کے بارے میں بتایا جائے اور اس کے بعد یہ کہا جائے کہ ''تاجِ برطانیہ کی طرف سے عملداری اور حاکمیت برقرار نہیں رکھی جاسکتی اور نہ ہی اسے نئی حکومت کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔'' پہلے تو یہ واضح ہے کہ کابینہ مشن اور ملک معظم وائسرائے نے اپنے بیان میں ہندوستانی ریاستوں کے متعلق بیان کیا اور قلات ایک ہندوستانی ریاست نہیں اور اس پر لازم نہیں کہ وہ ہندی وفاق میں شامل ہو، اور دوسرے یہ کہ انہوں نے واضح طور پر فیصلہ کیا کہ تاج برطانیہ کی طرف سے عملداری اور حاکمیت برقرار نہیں رہ سکتی اور نہ ہی نئی حکومت کو منتقل کی جاسکتی ہے۔

Scanned by CamScanner

میں مزید کہنا چاہوں گا کہ قلات، جو ایک ہندوستانی ریاست نہیں اور ہندوستانی سرحدوں پر اس کی جغرافیائی حیثیت کے باعث اس کے برطانوی حکومت کے ساتھ تعلقات قائم ہوئے، محض افغانستان اور ایران کی مانند ہے۔ اب جب کہ برطانوی حکومت انتقالِ اقتدار اور ہندوستان کو آزادی عطا کرنے میں سہولت فراہم کرنے میں ہے، تو ریاست قلات لازمی طور پر آزاد ہونی چاہیے۔ 1876ء میں برطانوی حکومت اور ریاست قلات کے درمیان ایک معاہدے کی شق 3 کی رُو سے برطانوی حکومت نے قلات کی آزادی کے احترام کو قبول کر لیا تھا اور برطانوی ہند کی عملداری سے نکلنے کے بعد یہ از خود ہی مکمل طور پر آزاد اور خود مختار حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

برطانوی کابینہ مشن نے اپنے بیان مورخہ 23 مئی 1946ء میں مزید اعلان کیا ہے کہ "جب برطانوی ہند میں خود مختار یا آزاد حکومت یا حکومتیں وجود میں آئیں تو پھر ملک معظم کی حکومت کا ان حکومتوں کے ساتھ اثر و رسوخ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ عملداری اور حاکمیت کے فرائض ادا کر سکے۔ مزید برآں، وہ سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہندوستان میں نہیں رکھے جائیں گے۔ اس لیے ایک منطقی نتیجے کے طور پر اور ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے بیان کی گئی خواہش کے پیش نظر، ملک معظم کی حکومت اپنی حاکمیت اور عملداری کے اختیار سے محروم ہو جائے گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ریاستوں کے حقوق جو تاجِ برطانیہ کے ساتھ تعلقات کے ساتھ ہی بدستور جاری رہتے ہیں، مزید جاری نہیں رہیں گے اور ریاستوں کی طرف سے برتر اور حاکم طاقت کو منتقل کیے گئے اختیارات، ریاستوں کو واپس مل جائیں گے۔ یہ خلا دوسری حکومتوں یا برطانوی حکومت کے ساتھ ریاستوں کی طرف سے وفاقی تعلقات قائم کرنے کے ذریعے یا پھر ناکامی کی صورت میں اس کے ساتھ یا اس کے بغیر ایک خاص معاہدہ طے کر لیں گے۔

دوسری حکومت یا حکومتوں کے ساتھ وفاقی تعلق میں شامل ہونے کے لیے میری ریاست کا کوئی ارادہ نہیں اور اس لیے میں عالی جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ ریاست قلات کی آزادی کا اعلان کیا جائے۔

ii. میرے پیش رو، ملک معظم میر خداداد، خانِ قلات نے ایک معاہدے مورخہ 8 جون 1883ء کی رُو سے کوئٹہ ضلع اور نیابت کا تمام انتظام یکم اپریل 1883ء سے اس معاہدے میں شامل شرائط پر برطانوی حکومت کو منتقل کر دیا اور ایک معاہدے مورخہ یکم جولائی 1899ء کے ذریعے نصیر آباد کے ضلع اور نیابت کا تمام تر انتظام یکم اپریل 1903ء سے معاہدے میں شامل شرائط پر برطانوی حکومت کے حوالے

Scanned by CamScanner

کر دیا۔ یہ معاہدے میرے پیشروؤں نے برطانوی حکومت کے ساتھ طے کیے اور انہوں نے برطانوی حکومت کی ایمان داری اور انتظامی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اسے اضلاع اور نیابتوں کا تمام تر انتظام سونپ دیا۔ انتظام کاری کے اختیارات جو میرے پیش روؤں نے برطانوی حکومت کو منتقل کیے جو اس وقت ہندوستان میں ایک برتر اور حاکم طاقت تھی، لازمی طور پر ریاست کو واپس ہونے چاہئیں جس طرح کابینہ مشن نے نہایت درست طور پر اعلان کیا۔ اس لیے میری ملک معظم سے درخواست ہے کہ نئی حکومت یا حکومتوں کے قیام کے وقت جو برطانوی ہند میں تشکیل پا سکتی ہیں، ان اضلاع اور نیابتوں کو میرے حوالے کر دیا جائے۔

iii. میرے پیش رو، میر خداداد خان، خانِ قلات نے ایک معاہدہ مورخہ 8 جون 1883ء کے ذریعے محصول وصول کرنے کے تمام حقوق یا درۂ بولان سے برطانوی ہندوستان اور افغانستان، نیز کچھی اور کچھی سے خورستان کے درمیان، 1854ء کے معاہدے کے تحت برطانوی ہند سے سبی، کوئٹہ اور پشین کے اضلاع کے درمیان تجارتی سفر کے درمیان محصول وصول کرنے کے تمام حقوق، معاہدے میں موجود شرائط کے مطابق، برطانوی حکومت کے حوالے کر دیئے تھے۔ مزید برآں میرے پیش رو میر خداداد خان نے برطانوی حکومت کو تمام دیوانی اور فوجداری اختیارات کے علاوہ متذکرہ درے اور برطانوی حکومت کی طرف سے رندالی میں ریلوے سٹیشن اور دیگر عمارات کی تعمیر کے لیے خریدی گئی زمین کی حدود کے اندر تمام انتظامی اختیارات سونپ دیئے تھے۔ میرے پیشروؤں کی طرف سے ایک برتر اور حاکم قوت کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے حوالے کیے گئے تمام اختیارات لازمی واپس کیے جائیں جس طرح اس ضمن میں کابینہ مشن نے اعلان کیا ہے۔ اس لیے میں نے ملک معظم کو درخواست کی ہے کہ برطانوی ہندوستان میں نئی حکومت یا حکومتیں قائم ہونے پر اختیارات ان کے حوالے کرتے وقت اس ضمن میں اعلان کیا جائے اور ان کا انتظام ایک ایسے افسر کے حوالے کیا جائے جسے میں مقرر کروں گا۔

iv. لسبیلہ اور خاران کے سردار، میرے ماتحت تھے اور وہ میرے ماتحت ہی رہیں گے۔

v. مری اور بگتی قبیلے اسی طرح میرے ماتحت ہیں اور رہیں گے۔

vi. جہاں تک ٹیلی گراف لائنوں کا تعلق ہے، نئی حکومت یا حکومتیں میرے ساتھ بات چیت کر سکتی ہیں اور دونوں فریقین قابل قبول شرائط پر میرے ساتھ نئے معاہدے طے کر سکتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

(ماخذ: قائداعظم پیپر سیل، وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان، اسلام آباد)

(V) وزیراعظم قلات کی طرف سے بلوچستان کی آئینی حیثیت کے متعلق سیکریٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ، حکومت ہندوستان، ایل گریفن کے نام خط

میڈرز ہوٹل، دہلی

26 دسمبر 1946ء

عزیزِ من گریفن صاحب،

میں 22 دسمبر کی شام بھوپال سے واپس آیا اور 23 دسمبر کی سہ پہر آپ کے دفتر سے رابطہ کیا لیکن مجھے بتایا گیا کہ آپ جا چکے ہیں۔ بہرحال، میں نے ویکفیلڈ صاحب سے ملاقات کی اور بھوپال میں شہزادگان کے چیمبر کے عزت مآب چانسلر سے ملاقات کے متعلق مختصر احوال عرض کیا۔ اس ملاقات کے مفصل احوال سے آپ کو آگاہ کرنے کی خاطر میں اب آپ کو خط لکھ رہا ہوں، نیز میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے پر معذرت کا خواست گار ہوں:

2. میں نے عزت مآب چانسلر کو وضاحت کے ساتھ بتایا کہ اس وقت ریاست قلات کو تین اہم مسائل درپیش ہیں مثلاً،

(a) برطانوی حکومت کی طرف سے عنانِ حکومت ہندوستانیوں کے حوالے کرنے کے بعد ریاست کی آئندہ حیثیت اور ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات؛

(b) برطانوی حکومت کے ساتھ ملک معظم کے معاہدے کی منسوخی کے بعد کوئٹہ، نوشکی اور نصیرآباد کے لیز پر لیے ہوئے علاقوں کی ریاستِ قلات کو واپسی؛ اور

(c) دیگر بلوچی قبائلی علاقوں، مثلاً خاران اور لسبیلہ، دو وفاقی ریاستوں، مری اور بگتی علاقوں، وغیرہ کا مستقبل۔

3. 2(a) کو پہلے زیرغور رکھتے ہوئے میں نے عزت مآب چانسلر کی خدمت مین جو کچھ عرض کیا، وہ کم وبیش یوں ہے:

(i) ریاستِ قلات، ہندوستان کا حصہ ہے نہ کبھی اس کا حصہ رہی ہے۔ یہ کوئی ہندوستانی

Scanned by CamScanner

ریاست بھی نہیں۔ برطانوی حکومت کے قیام سے قبل، بلوچستان، جس کا نام اس وقت ان علاقوں کے لیے لیا جاتا تھا جہاں بلوچی قبیلے بستے تھے (اس میں بروہی بھی شامل ہیں)، ایک آزاد ریاست تھی جس کا سربراہ خانِ قلات تھا جسے اس زمانے میں خانِ بلوچستان کہا جاتا تھا۔ اس امر کا واضح دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ بلوچستان کے خوانین، ریاست قلات کے موجودہ حکمران کے عظیم پیشرو بغیر کسی بیرونی مداخلت کے، اپنے علاقوں پر آزادانہ حکومت کرتے تھے اور نہ صرف اپنے ہمسایہ ممالک کے حکمران، مثلاً افغانستان اور ایران بلکہ بذاتِ خود خلیفہ اسلام بھی انہیں نہایت عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتے تھے جس نے خانِ بلوچستان کو Beglar Begi (ایک ترک لفظ بیلر بے جس کے معنی ''خانوں کا خان'' ہیں) کا لقب دے رکھا تھا۔

(ii) ریاست قلات کا برطانویوں کے ساتھ پہلا رابطہ 1838ء کے سال میں ہوتا ہے جب برطانویوں نے جلاوطن شاہ افغانستان، شاہ شجاع الملک کی مدد کے لیے ایک فوجی مہم بلوچستان کے راستے افغانستان روانہ کی جس نے اس سے قبل کسی وقت ریاستِ قلات میں پناہ حاصل کر لی تھی۔ اس ضمن میں قلات کے خان کا تعاون طلب کیا گیا جو بغیر ردوکد کے فراہم کر دیا گیا۔ ریاست قلات اور اس کے حکمرانوں کے ساتھ برطانوی تعلقات کی بعد کی تاریخ تمام عرصے میں باہمی دوستی اور مصالحت پر مبنی دوستانہ اتحاد پر مشتمل رہی ہے۔

(iii) یہ معاہدے 1841ء، 1854ء، اور 1876ء میں طے پائے اور ان کی بنیاد، دونوں آزاد و خودمختار حکومتوں کے درمیان باہمی دوستی اور اتحاد پر تھی۔ اس کے علاوہ برقی تار کے بہت سے معاہدے ریاستِ قلات اور لسبیلہ کی وفاقی ریاست کے ساتھ کیے گئے جن کے ذریعے برطانوی حکومت اور ریاست قلات کے درمیان قائم تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان تعلقات کا اظہار متذکرہ بالا معاہدوں میں ہوتا ہے۔ نیز ٹیلی گراف کے متعلق معاہدے، دونوں ممالک کے درمیان دوستی، خلوص کو ظاہر کرتے ہیں اور برطانوی حکومت اور آزاد و خودمختار ریاست قلات کے حکمران کے درمیان ایک ''اچھے اتحادی'' کی علامت ہیں۔

(iv) اس موقع پر 1876ء کے معاہدے کا حوالہ دینا مقصود ہے جو زمانۂ حال میں نافذ ہے۔ اس معاہدے کا آغاز درج ذیل الفاظ سے ہوتا ہے: جب کہ اس وقت 1854ء کے معاہدے کی تجدید کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔۔۔ نیز اس معاہدے میں کچھ ترمیمی شقوں کو بھی شامل کرنا ضروری ہو گیا ہے

Scanned by CamScanner

تا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان دوستی کے رشتے کو مزید مضبوط کیا جائے۔'' اس معاہدے کی شق 3، جہاں خان کو برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کا عہد نبھانے کا مطالبہ کرتی ہے، وہاں برطانوی حکومت کو بھی اس امر کا پابند کرتی ہے کہ قلات کی آزاد حیثیت اور خودمختاری کا احترام کیا جائے۔

شق 4 برطانوی ایجنٹوں کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ خان کے دربار میں مستقل قیام کریں، اور دوسری طرف، خان کو بھی حق دیتی ہے کہ وہ حکومت ہند کے لیے ایک مناسب نمائندہ مقرر کرے۔ نمائندوں کے اس تبادلے کی وجہ، اس شق کے پہلے فقرے میں دی گئی ہے جو یوں ہے: ''تا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان دوستی کی تجدید اور توثیق کو مزید مضبوط کیا جائے۔'' (میں نے عزت مآب چانسلر کو یہ بھی بتایا کہ ملک معظم، خانِ قلات نے اس معاہدے کی شق کے تحت مجھے حال ہی میں تاجِ برطانیہ کے نمائندے کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے اور میں ملک معظم کو پہلے ہی 18 دسمبر 1946ء کو اپنے کاغذاتِ نامزدگی پیش کر چکا ہوں)۔

شق 6 کے تحت برطانوی حکومت نے دونوں ممالک کے درمیان موجود گہرے تعلقات کا اعتراف کرتے ہوئے ملک معظم کی اس خواہش کے ساتھ رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ اس کے ملک میں موجود برطانوی فوجیوں کو واپس بلا لیا جائے۔

شق 7 کے تحت برطانوی حکومت کی طرف سے تعمیرات کے حق کا ذکر کیا گیا ہے، ''برطانوی حکومت اور ملک معظم کی حکومت کے درمیان گزشتہ معاہدے کی رُو سے'' ٹیلی گراف اور ریلوے کی وہ لائنیں جو دونوں ممالک کے لیے مفید ہوں، تعمیر کرنے کا حق برطانوی حکومت کو تفویض کیا جاتا ہے:

(v) لہٰذا یہ دیکھا جائے گا کہ برطانوی حکومت اور ریاستِ قلات کے درمیان تعلقات، دو آزاد حکومتوں کی حیثیت سے طویل عرصے سے باہمی دوستی اور خلوص پر مبنی ہیں اور ان تعلقات کی ان کے علاوہ کوئی دیگر بنیاد نہیں ہے۔

(vi) یہ درست ہے کہ حکومت ہند کے قانون 1935ء کے تحت ریاست قلات، ہندوستان میں واقع ہے لیکن اس قانون کو تشکیل دیتے ہوئے ریاست سے مشاورت نہ کی گئی، دونوں ممالک کے درمیان معاہدے کے مطابق دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کے لحاظ سے، نہ ہی یہ ریاست اس قانون کا کوئی حصہ ہے کیوں کہ یہ ایسا قانون ہے جو ایک حکومت کی طرف سے اپنے علاقوں کی انتظام کاری کے لیے منظور کیا گیا، اس لیے دوسری حکومت پر اس قانون کا کوئی قانونی حق موجود نہیں۔ اگر ایسا

Scanned by CamScanner

نہ بھی ہوتا تو پھر برطانوی حکومت کے لیے یہ بھی قانونی ہوتا کہ اس قانون میں ایک شق کے اضافے کے ذریعے ایران اور افغانستان کو بھی ہندوستان کی حدود میں شامل کیا جاتا۔ بہرحال، خانِ قلات نے متعلقہ اور مناسب حلقوں سے اس ضمن میں احتجاج کیا ہے کہ یہ قانون 1876ء کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ بہرحال، ملک معظم کو عزت مآب تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی طرف سے ایک خط (اس خط کی تاریخ 10 جون 1939ء ہے) موصول ہوا جس میں ملک معظم کو یقین دلایا گیا کہ ازسرنو توثیق غیرضروری ہے، نیز عزت مآب کے نزدیک 1876ء کا معاہدہ ہر لحاظ سے جائز اور قابل عمل ہے، اور اس لیے یہ برطانوی حکومت اور ریاستِ قلات کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہوگا۔

(vii) لہٰذا، ملک معظم خان کا موقف ہے کہ ان کی تمام رعایا، اس کے موقف کی متفقہ طور پر حامی ہے کہ (a) ریاستِ قلات ایک آزاد اور خودمختار ملک ہے جس کے برطانوی حکومت کے ساتھ تعلقات کی بنیاد 1876ء کا معاہدہ ہے۔ (b) یہ کہ ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات محض برطانوی حکومت کے ساتھ اس معاہدے کے باعث ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں؛ (c) یہ کہ ریاستِ قلات ایک آزاد و خودمختار ریاست ہے اور اس کی اس حیثیت کے باعث ملک معظم اسے ہندوستانی وفاق میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ (d) یہ کہ برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدے کی منسوخی کی ساتھ ہی ریاستِ قلات کی اصلی حیثیت بحال ہو جائے گی اور اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کے متعلق آزاد ہوگی؛ اور (e) یہ کہ ہندوستان اور ریاستِ قلات کے درمیان آئندہ تعلقات کا انحصار قطعی طور پر اس معاہدے کی نوعیت پر ہوگا جو دونوں ممالک کے درمیان بہ وقت ضرورت طے پا سکتا ہے۔

(viii) بہرحال، ملک معظم کی یہ شدید خواہش ہے کہ ہندوستان کے ساتھ اس کے دوستانہ اور پُرخلوص تعلقات جاری رہیں اور وہ اس حکومت کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوگا جو برطانوی حکومت کا اقتدار ختم ہونے کے بعد اقتدار میں آتی ہے، بشرطیکہ دوسرا فریق ریاست قلات کی آزاد اور خودمختار حیثیت کو تسلیم کرنے کے علاوہ اس کا عزت و احترام بھی کرے۔

4. جہاں تک مندرجہ بالا 2(b) کا تعلق ہے، لیز پر دیئے گئے علاقوں کے معاملے کے لیے میں ان معاہدوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن کے تحت یہ علاقے برطانوی حکومت کو لیز پر دیئے گئے۔

(i) ان معاہدوں کے تحت، قلات کی کوئٹہ، نوشکی اور نصیرآباد نیابتیں، ایک مجموعی کرایہ پر ملک معظم، خان کی طرف سے برطانوی حکومت کو لیز پر دی گئیں۔ مزید برآں، خان نے برطانوی حکومت کو

Scanned by CamScanner

درۂ بولان کے تجارتی راستے کے تمام محصولوں کی وصولی کا حق بھی برطانوی حکومت کو تفویض کر دیا اور اس کے عوض برطانوی حکومت، ملک معظم خان کو سالانہ 30,000 روپے ادا کرنے پر رضامند ہوگئی۔ ان معاہدوں کے نمایاں نکات درج ذیل ہیں:

(a) پہلے یہ کہ خانِ قلات اور برطانوی حکومت کے درمیان معاہدوں کی بنیاد، دونوں حکومتوں کے باہمی مفاد کے لیے ''باہمی رضامندی'' تھی۔

(b) دوسرے یہ کہ جب کہ ان معاہدوں کے لیے ایک فریق ملک معظم، میر خداداد، اپنی، اپنے وارثین اور جانشینوں کی طرف سے تھا، دوسرا فریق، برطانوی حکومت ہے لیکن اس کے جانشین نہیں۔

(c) تیسرے یہ کہ مندرجہ بالا معاہدوں کی شرائط کے مطابق، یہ معاہدے بدستور بخوبی قائم ہیں اور برطانوی حکومت اس وقت تک ایک مقررہ کرایہ دینے کی پابند ہے جب تک یہ علاقے برطانوی حکومت کے زیر انتظام ہیں۔

(ii) ان معاہدوں کی شرائط سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس ضمن میں کوئی ایسی خفیف سی دلیل بھی نہیں دی جا سکتی جس کے ذریعے یہ ظاہر ہو کہ قانونی اور اخلاقی لحاظ سے برطانوی حکومت متذکرہ علاقوں کی ریاست کو اس وقت تک واپسی کی پابند ہے جب تک وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اپنی طرف سے اس معاہدے پر عمل نہیں کر سکتی۔

(iii) اس امر کا اعادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پہلی اور اوّلین شرط جس پر اس معاہدے کا انحصار ہے، وہ یہ ہے کہ لیز پر دیا گیا علاقہ برطانوی حکومت کے زیر اہتمام رہے گا اور برطانوی حکومت کی طرف سے اس کا انتظام اس افسر یا افسروں کے ذریعے کیا جائے گا جنہیں اس مقصد کے لیے گورنر جنرل اِن کونسل کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے۔

(iv) یہ علاقے ملک معظم، خان کی ملکیت ہیں۔ ان علاقوں کو خان کی طرف سے برطانوی حکومت کو بعض شرائط پر لیز پر دیا گیا تھا۔ ان علاقوں کے متعلق معاہدہ صرف اور صرف برطانوی حکومت کے ساتھ طے پایا۔ اس لیے، برطانوی حکومت کے لیز پر دیئے ہوئے ان علاقوں سے دستبردار ہونے کے بعد، انصاف کا تقاضا یہی ہوگا کہ یہ علاقے خانِ قلات کو واپس دے دیئے جائیں جو ان کا قانونی مالک ہے۔ اس ضمن میں خان، برطانوی حکومت کی طرف سے اعلان کا بہت بے چینی سے منتظر ہے۔

5. جہاں تک 2(c)، اس قسم کے دیگر قبائلی علاقوں کے مستقبل کا تعلق ہے، میں نے عزت مآب

Scanned by CamScanner

چانسلر کو یہ بتایا کہ: ''یہ تمام علاقے بنیادی طور پر ریاستِ قلات کا باقاعدہ حصہ ہیں اور بعد ازاں ہم نے برطانوی حکومت کے ساتھ باہمی معاہدے کے ذریعے ان علاقوں کو انتظامی وجوہ کی بنا پر ریاست سے الگ کر دیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان علاقوں کے اکثریتی لوگوں کی خواہش ہے کہ کسی قسم کی ریاست قلات کی یونین قائم کی جائے جس میں ان کے علاقے بھی شامل ہوں۔ اس سے پہلے ہی کچھ مشہور سرداروں، یعنی مری اور بگتی سردار اور سردار میر جمال خان لغاری جو ڈیرہ غازی خان (پنجاب) کے لغاری قبائلی علاقے کے ترجمان ہیں، نے اس ضمن میں رسمی درخواست کے ساتھ خان کے ساتھ رابطہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ مری اور بگتی سرداروں نے اس سلسلہ میں ایک تحریر بھی پیش کی ہے کہ ملک معظم، خان، ان کے مستقبل کے متعلق ان کی رہنمائی کرے کہ ان کا بہترین مفاد خان کی زیر قیادت تمام بلوچی قبائلی یونین میں پوشیدہ ہے جسے پہلے ہی بلوچی وفاق کا سربراہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ نیز خاران اور لسبیلہ کی ریاستیں اس کی محکوم ہیں۔ خان، جس نے قبائلی سرداروں کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرنے کی حامی بھری ہے، دوستانہ مشورے کے لیے برطانوی حکومت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ خان، اس حقیقت سے بخوبی باخبر ہے کہ تمام بلوچی قبیلے، خواہ وہ ریاست قلات کے اندر رہتے ہوں یا باہر رہتے ہوں، متفقہ طور پر یہی چاہتے ہیں کہ ان کی قومی سلامتی اور وراثت محفوظ رہے اور اس طرح وہ ہندوستانی وفاق سے کسی بھی طرح باہر رہیں، نیز خانِ انتہائی شدت کے ساتھ یہ دیکھنے کا خواہش مند ہے کہ ان کے ساتھ ایسا رویہ اپنایا جائے جو انصاف اور فطری امنگوں کے مطابق ہو۔

6. یہ احوال، کم وبیش، عزت مآب شہزادگان کے چیمبر کے چانسلر کے ساتھ میری بات چیت کا نچوڑ ہے۔ عزت مآب نے، جو میری نظر میں ان تمام افراد سے کہیں زیادہ پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں جن سے ابھی تک میری ملاقات ہوئی ہے، اور جنہوں نے میری تمام عرضداشتوں کو نہایت غور سے سماعت کیا، سب سے پہلے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے ان تمام معاملات کے متعلق سر کورارڈ کورفیلڈ (Sir Corard Corfield) سے بات چیت کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے ان کے ساتھ اس بارے میں گفتگو تو کی لیکن زیادہ تفصیل کے ساتھ بات چیت نہیں کی۔ پھر انہوں نے نہایت ہی ہمدردانہ اور مہربانہ انداز میں مجھے بتایا کہ وہ قلات کی حیثیت کی مکمل طور پر پذیرائی کرتے ہیں، اور جس طرح میں نے بتایا، وہ خان کے موقف سے مکمل طور پر متفق ہیں۔ عزت مآب چانسلر نے مجھے کہا کہ خان کو یقین دلایا جائے کہ انہیں شہزادگان کے چیمبر کے چانسلر کی بھرپور ہمدردی و حمایت حاصل ہے اور رہے

Scanned by CamScanner

گی۔عزت مآب نے مجھ سے مزید کہا کہ میں انہیں ایک غیر رسمی خط لکھوں جس میں وہ سب کچھ تحریر کیا جائے جو میں نے انہیں زبانی بتایا ہے۔عزت مآب نے ریاستِ قلات کے اس موقف کی تعریف کی کہ یہ ریاست 1876ء کے معاہدہ کے تحت اپنی آزاد اور خودمختار حیثیت طے ہونے کی حیثیت سے کسی بھی سودابازی میں ملوث ہوئے بغیر شہزادگان کے چیمبر کی مذاکراتی کمیٹی کی طرف سے قانون ساز اسمبلی کے ساتھ کسی بھی رسمی مذاکرات میں ایک فریق کی حیثیت سے موجود نہیں ہوسکتی بلکہ یہ تجویز پیش کی کہ ملک معظم کو اس کی طرف سے قانون ساز اسمبلی کے ساتھ مذاکرات کے دوران غیر رسمی طور پر مطلع رکھا جائے۔میں نے عزت مآب کو بتایا کہ خان ایسا کر کے بہت خوش ہوں گے۔

7. تشکر کے جذبات سے بھرپور دل کے ساتھ میں واپس بھوپال لوٹا کیوں کہ عزت مآب نے بھوپال میں میرے دوروز قیام کے دوران میرے ساتھ نہایت ہی مہربان اور مشفق رویہ اپنایا تھا۔

8. میں ریاست قلات واپسی پر وہ خط تحریر کروں گا جو عزت مآب چانسلر نے مجھے لکھنے کا کہا تھا۔

آپ کا مخلص

محمد اسلم (دستخط)

گریفن صاحب، CSI,CIE,ICS L.C.L.

سیکریٹری، حکومت ہندوستان

پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ، نیو دہلی

(ماخذ: قائداعظم پیپرسیل، وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان، اسلام آباد)

(VI) ریاستِ قلات کی سیاسی حیثیت کے متعلق ایک قانونی ماہر کا تیار کردہ نوٹ جسے 19 مارچ 1947ء کو خانِ قلات کے قانونی مشیر، ایم اے جناح کو بھیجا گیا

میں نے برطانوی حکومت (فریق اوّل) اور ریاستِ قلات (فریق دوم) کے درمیان موجود تعلقات کے ضمن میں مختلف معاہدوں کی متعلقہ شقوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔

مزید برآں میں نے گریفن صاحب، سیکریٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ، حکومت ہند، نیو دہلی،

Scanned by CamScanner

کو لکھے گئے خط کے مندرجات بھی پڑھے ہیں۔ یہ خط نہایت ہی مناسب اور قابل فہم زبان پر مشتمل ہے جو خانِ قلات کی طرف سے تین اہم معاملات کو بیان کرنے کے لیے درکار ہے:

(a) برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں کو عنانِ اقتدار سونپنے کے بعد ہندوستان کے ساتھ خاص تعلقات کے حوالے سے ریاست کی دنیا میں آئندہ حیثیت کے علاوہ تعلقات کی موجودہ حیثیت اور ریاست کی طرف سے ان تعلقات کو برقرار رکھنے کا حق

(b) برطانوی حکومت کے ساتھ ملک معظم کے معاہدے کے ختم ہو جانے کے بعد کوئٹہ، نوشکی اور نصیر آباد کے لیز شدہ علاقوں کی ریاستِ قلات کو واپسی

(c) خاران اور لسبیلہ جیسے بلوچ قبائلی علاقوں، دو وفاقی ریاستوں، مری اور بگتی علاقوں، وغیرہ کا مستقبل

گریفن صاحب کو لکھے گئے مندرجہ بالا خط میں پہلے سے موجود مندرجات میں مزید اضافہ کرنے کے لیے میرے پاس سوائے درج ذیل نکات کے کوئی اہم مواد نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ نکات کا اس خط میں جزوی طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔ اس حتمی مراسلے یا میمورنڈم میں، بہ وقت ضرورت، وہ نکات بھی شامل کیے جا سکتے ہیں جو تجاویز کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں جن کے متعلق بالآخر فیصلہ ریاستِ قلات کے حکام کریں گے۔ یہ نکات جامع نوعیت کی بجائے تجاویز کی صورت میں ہیں۔

مختلف معاہدوں، خاص طور پر 1854ء اور 1876ء کے معاہدوں کی واضح شرائط اور شقوں کا جہاں تک تعلق ہے، جن کا باہمی تبادلہ کیا گیا اور جو دو آزاد اور خود مختار ممالک کی حیثیت سے برطانوی حکومت اور ریاست قلات کے درمیان تعلقات کی حتمی بنیاد ہیں، کے حوالے سے بغیر کسی شک وشبہ اور ابہام کے، درج ذیل موقف اختیار کیا جا سکتا ہے:

1. قلات، کبھی بھی افغانستان یا ایران کی نسبت ہندی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔
2. ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے قریب اس کی جغرافیائی حیثیت کے باعث یہ کسی بھی غیر ملک کی نسبت ہندی ہندوستان کا حصہ نہیں ہو سکتا۔
3. اس کے رسم و رواج، سماجی ادارے، زبان، تہذیب و ثقافت، سوچ اور طرزِ زندگی وغیرہ، کچھ بھی برطانوی ہندوستان یا ہندی ہندوستان جیسا نہیں۔
4. 1838ء سے ریاستِ قلات کی طرف سے گاہے گاہے کیے جانے والے معاہدے اور جن کی تجدید بھی ہوئی، جب برطانویوں کا ریاست کے ساتھ رابطے کا آغاز ہوا، یہ معاہدے حکومت ہند کی

Scanned by CamScanner

طرف سے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کی طرف سے طے کیے گئے جس کی نمائندگی عارضی طور پر ہندوستان میں موجود تاجِ برطانیہ کے نمائندے نے کی۔

5. یہ بھی حقیقت ہے کہ برطانوی حکومت کے خارجہ محکمہ کی بجائے ریاست قلات کے حکمرانوں کی طرف سے معاملے طے کرنے کے حوالے سے حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ رابطے کے باعث، ریاست قلات، ہندوستانی ریاست کا درجہ نہیں پاتی۔ برتر قوت کے ساتھ مختلف ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات کا تعین قطعی طور پر مختلف معاہدوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

6. اگر ریاست قلات کے ساتھ کچھ معاہدوں کی شرائط اور شقیں، ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ حکومت ہندوستان کے معاہدوں کی شرائط یا شقوں کی مانند معلوم بھی ہوتی ہوں تو پھر بھی اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ 1854ء اور 1786ء کے ان معاہدوں کے ذریعے ریاست قلات اپنی بنیادی حیثیت سے پیچھے ہٹ رہی ہے جو برطانوی حکومت اور ریاستِ قلات کے درمیان باہمی دوستانہ تعلقات اور اتحاد کی واحد بنیاد ہیں۔

7. اگر، جس طرح 16 مئی 1946ء کی برطانوی کیبنٹ وفود کی تجاویز کے پیرا 14 میں بیان کیا گیا ہے، ریاستوں کے حکمرانوں اور تاجِ برطانیہ کے درمیان موجودہ تعلقات ختم ہونے کی صورت میں ''تاجِ برطانیہ کی طرف سے حکمرانی برقرار رکھی جاسکتی ہے نہ ہی کسی نئی حکومت کو منتقل کی جاسکتی ہے''، اس ضمن میں ریاست قلات کا موقف سب سے زیادہ مضبوط ہوگا کہ اس کی بنیادی آزاد اور خودمختار حیثیت بحال کردی جائے۔ نیز اس کی یہ آزاد اور خودمختار حیثیت، برطانوی حکومت کے ساتھ گاہے گاہے کیے گئے معاہدوں کے باعث کسی بھی طرح متاثر نہیں ہوتی۔

8. جب ہندوستانی ریاستوں کو، جن کے تعلقات اس سے قبل تاجِ برطانیہ سے الگ الگ نوعیت کے حامل تھے، باہمی مذاکرات کے ذریعے حکومت ہندوستان سے اپنے تعلقات کے متعلق اپنے مرضی سے فیصلہ کرنے کا موقع حاصل ہوگا تو پھر ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے، قلات کو کسی بھی انصاف اور مساوات کے کسی بھی قانون کے تحت اپنی آزادی اور خودمختاری سے محروم ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

9. ریاستی معاہدوں اور حاکمیت (22 مئی 1946) کے ضمن میں برطانوی حکومت کے وفود میمورنڈم میں شامل برطانوی حکومت کا اعلان کہ ''برطانوی حکومت کسی بھی صورت میں اپنی حاکمیت کسی

Scanned by CamScanner

بھی ہندوستانی حکومت کو اپنی حاکمیت منتقل کرسکتی تھی نہ ہی منتقل کرے گی۔ نیز اپنے میمورنڈم کے پیرے 5 میں وفد کی طرف سے بیان کیے خدشات کہ ملک معظم کا کسی بھی آزاد حکومت یا ہندوستانی حکومت یا وہ حکومت یا برطانوی ہندوستان میں قائم ہونے جارہی ہے، اس پر اثر ورسوخ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ حکمران حکومت کے احکامات کو ماننے پر مجبور ہو، نیز ریاستوں کی طرف سے برتر حکومت کو سونپے جانے والے اختیارات ریاستوں کو واپس سونپ دیئے جائیں گے، اس طرح ریاستوں (فریق اوّل) اور تاجِ برطانیہ کے علاوہ برطانوی ہندوستان (فریق دوم) کے درمیان سیاسی معاہدات ختم ہوجائیں گے اور یوں قلات کی طرف سے اپنی حیثیت کے متعلق اپنا دعویٰ اور موقف فوراً ہی مبنی برانصاف اور معقول ہوگا۔

(ماخذ: قائداعظم پیپرسیل، وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان، اسلام آباد)

(VII) سر والٹر مونکٹن (Sir Walter Monckton)

کی طرف سے قانونی رائے (5 جون 1947ء)

اس سلسلے میں دو میمورنڈم مدنظر رکھنے کا کہا گیا اور میں انہیں علیحدہ علیحدہ زیرِغور لاؤں گا۔

A. حکومت قلات کا میمورنڈم۔ کوئٹہ، نوشکی اور نصیرآباد کی واپسی:۔

کوئٹہ، نوشکی اور نصیرآباد کی واپسی کے متعلق سر سلطان احمد کا تیار کردہ اور سردار ڈی کے سَین کی طرف سے دستخط شدہ میمورنڈم کا زیادہ تر تعلق اس سوال سے ہے کہ کیا قانون کے مطابق خانِ قلات، متذکرہ علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اس کا بالآخر یہ نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے کہ کیا وہ معاہدے جن کے تحت ان علاقوں کے انتظام وانصرام کے اختیارات دوسری حکومت کو سونپے گئے، لیز کے قانون کے تحت آتے ہیں یا نہیں کیوں کہ معلوم ہوتا ہے کہ پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کا یہی خیال ہے، جیسا کہ Secretary of State V Sardar Rustam Khan (1941)A.C.356 میں فیصلہ دیا گیا۔ ہر مقدمے/معاملے میں ایک خاص شرط یہ عائد کی گئی تھی کہ ضلع کا انتظام برطانوی حکومت کی طرف سے اس مقصد کے لیے گورنر جنرل اِن کونسل کی طرف سے مقرر کردہ افسر کے ذریعے کیا جائے گا۔ مجھے سر سلطان احمد اور سردار ڈی ایم سَین کے اس موقف سے اتفاق ہے کہ

Scanned by CamScanner

اسی شق کے ذریعے ہی اس امر کا تعین ہوتا ہے کہ کیا یہ علاقے ذاتی لحاظ سے برطانوی حکومت کو لیز پر دیئے گئے، نیز ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اختتام پر خانِ قلات کی طرف سے برطانوی حکومت کو سونپے دیے علاقوں کے اختیارات واپس لینے کا حق ہے۔ اس شق کی اہمیت پر، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، معاہدۂ کوئٹہ (1833ء) کے معاملے پر زور دیا گیا اور اس حقیقت کی طرف توجہ دی گئی ہے کہ مفادات کے تجربے کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ جب تک متذکرہ ضلع اور نیابت کا انتظام برطانوی حکومت کی طرف سے کیا جاتا رہے گا، کوئٹہ کے ضلع اور نیابت کا انتظام خاص طور پر برطانوی حکومت کے افسران اور معاہدے کی شق 1(3)، جس کے تحت ملک معظم کو 25,000 روپے کی ادائیگی کی جانی تھی، کے ذریعے کیا گیا۔ جن نکات پر ابھی زور دیا گیا ہے، اگرچہ 1899ء کے نوشکی معاہدے یا 1903ء کے معاہدۂ نصیرآباد میں انہی نکات کا اعادہ کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی موخرالذکر دونوں معاہدوں میں برطانوی حکومت کی طرف سے انتظام کی یہی شق بیان کی گئی ہے، یہ وہی زبان ہے جو 1833ء کے معاہدۂ کوئٹہ میں پائی گئی، کے ذریعے وہی نتائج برآمد ہونا چاہئیں۔

اس نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہ خانِ قلات کو مضبوطی قانونی بنیادوں پر یہ حق حاصل ہے کہ اس کی طرف سے برطانوی حکومت کے حوالے کیے گئے اختیارات اور حقوق کی واپسی کا تقاضا اور مطالبہ کیا جائے، اس کے بعد میرے مدنظر معاملہ یہ ہے کہ اس حق کا نفاذ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ یہ قانون کے مطابق ہو۔ مزید برآں، مجھے اس میمورنڈم کے متعلقہ حکام جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا، سے مشاورت کا موقع حاصل ہوا اور میں اس امر سے متفق ہوں کہ اس وقت اختیارات اور حقوق کی واپسی ہی نہیں بلکہ ان کی عملاً واپسی کا اعلان درکار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میمورنڈم میں حقوق کی عملاً واپسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مرحلے پر یہ کافی ہوگا کہ اگر برطانویوں کی طرف سے اس ضمن میں اعلان سامنے آجاتا اور برطانوی ہند میں نئی حکومت یا حکومتوں کو انتقالِ اقتدار سے قبل اس حوالے سے عملی قدم اٹھالیا جاتا۔

میں، میمورنڈم میں زیرغور لائے گئے ان نکات کے متعلق نہایت قطعیت کے ساتھ اپنی ماہرانہ تجویز دے سکتا ہوں جن کے متعلق میں ان کے تیارکنندگان کے ساتھ پہلے ہی گفتگو کر چکا ہوں۔ مجھے ان تجاویز سے کسی بھی طور اختلاف نہیں کرنا چاہیے جن کے متعلق دستاویزات دستیاب ہیں، لیکن میرے پاس متذکرہ علاقے کی سیاسی حیثیت کے متعلق معلومات نہیں ہیں تاکہ میں اپنی طرف سے کسی کارآمد رائے کا اظہار کرسکوں کہ میرے کہنے کے مطابق ایک مضبوط قانونی موقف سے کس طرح زیادہ

Scanned by CamScanner

سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

B. قلات وغیرہ کی آئندہ حیثیت کے متعلق حکومت قلات کا میمورنڈم

i. جہاں تک پہلے نکتے یعنی قلات کی آئندہ حیثیت کا تعلق ہے، یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔ یہ سوال 1844ء اور 1876ء کے معاہدات اور برطانوی ہندوستان میں اختیارات کے مکمل واپسی کے حوالے سے ایک درست سوال کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

اس مرحلے پر اس نکتے کی ہیت پر غور کرنا ہوگا جس کے تحت ''برطانوی حکومت کے ساتھ ایک ماتحت معاونت کی ذمہ داری نبھانے'' اور اس کی مرضی کے بغیر دیگر حکومتوں کے ساتھ کوئی بھی مذاکرات نہ کرنے کا کہا گیا تھا۔ یہ نکتہ پہلی بار 1854ء کے معاہدے کی شق 3 میں شامل کیا گیا۔ 1876ء کے معاہدے میں یہ ذمہ داریاں (شق 3 کی رُو سے)، برطانوی حکومت کی طرف سے قلات کی آزادی اور خودمختاری کا احترام کرنے کے وعدے سے منسلک کی گئی ہیں۔ میرا یہ بھی خیال نہیں کہ 1876ء کے معاہدے کی شق 5 کے ذریعے یہ حیثیت تبدیل کی جاسکتی ہے جس کے مطابق خان، اپنے اور اپنے سردارانِ قلات کے درمیان جھگڑوں کے فیصلے کے لیے برطانوی حکومت کی ثالثی کے لیے رضامند ہوگیا تاکہ ملک کا امن متاثر نہ ہو۔ میری مزید رائے یہ ہے کہ میمورنڈم کے پیرا 12(2) میں موجود نتیجے کے مطابق، برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدے کی منسوخی کے باعث ریاست قلات، معاہدے سے قبل اپنی مکمل آزادی حالت پر واپس آجائے گی، نہایت ہی مستند ہے۔ اس قسم کی آزادی کے سامنے واحد رکاوٹ کا، جس آزادی کی (جس طرح میں نے اوپر ذکر کیا ہے) 1876ء کے معاہدے میں توثیق کی گئی ہے، بذاتِ خود ان معاہدوں کی شقوں میں ذکر موجود ہے۔

میرے خیال کے مطابق، سر ہنری مین نے خودمختاری اور آزادی کے درمیان تعلق کو 1864ء میں کاٹھیاواڑ (جس کے متعلق Eddy and Lawton's India's New Constitution, 2nd impression, 1935, page 21) نہایت درست طور پر بیان کیا گیا ہے): ''خودمختاری ایک ایسی اصطلاح ہے جو بین الاقوامی قانون کے مطابق اختیارات اور حقوق کے ایک علیحدہ مجموعہ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ حقوق جو حقوق کا مجموعہ تشکیل دیتے ہیں، ان کو ماہرین جنگ کرنے اور امن برقرار رکھنے، دیوانی اور فوجداری انصاف مہیا کرنے اور قانون سازی کرنے وغیرہ کے امتیازی حقوق کا ایک خاص نام دیتے ہیں۔ ایک خودمختار فرد اور حکومت، جس کے پاس یہ تمام حقوق ہوتے ہیں، اسے آزاد اور خودمختار حکومت

Scanned by CamScanner

کہا جاتا ہے، لیکن کوئی بھی بین الاقوامی قانون ابھی تک ان حقوق کے حامل فرد یا کسی دیگر فرد کو اپنے ان حقوق سے دستبرداری سے روک سکا ہے نہ ہی روک سکتا ہے۔ خودمختاری کو ہمیشہ سے ہی قابل تقسیم سمجھا جاتا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ امر بھی قابل مشاہدہ ہو کہ جدید ماہرین کی زیادہ واضح زبان میں ''خودمختاری'' کی بنیاد معاشرہ ہے جب کہ آزادی کی بنیاد معاشرہ نہیں۔ اگرچہ ''جزوی آزادی'' کی اصطلاح نہایت ہی مقبول انداز میں استعمال ہو سکتی ہے لیکن یہ تکنیکی لحاظ سے غلط ہے۔ یوں، ہندوستان میں خودمختاری کی ہر شکل موجود ہے لیکن یہاں واحد خودمختار آزاد حکومت، برطانوی حکومت ہے۔'' میرے نزدیک، فیصلوں کے اہم ترین نتائج جو حاکم حکومت کسی بھی حکومت پر نافذ نہیں کرے گی جو برطانوی حکومت کے بعد قائم ہوگی، نیز تاجِ برطانیہ کی طرف سے ان معاہدوں کی خاموش منسوخی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ (a) جہاں خودمختاری، برطانوی حکومت اور ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان تقسیم ہو، اور وہ حقوق جو برطانوی حکومت کے پاس ہوں، کسی دیگر حکومت کو منتقل نہیں ہوں گے بلکہ حکمرانوں کو واپس مل جائیں گے۔ (b) یہ بھی کہ جو حکمران ماضی میں برطانویوں کے ماتحت تھا، اپنی آزادی اور خودمختاری دوبارہ حاصل کر لے گا۔

نسلی جغرافیے، زبان، جغرافیے اور تاریخ کی بنیاد جس کا ذکر خاص طور پر میمورنڈم کے پیرے 7-10 میں موجود ہے، اس کے متعلق اپنی ماہرانہ رائے سے قاصر ہوں، لیکن ان میں سیاسی نہیں بلکہ قانونی امور شامل ہیں اور اس نتیجے کو متاثر نہیں کر سکتے جو میں نے اوپر بیان کیا۔ بہرحال، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ

a) میں پیرا 11 میں شامل اس نتیجے سے متفق ہوں کہ قلات، ہندوستانی ریاست نہیں؛ اور

b) کہ برطانویوں کی حاکمیت ختم ہو جائے گی اور ان کی رخصتی کے بعد کسی بھی طرح ان کی حاکمیت کا کوئی بھی اثر باقی نہیں رہے گا،

ii. جہاں تک لسبیلہ اور خاران یا مری اور بگتی قبیلوں کا تعلق ہے، میں ان کے متعلق دعووں کے استحقاق کے حوالے سے کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں۔

سر والٹر مونکٹن (دستخط)

نئی دہلی۔ مورخہ 5 جون، 1947ء

(ماخذ: IOR: L/P+S/13/1847)

Scanned by CamScanner

(VIII) اعلامیہ بتاریخ 11 اگست 1947ء

قلات کے ایک وفد کی پاکستان کے محکمہ خارجہ کے حکام سے ملاقات کے نتیجے میں جس کی صدارت تاجِ برطانیہ کے نمائندے نے کی، اس کے علاوہ تاجِ برطانیہ کے نمائندے اور ملک معظم خانِ قلات اور جناح صاحب کے درمیان مختلف ملاقاتوں کے بعد درج ذیل امور سامنے آئے:

1. حکومت پاکستان، قلات کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست تسلیم کرتی ہے اور برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے تعلقات کے حوالے سے اسے ہندوستانی ریاستوں سے مختلف سمجھتی ہے۔
2. اس ضمن میں قانونی رائے طلب کی جائے گی کہ کیا برطانوی حکومت اور قلات کے درمیان لیز کے معاہدے اب پاکستان کو منتقل ہو جائیں گے۔
3. اس ضمن میں قانونی رائے وصول ہونے کے بعد، پاکستانی نمائندوں اور خانِ قلات کے درمیان کراچی میں مزید ملاقاتیں ہوں گی۔
4. دریں اثنا، کراچی میں پاکستان اور قلات کے درمیان ''جوں کی توں صورتِ حال'' کا ایک معاہدہ طے پا چکا ہے۔
5. کراچی میں پاکستان اور قلات کے درمیان دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کے متعلق کسی بھی فیصلے پر پہنچنے کے لیے کسی بھی اوّلین تاریخ کو مذاکرات ہوں گے۔

(ماخذ: IOR L/P+S/13/1843 and 1846)

(IX) دولت مشترکہ کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں وزیر مملکت کی طرف سے تیار کردہ خفیہ میمورنڈم سے اقتباس (12 ستمبر 1947ء)

''ریاستِ قلات کی طرف سے آزادی اور خودمختاری کے دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے اور کوئٹہ کے علاوہ دیگر علاقوں کی لیز کے متعلق تاجِ برطانیہ کے نمائندے اور قلات کے درمیان طے پانے والے گزشتہ معاہدوں پر عملدرآمد کے تناظر میں، پاکستان نے قلات کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا ہے جو بہ صورتِ دیگر آزادیٔ ہند کے قانون کی شق 7(I)(6) کے تحت زائد المیعاد ہو جاتے۔ یہ معاہدے بین الاقوامی نوعیت کے حامل ہیں جو خانِ قلات کی حاکمیت کی منسوخی سے قطعی طور پر آزاد ہیں اور جن کی

Scanned by CamScanner

سرحدیں ایران کے ساتھ ملتی ہیں، اور وہ بلاشبہ اس حیثیت کے مالک نہیں کہ وہ ایک آزاد ملک کی بین الاقوامی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ نیز لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جنہیں انتقالِ اقتدار سے قبل اس قسم کے حالات پیدا ہونے کے خطرے سے خبردار کر دیا گیا تھا اور اس تنبیہ سے حکومت پاکستان کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا۔ پاکستان میں موجود دولت مشترکہ کے ہائی کمشنر کو اس حالت سے مطلع کیا جا رہا ہے اور ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ وہ قلات سے معاہدہ کرنے کے علاوہ پاکستان کی کس طرح رہنمائی کر سکتے ہیں جو بذاتِ خود بین الاقوامی طور پر ایک آزاد اور خود مختار حیثیت کا دعوے دار ہے۔''

(ماخذ: IOR L-P+S/13/18146)

(X) خانوں کے دربار میں برطانوی ریزیڈنٹس کی فہرست (1887-1947ء)

نام	عہدہ سنبھالنے کی تاریخ	تبصرہ
کرنل سر آر جی سنڈیمن K.C.S.I	19 جون 1887ء	29 جنوری 1892ء کو وفات ہوئی
کرنل سر او بی سی سینٹ جان K.C.S.I	19 جون 1887ء	برسرِ عہدہ
وی سی جنرل سر ایچ این پرنڈر کواسٹ، K.C.B.,R.E	3 اپریل 1889ء	8 اکتوبر 1889ء تک فرائض انجام دیئے
ایچ ایس بارنز	23 اپریل 1891ء	8 مئی 1891ء تک فرائض انجام دیئے
ایچ ایس بارنز	5 جون 1891ء	9 جولائی 1891ء تک فرائض انجام دیئے
کرنل جے بدلف	10 جولائی 1891ء	16 نومبر 1891ء تک فرائض انجام دیئے
ایچ ایس بارنز	30 جنوری 1892ء	16 نومبر 1891ء تک فرائض انجام دیئے

Scanned by CamScanner

میجر جنرل سر جے براؤنی K.C.S.I.,C.B.,R.E	24 مارچ 1892ء	13 جون 1896ء کو کوئٹہ میں وفات پائی
جے اے کرافورڈ	14 جون 1896ء	14 نومبر 1896ء تک فرائض انجام دیئے
ایچ ایس بارنز	15 نومبر 1896ء	8 اکتوبر سے 8 دسمبر 1892ء تک فرائض انجام دیئے
کرنل ایچ وائلی C.S.I.	12 اپریل 1899ء	21 دسمبر 1899ء تک فرائض انجام دیئے
کرنل سی ای یٹ C.S.I.,C.M.G	20 نومبر 1900ء	قائم مقام۔24 دسمبر 1900ء کو مستقل اور 31 اکتوبر 1900ء کو ریٹائر
اے ایل پی ٹکر C.I.E.	3 جنوری 1905ء	2 اپریل 1907ء تک فرائض انجام دیئے
میجر سر اے ایچ میکموہن، K.C.I.E	2 اپریل 1907ء	
لیفٹیننٹ کرنل آر جے C.I.E.	3 جون 1909ء	6 ستمبر 1909ء تک فرائض انجام دیئے
لیفٹیننٹ کرنل جے ریمزے، C.I.E.	25 اپریل 1911ء	
لیفٹیننٹ کرنل سی آر جے۔C.I.E.	21 اکتوبر 1912	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل جے ریمزے، C.I.E.	14 نومبر 1912ء	
لیفٹیننٹ کرنل آر جے، C.I.E.	2 اپریل 1914ء	
لیفٹیننٹ کرنل جے ریمزے، C.I.E.	23 مئی 1914ء	

Scanned by CamScanner

لیفٹیننٹ کرنل آر جے، C.I.E.	15 جون 1915ء	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل جے ریمزے، C.I.E.	5 جولائی 1915ء	
سر ایچ آر سی ڈوبز، K.C.I.E	5 دسمبر 1917ء	
کرنل اے بی ڈیو، C.S.I.,C.I.E.	یکم ستمبر 1919ء	
ایف ڈبلیو جانسٹن، C.S.I.	15 ستمبر 1923ء	
لیفٹیننٹ کرنل ای ایچ ایس جیمز	7 جولائی 1926ء	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل ایچ بی سینٹ جان، C.I.E.,C.B.E.	4 نومبر 1927ء	
لیفٹیننٹ کرنل آر ایچ ایس جیمز C.I.E.,C.B.E.	2 جون 1929ء	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل سی ای بروس، C.S.I.C.I.E.,C.B.E	29 اکتوبر 1930ء	برسر عہدہ
اے این ایل کیٹر، C.I.E.	17 دسمبر 1931ء	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل جے اے بریٹ C.I.E	10 مئی 1932ء	قائم مقام
آر ای ایل ونگیٹ، C.I.E.	20 جون 1937ء	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل اے ای بی پارسنز، C.B.E.	18 اپریل 1938ء	برسر عہدہ
آر ای ایل ونگیٹ، C.I.E.	20 جون 1937ء	برسر عہدہ
او کے کیرو، C.I.E.	28 نومبر 1937ء	برسر عہدہ
لیفٹیننٹ کرنل اے ای بی پارسنز، C.B.E.,C.S.I.	14 مارچ 1938ء	

Scanned by CamScanner

سر ایچ اے ایف میٹکالف، 11 اگست 1939ء

M.V.O.، C.S.I.، K.C.I.E

لیفٹیننٹ کرنل ڈبلیو آر ہے، C.S.I. 24 نومبر 1943ء

لیفٹیننٹ کرنل ایچ ایم پولٹن، C.I.E. 14 مئی 1946ء

سر امبروز ڈیونڈس 1947ء

Scanned by CamScanner

حوالہ جات/حواشی

(حصہ اوّل)

باب1

(1)مائرون ویز (Myron Weiner)، Political Integration and Political Development,The
Annals، جلد38، مارچ1965، صفحہ 52-64

(2)جان ایس مِل(John S.Mill)، Consideration of Representatives

(3) جان ایس مِل (John S.Mill)، Consideration of Representative
Government، صفحہ2910292

(4) جوزف آر سٹرئیر(Joseph R.Strayer)، The Historical Experience of Nationa Building
National-Building، in Europe,in Karl W Deutsch and W.J.Foltz، صفحہ4

(5) اے کوبان(A.Cobban)، National Self Determination، صفحہ4

(6) بیریکٹ ایچ سیلاسی(Bereket H.Selassie)، Evolution of the Principle
of Self Determination,Horns of Africa، اکتوبر، دسمبر1978، صفحہ4

(7) ای ایس لینٹ(E.S.Lent)، American Foreign Policy and the Principle of Self
Determination، صفحہ133

(8) جے سیکسینا(J.Sexana)، Right of Self Determination، صفحہ2

(9)ایضاً

(10) جے سیکسینا(J.Sexana)، Right of Self Determination، صفحہ2

Scanned by CamScanner

(11) ایضاً

(12) ہینز کوہن(Hans Kohn)، Nationalilsm، صفحہ 1

(13) کے ڈبلیو ڈوشے(K.W.Deutsch)، Nationalislm and Social Communisim، صفحہ 88

(14) امریکی اعلانِ آزادی، 1976ء

(15) سیکسینا(Sexena)، صفحہ 3

(16) کارل مارکس، The First International and After Political Writings، جلد 3، صفحہ 93

(17) Marks and Engels.Selected Works۔ جلد 1، صفحہ 51، تفصیل کے لیے دیکھئے: Marx and Engles.Ireland and the Irish Question and Marks and Engles.On Coloninialism

(18) مائیکل لووی(Michael Lowy)، Marxism and the National Question in Robin Blackburn,Revolution and Class Struggle, صفحہ 139-140

(19) ایضاً

(20) وی آئی لینن(V.I.Lenin)، Critical Remarks on the National Question,The Right of Nations to Self Determination، صفحہ 70

(21) ایضاً

(22) وی آئی لینن(V.I.Lenin)، Critical Remarks on the National Question,The Right of Nations to Self Determination، صفحہ 72

(23) وی آئی لینن(V.I.Lenin)، مشرق میں تحریک آزادی، صفحہ 233

(24) وی آئی لینن(V.I.Lenin)، مشرق میں تحریک آزادی، صفحہ 236

(25) ایضاً، صفحہ 237

(26) Xenia-Joukoff Eudin and Robert C.North,Soviet Russia and the East، صفحہ 64-65

(27) وی آئی لینن(V.I.Lenin)، صفحہ 323-324

(28) G.Bondarevski,"Bolshevik Policy and the People of the East", Mainstream, December 3, 1977, صفحہ 34

Scanned by CamScanner

(29) Brian Pearce(Translated and Annotated),Baku.Concept of the People of the East، صفحہ 174

(30) جے وی سٹالن(J.V.Stalin)، Marxism and the National Question, Collected Work، جلد2، صفحہ 300-381

(31) جے وی سٹالن، The Foundation of Leninism، صفحہ 77-78

(32) چینگ کائی ہوئی، Chin meen Quma Sawal، صفحہ 134-135، اس کے علاوہ، فی ہسائیونگ Towards a People's Anthropolgy، اور ایچ بی۔ڈیوس، The National Question بھی ملاحظہ کیجئے۔

(33) ایچ بی ڈیوس، The National Question، صفحہ 38

(34) وی آئی لینن، The National Liberation Movement in the East، صفحہ 109، مصنف نے A.R.Ghassemlou,Kurdistan and the Kurds، باب XII، سے مدد حاصل کی۔

(35) جان ای ای ڈی، Action,Essay on Freedom and Power، صفحہ 144-146 اور جی ای فشنیشٹ، Action's Political Philosophy، صفحہ 126-139

(36) جے این سیکسینا(J.N.Sexana)، صفحہ 3

(37) ایضاً، صفحہ 4

(38) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: The Secretariat of the International Commission of Jurists, The Events in East Pakistan,1971، حصہ پنجم

باب2

(1) آر این فرائی(R.N.Frye)، "Baluchistan"، The Encyclopaedia of Islam، جلد1، صفحہ 1005

(2) Encycloapaedia Britannica۔ جلد2، صفحہ 8

(3) جی این کرزن، Persia and the Persian Question، جلد2، صفحہ 255

(4) اے ڈبلیو ہفز، The Country of Baluchistan، صفحہ 2

(5) ایل ڈیمز(L.Dames)، The Baluch Race، صفحہ 1-2

Scanned by CamScanner

(6) جے سی ڈیوس، The Problems of the North-West Frontier، صفحہ 4

(7) جارج ایچ ریوٹری، Notes on Afghanistan and Baluchistan، صفحہ 1

(8) سجن رائے بٹالوی، Notes on Afghanistan and Baluchistan، صفحہ 42

(9) میر احمد یار خان بلوچ، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 45

(10) تھامس ایچ تھارنٹن، کرنل سر رابرٹ سنڈیمن، صفحہ 41

(11) کیپٹن آر جی سنڈیمن کا خط مورخہ 10 اپریل 1872، نمبر 299 بلوچستان نمبر 1، صفحہ 252-253

(12) ذبیح اللہ نصیح، بلوچستان، صفحہ 18

(13) محمد سردار خان بلوچ، History of the Baluch Race and Baluchistan، صفحہ 282

(14) انیسویں صدی کے اواخر میں لارڈ کرزن (Lord Curzon) کی طرف سے خورستان (ایران) کے متعلق بیان کردہ

(15) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد 2، صفحہ 4-3، نقشہ نمبر 121 بھی دیکھئے۔

(16) ایڈورڈ ویکفیلڈ (Edward Wakefield)، Past Imperative، صفحہ 98

(16) میر احمد یار خان بلوچ، Inside Baluchistan، صفحہ 255-311، IOR-L.P+S/13/1847

(17) ملک سعید دہوار، بلوچستان ماقبل تاریخ، صفحہ 304، میں احمد حسن دانی کا پیش لفظ

(18) رچرڈ ڈبلیو کوٹم (Richard W.Cottam)، Nationalism in Iran، صفحہ 24

(19) پرسی ایم سکائیکس، Ten Thousand Miles in Persia، صفحہ 98

(20) IOR-v37(1840)- اور آغا سلطان ابراہیم، میر مہراب خان (الحسنیف) سالنامہ، جیکب آباد، 1937

(21) Imperial Gazetteer of India, Provincial Series, Baluchistan,- صفحہ 53-57

(22) محمد حسین عنقا کے ساتھ انٹرویو

(23) ایضاً

(24) ایضاً

(25) ''قنات'' (Qanat) کی اصطلاح مغربی بلوچستان اور سابقہ ریاست قلات میں استعمال ہوتی ہے

Scanned by CamScanner

جب کہ 'کاریز'(Karez) کی اصطلاح، ڈیرہ جاٹ اور پاکستان وافغانستان کے پشتون علاقوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

(26) چرن جی لال، تواریخ ڈیرہ اسماعیل خان، صفحہ 6-7

(27) H.T. Lambrick, John Jacob of Jacobabad,pp.408-409. The term"raider","uncivilised"and several other words were used against the freedom fighters in order to justify the British invasion.

(28)In administrative Baluchistan, the Pastuns of "British Afghanistan"were included. Their number were 214,517,and the aliens(European and Anglo-Indian)numbered 17,441. See Denis Bray, Census of India 1911, vol.IV, Baluchistan,pp.46-57.See also Mir Khuda Bakhsh Bijrania, Searchlights Lights on Baloches and Balochistan, pp.15-24, and Government of India, North West Frontier, Census 1911.

(29) مولوی شیدی، بلوچستان کی مختصر تاریخ، صفحہ 123

(30) میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ، Searching Lights on Baluch and Baluchistan، صفحہ 15-24

(31)A telegram from Muhammad Yousaf Ali Manassi to Sir Samuel Huane, India Office, London. The telegram was received on January 5, 1933, in IOR,L/P+S/12/3174

(32) مصنف کے ساتھ محمد حسین عنقا کا انٹرویو، اپریل 1976 بمقام مچھ، بلوچستان

(33) مغربی بلوچستان کے لیے قابل اعتماد مردم شماری دستیاب نہیں کیوں کہ ایران نے بلوچ مخالف پالیسی اپنا رکھی تھی۔

(34) جنرل مونی(General Money) کا میمورنڈم، (غیر مطبوعہ)

(35) مینیک بی پتھاوالا، The Problem of Baluchistan، صفحہ 3-4

(36) فیرنیس اے والی، Politics of the Indian Occean region، صفحہ 111-112 اور IOR.L/P+S/18/A 145

(37) سیلیگ ایس ہیریسن، In Afghanistan's Shadow، صفحہ 1-5

(38)Telegram No.15, dated June 9, 1928, from the British Consulate to the British

Scanned by CamScanner

Charge d'Affairs,Tehran,IOR L/P+S/10/1136.

(39) جنرل مونی(General Money) کا میمورنڈم، (غیر مطبوعہ)

(40) ٹی سی کوئن، The Indian Political Service، صفحہ 147 اور مصنف کے ساتھ جناب فیل کا ٹیپ شدہ انٹرویو

(41) سی یو ایچی سن (C.U.Aitchison)، A Collection of Treaties,Engagements and Sands، جلد XIII اور XI (اس کتاب میں معاہدات کے متن دستیاب ہیں)

(42)Rahman Pazwak,Pakhtunistan,p.7.See also Afghanistan Information Bureau, Pakistan Question, p.15

(43)Rahman Pazwak,Pakhtunistan,p.7.See also Afghanistan Information Bureau, Pakistan Question, p.139,and Leon B. Pollada"Pushtunistan", in a Embree(ed)Pakistan's Western Borderlands, pp.126-151.7)C.U.Aitchison op.cit.vol:XI,p.352.

(44) ای سمتھ، The Perso-Baluch Frontier(1870-1871)(جان لاوٹ اور سمتھ، Eastern Persia، صفحہ 145-223

(45) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 67

(46)-IOR.L/P+S/18/C 60 A

(47)-IOR.L/P+S/18/C60A

(48)-IOR.L/P+S/18/C60A

(49)-IOR.L/P+S/18/C60A

(50)-IOR.L/P+S/18/C60A

(51)-IOR.L/P+S/18/C60A

(52) خانِ قلات کے ساتھ انٹرویو

(53) ایچی سن، صفحہ 371

(54) ایضاً، صفحہ 381

Scanned by CamScanner

(55) قلات میں برطانوی ریزیڈنٹ کی ڈائری نمبر 9، مورخہ 20 اپریل 1872، صفحہ 239، اور کرنل ای آر۔ ایلس، The Military Geography of Afghanistan-Farah and Kandhar، صفحہ 12

(56) تھامس ایچ تھارنٹن (Thomas H.Thornton)، کرنل سر رابرٹ سنڈیمن (Col.Sir Robert Sandeman)، صفحہ 256-257

(57) کرنل ای آر ایلس، صفحہ 12 اور حسن خان کاکڑ،

Government and Society in Afghanistan,p.65.Kakar does not give a picture of the political status of Chakansur and regards Seistan as a "frontier area"of the Amir of Kabul.

(58) ایچی سن، جلد XIII، صفحہ 262-268

(59) خط نمبر 116، سردار ایم امین خان ناروئی (Sardar M.Amin Khan Nauroi) کا برطانوی قونصلیٹ (British Consulate) کے ساتھ انٹرویو، زابل (سیستان)، 28 دسمبر 1940

(60) IOR L/P+S/18/C208۔

(61) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 261-262

(62)The representation of the Baluch delegates in the Baluchistan and British Conferences was aimed to rejecting the Perso-Baluch frontier of the devision of Baluchistan

(63) ہفتہ وار ''البلوچ''، 20 اگست 1933، نقشہ نمبر IV دیکھیے۔

(64) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، صفحہ 432 اور کہکشان بلوچ، اوّلین بلوچ قائد یوسف خان مگسی (بلوچ دنیا)، مئی 1971، صفحہ 38

(65) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: Muhammad Panahiuyan، Farhang Gaughrafiyai Milli Baluchistan

(66) کرنل ای آر ایلس، صفحہ 12

(67) IOR L/P+S/13/1847۔ مزید تفصیل کے لیے ساتواں باب ملاحظہ کیجیے۔

(68) ایضاً

Scanned by CamScanner

(69)۔IOR L/P+S/12/2985 اور IOR R/3/1/166، نیز نواں باب ملاحظہ کیجئے۔

(70) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 190

(71) پانچواں باب ملاحظہ کیجئے۔

(72) تھامس، صفحہ 168

(73) این پی گرانٹ، Western Parts of Makran,J.R.A.S، جلد پنجم (1839)، صفحہ 328-341

(74)۔IOR L/P+S/18/C208 اور عنایت اللہ بلوچ،

"Afghanistan, Pashtunistan and Baluchistan" in Aussen Politic",3, Quartal 1980, صفحہ 294

(75) کرنل ای آر ایلس، صفحہ 12

(76) IOR.L/P+S/12/2985۔

(77) IOR.L/P+S/12/3174۔

(78) ایس۔ایم علوی (S.M.Aliyev)

"The Problem of Nationalism in Contemporary Persia", Kratiye Soobshcheniya Institute Narodov Azii, No.77, 1964

(79) کہکشان بلوچ، اوّلین بلوچ قائد نواب یوسف علی خان مگسی، بلوچی دنیا، مئی 1971ء، صفحہ 38

(80) اقلیتی اقوام درج ذیل ہیں: سندھی جاموٹ۔لسبیلہ، پشتون۔کوئٹہ، سندھی، جٹ، کوئٹہ، فارسی بولنے والے تاجک اور دہوار سیستان اور مستونگ۔

(81) میر احمد یار خان بلوچ، تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ، صفحہ 30-29 اور میر گل خان نصیر، جلد اوّل، صفحہ 12-11 اور اسی مصنف کے قلم سے ''کوچ و بلوچ''، پہلا باب

(82) اے جی جی بلوچستان کی طرف سے ایکسپریس برقی تار 27 اپریل 1932

(83)۔IOR R/1/34/57

(84) ممتاز بروہی النسل رہنماؤں میں میر عبدالعزیز کرد، میر غوث بخش بزنجو اور پرنس عبدالکریم شامل تھے/ہیں۔بیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 11-10

(85) ہفتہ وار ''پنجابی مسلمان''، صفحہ 5 اور مولانا نور احمد خان فریدی، بلوچ قوم اور اس کی

Scanned by CamScanner

تاریخ، صفحہ 42-43

(86) ایچ ایچ ریسلے (H.H.Risley)، ہندوستان کی مردم شماری 1901ء، جلد اوّل، Ethnographic Appendices، صفحہ 66

(87) برائن سپونر، Nationalism in Baluchistan، ایل ایس لیشنک اور ای سنودیریم

(88) ای موکلر، Origin of the Baluch اور جے اے ایس بینکوئل، صفحہ 30-36

(89) لانگ گورتھ ڈیمز (Longworth Dames)، Baluch Race، صفحہ 22

(90) مولانا عبداللہ درمانی کے موقف کے لیے ملاحظہ کیجئے: بلوچی دنیا، نومبر 1959ء، صفحہ 41۔ مولانا قاضی عبدالصمد سربزی، بلوچ اور بلوچستان، مکران اور اس کا جغرافیہ (بلوچی دنیا)، ستمبر 1966ء، صفحہ 14 اور 31، نور احمد خان فریدی، مکران اعظم اور عظیم مکران (نوکیں دَور)، 16 مارچ 1967، صفحہ 7

(91) انور رومان، مکران ماقبل تاریخ، (نوکیں دَور)، 16 مارچ 1967، صفحہ 37 اور تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے، ملک سعید (دہوار) کی بلوچستان ماقبل تاریخ۔

(92) ایچ پوٹنگر، Travels in Baluchistan and Sindhe، صفحہ 268-269

(93) ایل ڈیمز، صفحہ 9

(94) ایضاً، صفحہ 12

(95) ایضاً

(96) ہنری فیلڈ، Contribution to the Anthropology of Iran، صفحہ 142

(97) ایل ڈیمز، صفحہ 13

(98) ایضاً

(99) ایل ڈیمز، صفحہ 13

(100) آر برٹن، Sind Revisited، جلد دوم، صفحہ 159

(101) ایل ڈیمز، صفحہ 8

(101) ایچ ڈبلیو، بیلو، Anthropology of Afghanistan، صفحہ 187، ڈیمز، صفحہ 14-16

(102) ڈیمز، Anthrolopology of Afghanistan، صفحہ 19-21

(103) حکومت قلات کا میمورنڈم

Scanned by CamScanner

(104) جی رالنسن، Ancient Monarches، جلداوّل، صفحہ 62

(105) پرسی ایم سکائکس، صفحہ 94

(105) قلات نیشنل پارٹی کا منشور، صفحہ 4-1

(106) محمد سردار بلوچ، History Baluch Race and Baluchistan، صفحہ 24-6، گل خان نصیر Koch-o-Baluch، صفحہ 91-71، مولانا نور احمد فریدی، صفحہ 95-94

(107) خدا بخش بجارانی مری بلوچ، صفحہ 13-10

(108) خدا بخش بجارانی مری بلوچ، صفحہ 11

(109) ایضاً

(110) خدا بخش بجارانی مری بلوچ، صفحہ 13

(111) میر عالم رقیب، Moria Khandan، بلوچی دنیا، جولائی 1973، صفحہ 18-15

(112) ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 80

(113) ہنری فیلڈ، صفحہ 141

(114) مولانا نور احمد فریدی، صفحہ 53 اور چرنجیت لال، تواریخ ڈیرہ اسماعیل خان، صفحہ 131-130

(115) میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ، صفحہ 11-10

(116) ٹی ہولڈش، The Arabs of Our Indian Frontier، جلد دوم، صفحہ 18

(117) آر ہفز بکر، The Brahuis, Census of India 1901، جلداوّل، صفحہ 66 اور ہیتو رام، صفحہ 198

(118) ایچ پوٹنگر، Travels in Baluchistan and Sindhe، صفحہ 71

(119) ہفز بکر، صفحہ 67-66

(120) ایضاً

(121) گل خان نصیر، کوچ و بلوچ، پہلا اور تیسرا باب

(122) میر احمد یار خان بلوچ، قوم بلوچ و خوانین بلوچ، صفحہ 32-29

(123) گل خان نصیر، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، صفحہ 2

(124) آر ہفز بکر، The Brahuis (Census of India 1901)، صفحہ 67، میر احمد یار خان بلوچ، صفحہ 30، ڈینیز برے، صفحہ 167

Scanned by CamScanner

(125) ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 201، 431، 436

(126) نینا سونڈلر The Development of the Kalat Khanate

(127) میر احمد یار خان بلوچ، صفحہ 30

(128) ملک اللہ بخش، تاریخ خوانینِ بلوچ، صفحہ 294

(129) ڈبلیو سونڈلر، Economic Change in Baluchistan، صفحہ 86 (Ainslie T.Embree)، صفحہ 29، Pakistans' Western Borders،

(130) نینا سونڈلر، The Political Structure of Tribal Federation, The Brahuis of Baluchistan، صفحہ 29، (غیر مطبوعہ) اور Barahu Political Organisation and the National State، صفحہ 112

(131) ایس ہیریسن، In Afghanistan's Shadow، صفحہ 185

(132) ایضاً

(133) حکومت پاکستان، مردم شماری کی رپورٹ 1951ء، صفحہ 51-50

(134) ایس ہیریسن، The Roots of Baluch Nationalism، صفحہ 26 (غیر مطبوعہ)

(135) اے ڈبلیو ہفز، The Country of Baluchistan، صفحہ 32-22، ذبیح اللہ ناصح Baluchistan، صفحہ 70-64 اور جی پی ٹیٹ، Seistan، صفحہ 360-359

(136) حکومت برطانوی ہند، Military Report on Persia، جلد چہارم، صفحہ 64

(137) حکومت برطانوی ہند، Military Report on Persia، جلد چہارم، صفحہ 64

(138) ایضاً، صفحہ 65-64

(139) ایضاً، صفحہ 67

(140) حکومت برطانوی ہند، Military Report on Persia، جلد چہارم، صفحہ 68

(141) ای آر ایلس، The Military Geography of Afghanistan، صفحہ 12

(142) جی این کرزن، Persia and the Persian Question جلد اوّل، صفحہ 179

(143) پاکستانی دفتر خارجہ کی تیار کردہ رپورٹ بعنوان Central Asia، (غیر مطبوعہ)

(144) ہنری جی روورٹی، Notes on Afghanistan and Baluchistan، صفحہ 4

Scanned by CamScanner

(145)ایضاً

(146) ایف میکسن، Remarks on the Baluch Tribes، صفحہ 211-218

(147) حکومت پاکستان، District Census Report,Jacobabad

(148) IOR/Mil/17/13/129/1+2+3۔

Military Reports provide the information on the Baluch Tribes in the administrative Province of Baluchistan

(149) ای سی راس، Memorandum on Makran، صفحہ 9-10

باب 3

(1)ڈینس برے، , Baluchistan, pp.127-142

(2)یعقوب شاہ، Baluchistan, pp.48-51

(3)میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، op,cit.vol.2p.528

(4)J.Effenbem"Baluchi Language, Linguists History"

(5)IOR-L/P-S/13/1847

(6)سلیگ ایس ہیریسن، مندرجہ بالا، p.11

(7)J.Elfenbein,op.cit,pp 1006-1009

(8)ایل ڈیمز، p,cit.p.24

(9)G.W.Gilbertson.The Baluchi Language pp.1-2

(10) کریم دشتی، بلوچ رسم خان، pp.29-32

(11)میر احمد یار خان، بلوچ قوم کے نام خانِ بلوچ کا پیغام، صفحہ 20

(12)No.15, Re-Organization of the Frontier, Minutes by the Viceroy

(13)No.15, Re-Organization of the Frontier, Minutes by the Viceroy

(14)Political No.119,Lord Salisbury;s letter to Viceroy,29 November,1877, Baluchistan No.3

(15)T.A.Heathcote, British Policy, and Baluchistan,pp.427-43,(unpublished)

(16)Sandeman's letter to Lord Curzon, dated November 22,1891 and January 12, 1892,in T.Thomton, Col.Sir. Robert Sandeman, pp.256-257

Scanned by CamScanner

Sandeman's letter to Lord Curzon, dated November 22,1891 and January 12, (17)
1892,in T.Thomton, Col.Sir. Robert Sandeman, pp.135
Y.D. Phadke, Politics and Language,p.2(18)
Y.D. Phadke, Politics and Language,p.2(19)
Y.D.Phadke, Politics and Language,p.2(20)
Y.D.Phadke, Politics and Language,p.2(21)
Y.D.Phadke, Politics and Language,p.3(22)
Y.D.Phadke, Politics and Language,p.3(23)
Government of India,Despatch on Proposals for Constitutional Reforsm, p.78(24)
Y.D.Phadke, op.cit.p.4(25)
(26) محمد حسین عنقا سے انٹرویو
IOR.L/P+S/12/3174 coll.23/48(27)
(28) عبدالصمد اچکزئی کا مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں بیان، لاہور، 26 اکتوبر 1956ء
(29) عبدالغفار خان "Shamia Sadai-Bad Nasiba-Baluchistan"Weekly Pukhtun,March
24,1946
(30) میر گل خان نصیر اور عبدالکریم شورش سے انٹرویو، ہفتہ وار بولان، مچھ، 3 جنوری 1947ء
Prince Abdul Karim Versus Pakistan State(1948)unpublished(31)
L.Dames, Popular Poetry of the Baloches,vol.1pp.XVII-XVIII(32)
Dames, Popular Poetry of the Baluchis, vol.1pp.1-3 58 (33)
(34) محمد سردار خان بلوچ، A Literary History of the Baluchies,p.131
(35) محمد سردار خان بلوچ، A Literary History of the Baluchistan,p.170-171.
(36) میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، صفحہ 184-185
(37) میر گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، صفحہ 138-151
(38) محمد سردار خان بلوچ op.cit.pp.357-360
(39) ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، op.cit.pp.322-335
(40) میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ، قدیم بلوچی شاعری، صفحہ 156-157
مزید دیکھئے، عنایت اللہ بلوچ کی بلوچستان کے سورما، غلام حسین بگٹی، دسمبر 1976ء

Scanned by CamScanner

(41)ایم قیصرانی، بلوچی شاعری اور فرنگی سماج، ماہِ نو، اگست 1978ء

(42)109.R/1/35/6

(43) تفصیل کے لیے دیکھئے، میر مٹھا خان مری، رحم علی مری

(44)عبدالرحمٰن غور، نغمۂ کوہسار، صفحہ 170-179

(45) تفصیل کے لیے دیکھئے، Baku,the Report on the Congress of the Peoples of the East(1920),announced by B.Pearce

(46)عبدالرحمٰن غور، نغمۂ کوہسار، صفحہ 170-178

(47) تفصیل کے لیے دیکھئے، میر مٹھا خان مری، رحم علی مری اور بزدار چگائی غفار

(48)IOR L/P+5/12/45 file PZ.7548.31

(49)عبدالصمد اچکزئی کا مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں بیان، لاہور، 26 اکتوبر 1956ء

(50)محمد حسین عنقا سے انٹرویو، مزید دیکھئے Mir Abdul Karim Khan Goliah,Muhammad Hussain Anka,p.7

(51)انور حسین، نوابزادہ یوسف علی خان مگسی، بلوچی دنیا، ملتان، مئی 1871ء، صفحہ 22-23

(52)یوسف علی خان مگسی کے عقائد اس کے اپنے قلم سے، (مگسی کی فارسی نظمیں اردو ترجمے کے ساتھ)، ہفتہ وار بلوچستان، کراچی، 30 مئی 1937ء

(53)ایضاً

(annaul 54) Nawab Yousaf Magassi's letter to Amin Khosa, Dec.1932,Al-Hanif, edition),March 1938

(55) Nawab Yousaf Magassi's letter to Amin Khosa(1934),Weekly Al-Hanif, Jacobabad(Annual Number),August 20, 1937,p.44

(56)میر مٹھا خان خضر مری، شاعر اور قوم، ہفتہ وار البلوچ، 3 ستمبر 1933ء

(57)ہفتہ وار بولان، March, May 1, 1947, May 16, 1947, and Sept.26, 1947

(58)ہفتہ وار، بلوچستان، کراچی 24 اکتوبر 1937ء

(59)بولان، 18 اپریل 1947ء

Scanned by CamScanner

(60)ہفتہ وار، بولان، کراچی 8 اپریل 1937ء

(61)ہفتہ وار بولان، March, February 14, 1947, and interview with Mr. Anka.

(62)بلوچی دنیا میں میر عبدالعزیز کرد کی سوانح عمری، جون جولائی 1968ء صفحہ 33

(63) عنایت اللہ بلوچ، "Resistance and National Liberation in Baluchi Peotry" in H.Skykawk(ed),"Mionorities on Themselves,Stutgart 1986

باب4

(1) L.Dames, Popular Poetry of the Baloches, vol1,p.3 and Hittu Ram,op.cit.p 10

(2)میر احمد یار خان بلوچ، مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 44-43۔ مزید دیکھئے، قادر نور احمد، جنگ نامہ 1765ء، منظوم، ناصر خان اعظم کے زمانے میں لکھا گیا۔

(3)امیر کابل کے نام بلوچ سرداروں کا خط، 1925ء

(4) عبدالواحد آزاد جمالدینی سے انٹرویو

(5) Thomas, Thornton, Col. Sir Robert Sandeman

(6) E.Oliver, Across the Border,p.24

(7) E.Oliver, Across the Border,p.24

(8) چرن جیت لعل، تواریخ ڈیرہ اسماعیل خان، صفحہ 287-251

(9) نوکیں دَور (بلوچی) کوئٹہ میں کامل القادری، کوہِ مراد 16 مارچ، 1967ء، صفحہ 41-60

(10) نوکیں دَور (بلوچی) کوئٹہ میں کامل القادری، کوہِ مراد 16 مارچ، 1967ء، صفحہ 41-60

(11) Deny Bray,Baluchistan,pp.56-57

(12) IOR.V.37(1840)

(13) Denys Bray, op.cit.pp.57-58

(14)میر احمد یار خانِ قلات سے انٹرویو

(15)سردار حبیب اللہ خان کولاچی بلوچ سے انٹرویو

(16)میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل۔ صفحہ 172 اور ڈینز برے op.cit.p.65

(17)میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل۔ صفحہ 172 اور ڈینز برے op.cit.p.65

Scanned by CamScanner

(18) Denys Bray,op.cit.p.65

(19) Denys Bray,op.cit.p.63-64

(20) Stephen L.Pastner"The Competitive Saints of the Baluch

(21) پاکستان پروگریسو(Pakistan Progressive)، دسمبر 1980، صفحہ 70

(22) نواب خیر بخش مری کے ساتھ انٹرویو۔ انہی خیالات کا اظہار سردار مینگل نے بھی ایک انٹرویو میں کیا۔

(23) مولانا عبیداللہ سندھی، کابل میں سات سال، صفحہ 155

(24) جے ایم ویکلے (J.M.Wileley)، پنجابی مسلمان، صفحہ 56-57

(25) ملک اللہ بخش، تاریخ خوانین بلوچ، صفحہ 357

(26) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے، پشتون یا افغان کلچر اور کے عزیز کی دی میکنگ آف پاکستان۔

(27) انعام الحق کوثر، بلوچستان میں تحریک پاکستان، صفحہ 9

(28) میر گل خان نصیر، بلوچ رزمیہ شاعری، صفحہ 114

(29) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں، گل خان نصیر، تاریخِ بلوچستان، جلد اوّل و دوم

(30) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 454

(31) ایم سردار خان بلوچ، "The History of the Bluch Race and Baluchistan"، صفحہ 192-193

(32) مفصل دیکھئے، ایل ڈُپری، افغانستان۔

(33) جمعہ خان بمقابلہ ریاست پاکستان، The Pakistan Legal Decisions(PLD) صفحہ 939-955

(34) چرنجی لال، صفحہ 181-180۔ غلام رسول مہر کی کتاب، جنرل سر عمر ٹوانہ، صفحہ 65 بھی دیکھئے۔

(35) پاکستان کی قومی اسمبلی 1974ء میں بلوچستان پر خاص بحث، ملاحظہ کیجئے۔

(36) اینجلس (Angles) The Origin of Family Private Poetry and the State، صفحہ 133

(37) تفصیل کے لیے دیکھئے: A.McConaghey,Baluchistan District Gazetteer Series، جلد دوم ضلع سبی

(38) پرسی ایم سائکس، "Ten thousand Miles in Persia" صفحہ 120

(39) حکومت ہند، "Military Report on Persia"، چوتھی جلد، صفحہ 61

(40) IOR L/MIL/17/13/129/1،

Scanned by CamScanner

(41) عبدالمجید افغانی، تاریخ افغانستان، صفحہ 158-155

باب 5

(1) ہف سیٹن واٹسن (Hugh Seton Watson)، Reflections on Europe's Experience of Separism

(2) قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی، منشور، صفحہ 2-1

(3) سردار خان بلوچ اور خدا بخش مری بلوچ نے سر ایچ رالنسن کا حوالہ دیا ہے جو غلط ہے۔ یہ مقالہ جارج رالنسن کا تحریر کردہ ہے جو آکسفورڈ (برطانیہ) میں قدیم تاریخ کا پروفیسر تھا۔

(4) میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ، Searchlight on Baloches and Balochistan، صفحہ 11

(5) پرسی ایم سائکس (Percy M. Sykes)، صفحہ 94

(6) تفصیلاً ملاحظہ کیجئے، میر گل خان نصیر، کوچ و بلوچ، پہلا اور دوسرا باب اور محمد سردار خان بلوچ، History of Baluch Race and Baluchistan، صفحہ 17-16

(7) محمد سردار خان بلوچ، صفحہ 24-23۔ اس کے علاوہ سلیگ ایس ہیریسن (Selig S.Harrison) کی کتاب The Roots of Baluchistan Nationalism (غیر مطبوعہ)، صفحہ 5-4 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(8) محمد سردار خان بلوچ، History of Baluch Race and Baluchistan، صفحہ 28

(9) سلیگ ایس ہیریسن، The Roots of Baluch Nationalism، صفحہ 5، (غیر مطبوعہ)

(10) ایضاً

(11) اے ایچ (A.H) سے مراد ہے ہجرت کے بعد، یعنی اسلامی کیلنڈر۔

(12) ایل ڈیمز (L.Dames)، Baluch Race، صفحہ 27-26

(13) ایل ڈیمز (L.Dames)، Baluch Race، صفحہ 27

(14) جارج این کرزن (George N.Curzon)، Persia and the Persian Question، صفحہ 259

(15) مولانا نور احمد فریدی، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، صفحہ 86-80

(16) مولانا نور احمد فریدی، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، صفحہ 92

(17) خدا بخش بجارانی مری بلوچ۔ Baluchi through Centuries، صفحہ 20-18

(18) خدا بخش بجارانی مری بلوچ۔ Baluchi through Centuries، صفحہ 20-18

Scanned by CamScanner

(19) خدا بخش بجارانی مری بلوچ، Searchlight on Baloches and Baluchistan، صفحہ 108 اور مولانا نور احمد خان فریدی، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، صفحہ 123-121، تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے، نصیر الملک، سیاست نامہ اور سوار الملوک (انگریزی ترجمہ از ہیوبرٹ ڈارکی، The Book of Rules for Kings، صفحہ 74-67

(20) خدا بخش بجارانی مری بلوچ، Baluches through Centuries، صفحہ 35

(21) ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 20-16

(22) میر احمد یار خان بلوچ، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ

(23) مولانا نور احمد خان فریدی، صفحہ 183۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: محمد سردار خان بلوچ History of Baluch Race and Baluchistan and The Great Baluch

(24) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: عنائت اللہ بلوچ "The Tribal System:From Blessing to Blight",in Pakistan Progressive,Dec.1980,and by the same author,"Baluch Qabaily Nazim",in People's Front، ستمبر۔اکتوبر 1979

(25) ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 20-16

(26) محمد سردار خان بلوچ۔ "The great Baluch"، صفحہ 140-112

(27) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد اوّل، صفحہ 1006

(28) مولانا نور احمد خان فریدی، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، صفحہ 324-306

(29) ای جی روس (E.G.Ross)، Mekran، صفحہ 41-32

(30) ای جی روس (E.G.Ross)، Mekran، صفحہ 41-32

(31) یووی گینکوسکی (Yu.v.Gankowsky)، The People of Pakistan، صفحہ 147

(32) سوجن رائے بٹیوی، صفحہ 103

(33) سوجن رائے بٹیوی، صفحہ 366-365۔ اس کے علاوہ ملاحظہ کیجیے: ابوالفضل، اکبر نامہ، جلد 3 صفحہ 739

(34) دودائی وفاق کی اصطلاح کولاچی، میرانی اور ڈیرہ جاٹ کے بوت کی حکمران قبائلی اشرافیہ کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

(35) غلام رسول مہر، صفحہ 65

Scanned by CamScanner

(36) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: V&Tisyi، عبدالکریم، Wagiyat-e-D-Zrani

(37) جی ایل چوپڑا، Chiefs and Families of Note in the Punjab، جلد دوم، صفحہ 407

(38) جی ایل چوپڑا، Chiefs and Families of Note in the Punjab، جلد دوم، صفحہ 465-403۔
مزید ملاحظہ کیجئے: شیخ ایم۔اکرام Mauj-e-Kausar، صفحہ 44-43

(39) جی ایل چوپڑا، صفحہ 407

(40) اخوند محمد صدیق، تاریخ احمد زئی بلوچ، تاریخ خوانین بلوچستان، صفحہ 207-201۔

(41) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، صفحہ 31-30

(42) ایم انور رومان، Brahuis of Quetta-Kalat Region

(43) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، صفحہ 32

(44) میر احمد یار خان، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 381

(45) آر ہفز بلر (R.Hughes-Buller)، Baluchistan

(46) مولوی شیدائی، بلوچستان کی مختصر تاریخ، صفحہ 41

(47) مولوی شیدائی، بلوچستان کی مختصر تاریخ، صفحہ 53-52

(48) ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 216

(49) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل، صفحہ 110-109

(50) معاہدے کی مکمل تفصیل کے لیے میر احمد یار خان بلوچ کی کتاب، تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ، صفحہ 126 ملاحظہ فرمائیں۔اس کے علاوہ ایچ پوٹنگر (H.Potinger) کی کتاب کا صفحہ 283-282 ملاحظہ کریں۔

(51) بہت سے مصنفین کا خیال ہے کہ Beyglar Beygi کا خطاب ایران کے نادر شاہ نے دیا تھا اور کچھ مصنفین افغانستان کے احمد شاہ کا نام لیتے ہیں۔اس حقیقت کی روشنی میں یہ دونوں موقف درست نہیں کہ لفظ Byeglar Beygi ایک ترکی لفظ ہے اور اس کا فارسی (ایران کی سرکاری زبان) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

(52) پنجاب کو بلوچستان اور افغانستان میں تقسیم کرنے کی پیشکش کی بنیاد نور محمد قاضی کی کتاب ''جنگ نامہ'' ہے جو انتہائی اہم دستاویز ہے۔

Scanned by CamScanner

(53) گنڈہ سنگھ کی کتاب 'احمد شاہ درانی'، صفحہ 95۔ اس کے علاوہ میر احمد یار خان بلوچ کی کتاب، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 46-43 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(54) قاضی نور محمد 'جنگ نامہ' صفحہ 40-38

(55) قاضی نور محمد 'جنگ نامہ' صفحہ 115

(56) محمود الحسن حسینی المنشی، ''تاریخِ احمد شاہ''، جلد اوّل، صفحہ 80

(57) محمود الحسن حسینی المنشی، ''تاریخِ احمد شاہ''، جلد دوم، صفحہ 745 اور 96-795

(58) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: منشی عبدالکریم، واقعاتِ درانی (فارسی متن کا اردو ترجمہ) لاہور اور محمد امین عبدالحسن گلستانی، مجموع التاریخ نادری (فارسی)

(59) جمال الدین افغانی کی کتاب 'تاریخ افغانستان' (تتمۃ البیان فی تاریخ افغانستان از مولوی محمود علی خان، لاہور، کی کتاب کا اردو ترجمہ)، شیر محمد گنڈاپوری، تاریخ خورشید جہان (فارسی)، عبدالمجید افغانی، تاریخ افغانہ اور قاضی عبداللہ جان خان، تاریخ پختون (ماہنامہ پختون (پشتو) میں قسط وار شائع ہوئی (39-1938) اور بعدازاں کتاب کی شکل میں شائع ہوئی۔)

(60) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: Afghan Official position,Rahman Pazhwan

Pakhtunistan.A state in Centrial Asia

(61) جی ایم، گھبر، افغانستان در میسر تاریخ، صفحہ 336

(62) اے ایچ حبیبی، تاریخ مختصر افغانستان، جلد دوم، صفحہ 89

(63) محمد انور ہروی، لشکر کاشی احمد شاہ درانی، صفحہ 68-62

(64) ایم الفنسٹون (M.Elphinstone)، An Account of the Kingdom of Caubul and its Dependencies، جلد دوم، صفحہ 291-290

(65) ایم الفنسٹون (M.Elphinstone)، An Account of the Kingdom of Caubul and its Dependencies، جلد دوم، صفحہ 291-290

(66) ایچ پوٹنگر (H.Pottinger)، Travels in Baluchistan and Sindh، صفحہ 83-282

(67) ایچ پوٹنگر (H.Pottinger)، Travels in Baluchistan and Sindh، صفحہ 283

(68) پہلا ضمیمہ دیکھئے۔

Scanned by CamScanner

(69)، چارلس میسن (Charles Masson)، بلوچستان، افغانستان، پنجاب اور قلات میں مختلف سفروں کا احوال۔ اس کے علاوہ لائنول جے ٹروٹر (Lionel J.Trotter)، جنرل سر جیمز آؤٹرم کی زندگی اور موہن لال، کابل کا امیر دوست محمد

(70) اے ڈبلیو ہفز (A.W.Hughes)، The Country of Baluchistan، صفحہ 187

(71) سر آر جی سنڈیمن (Sir R.G.Sandeman) کی طرف سے دفتر خارجہ کو خفیہ مراسلہ 1986 No.231

(72) ایضاً

(73) ہتو رام (Hittu Ram)، تاریخِ بلوچستان

(74) جی بی ملیسن (G.B.Malleson)، History of Afghanista، صفحہ 87-286

(75) گنڈا سنگھ، Ahmad Shah Durrani,Father of Modern Afghanistan، صفحہ 214 اور ایم انور نیر ہروی، لشکر کاشی احمد شاہ درانی، صفحہ 214

(76) آر ہفز بلر (R.Hughes Buller)، Baluchistan

(77) پی ایم سائکس (P.M.Sikes)، Ten Thousand Miles in Persia or Eight Year in Iran، صفحہ 236

(78) پی ایم سائکس (P.M.Sikes)، A History of Afghanistan، جلد اوّل، صفحہ 359

(79) پی ایم سائکس (P.M.Sikes)، A History of Persia، صفحہ 291

(80) سی یو ایچی سن (C.U.Aitchison)، A Collection of Treaties, Engagements and Sanads، جلد ہشتم، صفحہ 325

(81) جی پی ٹیٹ (G.P.Tate)، TheKingdomofAfghanistan، صفحہ 112 78

(82) مزید تفصیل کے لیے آٹھواں باب ''بلوچستان کی سیاسی حیثیت'' ملاحظہ کیجیے۔

(83) گل خان نصیر۔ بلوچی رزمیہ شاعری، صفحہ 186-176

(84) محمد صدیق، Tarikh-e-Baluchistan,in Hittu Ram's Tarikh-e-Baluchistan، صفحہ 219

(85) مولوی شیدی (رحیم داد خان)، بلوچستان کی مختصر تاریخ، صفحہ 57-56 اور گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل، صفحہ 115-114

(86) ملک اللہ بخش (مرتب شدہ)، تاریخ خوانین بلوچستان، صفحہ 48-47، 65-63، میر احمد یار خان بلوچ

Scanned by CamScanner

۔تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 12

(87)--IOR:R/1/34/57

(88) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان ،جلد اوّل، صفحہ 102-97اور 174-164۔ہنری پوٹنگر، Tartaric,Balauchistan, Bountane Et، صفحہ 295-294اور ایم وی ویلمونٹ اور ایم ڈوبیکس، Nepal، صفحہ 373-363 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(89)ایضاً

(90)ایضاً

(91)ایچ پوٹنگر، ایضاً، چارلس میسن ، Narrative of Various Jouneys in Baluchistan,Afghanistan,The Punjab and Kalat، صفحہ 414-404

(92)ایچ پوٹنگر، ایضاً، چارلس میسن، Narrative of Various Jouneys in Baluchistan,Afghanistan,The Punjab and Kalat، صفحہ 414-404

(93) خانیت کو دیئے جانے والے خراج کی درست رقم معلوم نہیں۔ مذکورہ اعداد وشمار، غلام سرور کی طرف سے فراہم کیے گئے جب ڈیرہ جات 1794ء میں زمان شاہ کا باج گزار بن گیا۔اس کے علاوہ ہری رام گپتا کی کتاب Studies in Later Mughul History of Panjab، صفحہ 277-272 بھی دیکھئے۔

(94) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل، صفحہ 46-45

(95)امارتِ سندھ، خانیت کی ایک محکوم ریاست تھی اور اسے خراج ادا کرتی تھی۔ میر احمد یار خان نے مصنف قاضی نور محمد کے ساتھ ایک انٹرویو میں یہ موقف اختیار کیا۔ قاضی نور محمد نے لکھا کہ ڈیرہ جات کے حکمران میر ناصر خان اعظم کے زیر تسلط تھے اور اسی موقف کا اظہار سردار حبیب اللہ خان کولاچی نے مصنف کے ساتھ انٹرویو میں بھی کیا ہے۔ تفصیل کے لیے جرج جیت لال کی کتاب ''تواریخ ڈیرہ اسماعیل خان'' دیکھئے جو اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ ڈیرہ جات میں خانِ قلات کی کرنسی ''مہراب شاہی'' زیر استعمال تھی۔

(96) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان ،جلد دوم، صفحہ 99-98۔سی میسن (C.Masson) صفحہ 406-404، نیز میر احمد یار خان بلوچ کی کتاب، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 48-46 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(97)ایچ پوٹنگر، (H.Pottinger)، صفحہ 294

Scanned by CamScanner

(98) قلات کے میر احمد یار خان سے انٹرویو

(99) میر احمد یار خان، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 1

(100) ایچ پوٹنگر (H.Pottinger)، صفحہ 295۔ میر احمد یار خان، خانِ قلات کے ساتھ انٹرویو۔ مائیکل، میک موہن میوزیم، کوئٹہ، سکوں کی فہرست، صفحہ 47، 48

(101) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 159-158 اور 164-163

(102) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 158 159- اور 163 164-، صفحہ 97 103- اور 167-169۔ اس کے علاوہ وارن سوڈلر (Warren Swidler)، Economic Change in Baluchistan بھی دیکھئے، صفحہ 91-87

(103) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل، صفحہ 165

(104) انجم قزلباش، بلوچوں کے رومان، صفحہ 115-114

(105) ایچ پوٹنگر (H.Pottinger)، صفحہ 285

(106) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، صفحہ 198

(107) انور رومان، Brahuis of Quetta-Kalat Region in Journal of of the Pakistan Historical Society، جنوری 1960، صفحہ 51-38 اور مرزا احمد علی، میر مہراب خان کی حکومت کی تاریخ، ہیتو رام، صفحہ 261

(108) پیام شاہجہان پوری، سید احمد شہید کا ورودِ بلوچستان، ہفتہ وار جمہوریت میں، اکتوبر 25-19، 1974، صفحہ 31-30۔ مجاہدین کے کردار کے متعلق تفصیل جاننے کے لیے شیخ ایم اکرم کی کتاب، موجِ کوثر ملاحظہ کیجئے۔

(109) تفصیل کے لیے ایک میر محمد حسن رئیسانی کی ہیتو رام میں ایک بلوچ نظم، صفحہ 232 اور میر گل خان نصیر، صفحہ 246 اور مولوی شیدی، صفحہ 67، ملاحظہ کیجئے۔

باب 6

(1) ٹیمپورل ریکارڈز، سیکرٹ ڈیپارٹمنٹ، جولائی 1977، ہیتو رام گپتا کی کتاب Studies in Later Mughul History of the Punjab میں سے، صفحہ 265 کے علاوہ صفحہ 277-272

(2) این پیگرانٹ (N.P.Grant)، Journal of Route through Western Parts of Makran, in

Scanned by CamScanner

Journal of Royal Asiatic Society، جلد پنجم (1839)، صفحہ 328-342، کیپٹن کرسٹی (Capt.Christie)، Journal in H.Pottinger، صفحہ 403-423۔ اس کے علاوہ جارج فارسٹ (George Forrest) میں موجود برطانوی ایجنٹوں کی اطلاعات بھی ملاحظہ فرمائیں۔ Selection and the Travels and Journals، صفحہ 43-50 اور 95-100

(3) افضل اقبال، Circumstances Leading to the First Afghan War، صفحہ 79-84۔ اس کے علاوہ ایچ ایم درانی (H.M.Durrani) کی کتاب The First Afghan War and its Causes اور جے اے نورس (J.A.Norris) کی کتاب The Frist Afghan War، 1838-1842 ملاحظہ فرمائیں۔

(4) حکومت ہند، بلوچستان اور پہلی افغان جنگ، صفحہ 310

(5) حکومت ہند، بلوچستان اور پہلی افغان جنگ، صفحہ 308۔ اس کے علاوہ سی یو ایچی سن (C.U.Aitchison) کی کتاب Treaties and Sanads، جلد گیارہ، صفحہ 29

(6) میر احمد یار خان، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 53-55

(7) ایضاً

(8) ایضاً

(9) حکومت ہند، بلوچستان اور پہلی افغان جنگ، صفحہ 309-310

(10) پی مہرا (P.Mehra)، North Western Frontier and British India، جلد دوم، صفحہ 162

(11) تفصیل کے لیے موہن لال کی کتاب، امیر دوسر محمد خان، جلد دوم اور ہیتھکوٹ Heathcote کی کتاب The Afghan Wars:1839-1919، لندن 1930، دیکھئے۔

(12) سی میسن (C.Masson)، صفحہ 80-112

(13) ایچ ایم درانی (H.M.Durrani)، پہلی افغان جنگ اور اس کی وجوہ، صفحہ 227-228

(14) آغا سلطان ابراہیم، Khan Mir Mohd.Nasir Khan II's Government,in Al-Hanif (annual number)، فروری 1936، صفحہ 5-10

(15) ایضاً اور ایل جے ٹروٹر (L.J.Trotter)، The Bayard of India, A Life of General Sir James Outram، صفحہ 92-94

(16) ایضاً

Scanned by CamScanner

(17)ایڈرین ڈیوریٹ (Adrian Durate)، A History of British Relations with Sind، باب نہم میں تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

(18)ایم ای یاپ (M.E.Yapp)، صفحہ 578، تفصیل کے لیے Heathcoat (غیر مطبوعہ) ملاحظہ کیجئے۔

(19) سی یو ایچی سن (C.U.Aitchison)، جلد XI، صفحہ 354-352، اس کے علاوہ دوسرا ضمیمہ بھی دیکھئے۔

(20) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 67-66

(21) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد اوّل، صفحہ 89-72

(22) کرنل سر ڈبلیو ایل میریویدر کی طرف سے بالائی سندھ کے ناظم کے نام خط

(23) کرنل سر ڈبلیو ایل میریویدر کی طرف سے Sir W.Fitzgerald کے نام خط

(24)ایم اے جناح کی طرف سے 1946ء میں حکومت قلات کی جانب سے کابینہ مشن کی پیش کردہ یادداشت۔ Balochistan No.1، صفحہ 15-13

(25) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 70

(26) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 70 اور بلوچستان نمبر ایک، صفحہ 27 اور 38۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: ٹی اے ہیتھکوٹ (T.A.Heathcote)، British Policy and Baluchistan 1854-1876، (غیر مطبوعہ)

(27) آر آئی بروٹ (R.I.Brute)، The Forward Policy، صفحہ 57-56، اور اے ایل۔ پی ٹکر (A.L.P.Tucker)، سر رابرٹ سنڈیمن، صفحہ 28

(28)ٹی اے تھارنٹن (T.A.Thornton)، صفحہ 54-53

(29)ٹی اے تھارنٹن (T.A.Thornton)، صفحہ 54-53 اور میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 71

(30)ایضاً

(31)ٹی اے تھارنٹن (T.A.Thornton)، صفحہ 60-59 اور بلوچستان نمبر ایک، صفحہ 50-45

(32) آر آئی بروس (R.I.Bruce)، صفحہ 35

(33)۔IOR-V/23/343

(34) میر گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 153 اور بلوچستان نمبر دو، صفحہ 70

(35)ہیتو رام، Sandeman in Baluchistan، صفحہ 25

Scanned by CamScanner

(36)ہیتو رام، Sandeman in Baluchistan، صفحہ 67-71

(37)ہیتو رام، Sandeman in Baluchistan، صفحہ 67-71

(38)لیڈی بیٹی بلفور (Lady Betty Balfour)، The History of Lord Lytton's Indian Administration، صفحہ 98

(39)لیڈی بلفور (Lady Balfour)، صفحہ 101-102

(40)ٹی تھامٹن (T.Thomton)، صفحہ 132

(41)فلپ وُڈرف (Philip Woodruff)، Men who Ruled India، صفحہ 142-147۔اس کے علاوہ سی ای بروس (C.E.Bruce)، The Sandeman Policy as applied in Tribal Problems of Today,in Journal of Royal Central Asian Sooiety, جلد XIX، 1932 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(42) تفصیل کے لیے ولارڈ بیری (Willard Berry) کی کتاب Aspects of the Frontier Crimes Regulation in Pakistan ملاحظہ کیجئے۔

(43) آغا سلطان ابراہیم، "Khan Mir. Khudadad Khan"، الحنیف، مورخہ 20 اگست 1937ء

(44) میر احمد یار خان بلوچ "Inside Baluchistan"، صفحہ 123 اور گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 281-286

(45) حکومت ہند Imperial Gazetter of India، جلد پنجم، صفحہ 341 اور حکومت پاکستان، بلوچستان کی مردم شماری 1951ء، صفحہ 12

(46) تحریک مزاحمت کی تفصیل کے لیے ایم جے پیکولن (M.J.Pikulin) ملاحظہ کیجئے۔

(47)IOR L/P+S/10/477 اور IOR.MSS Eur F.131/9

(48)IOR R/1/35/6

(49)سردار حبیب اللہ خان کولاچی بلوچ اور میر عبدلواجد خان عزت جمالدینی کے ساتھ انٹرویو۔ تفصیل کے لیے عبدالاکبر خان اکبر کی کتاب، سفرنامہ روسی ترکستان، صفحہ 91 اور 129، نیز عبدالصمد درانی کی کتاب، ہماری جدوجہدی داستان ملاحظہ کیجئے۔

(50) حکومت ہند، Military Reports on Persia، جلد چہارم، صفحہ 5-7

(51) آر ڈائیر (R.Dyer)، The Raiders of the Sarhad، صفحہ 198، مزید برآں ڈبلیو ای آر

Scanned by CamScanner

ڈیکسن(W.E.R.Dickson) کی کتاب East Persia، صفحہ 36-19 اور حکومت ہند کی Military Report on Persia، جلد دوم، صفحہ 8-7 ملاحظہ کیجئے۔

(52)۔IOR L/P+S/10/875+1135+1136 and IOR L/P+S/12/3478، مزید ملاحظہ کیجئے ایم جے پیکولن(M.J.Pikulin)، Beludzhei، صفحہ 140-104

(53) ایضاً۔ مزید دیکھئے: امین اللہ جہانبانی، عملیاتِ قشون در بلوچستان، صفحہ 87 اور اسی مصنف کے قلم سے سرگزشت بلوچستان و مرزھئی اور ایم جے پیکولن(M.J.Pikulin)

(54) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے، Prince Abdul Karim Versus Pakistan State، غیر مطبوعہ

باب 7

(1) میرپ(Merip) رپورٹ نمبر 39، Soviet Policy in the Middle East، صفحہ 3

(2) افغانستان کے امیر امان اللہ خان کے نام لینن کا خط، 27 مئی 1919ء، وی جے لینن(V.J.Lenin) میں: The National Liberation Movement in the East، صفحہ 238

(3) جی بونڈراسکی (G.Bondarevski)، Bolshevik Policy and the People of East in Weekly Mainstream, Delhi، 3 دسمبر 1977ء

(4) برائن پیئرس (Brian Pierce)، Baku,Congress of the Peoples of the East، صفحہ 163

(5)۔Sepehr Zabih، The Communist Movement in Iran، صفحہ 34-33۔ مزید دیکھئے، محمد حسین عنقا کے ساتھ انٹرویو

(6) محمد حسین عنقا کے ساتھ انٹرویو۔ اس کے علاوہ ایل پی سنہا(L.P.Sinha) کی کتاب The Left Wing in India اور ارون کومر بوسی(Arun Coomer Bose) کی کتاب Indian Revolutionaries Abrod، باب XI، ملاحظہ کیجئے۔

(7)۔IOR.MSS.EU.D 696/5

(8) پاکستان فارن آفس، Report on Soviet Central Asia، (غیر مطبوعہ)

(9)۔IOR.L/MIL/17/15/11/7

(10) عنایت اللہ بلوچ، Afghanistan,Pashtunistan and Baluchistan,in Audempolitik (انگریزی ایڈیشن)، German Foreign Affairs Review، 3/80، صفحہ 292-291

Scanned by CamScanner

(11) میر احمد یار خان بلوچ، تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ، صفحہ 68-67، اس کے علاوہ کتاب بعنوان Inside Baluchistan، صفحہ 114-112 بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(12) عنایت اللہ بلوچ، Kalat State National Party، ماہنامہ عزم، مورخہ 3 اگست 1976۔ اس کے علاوہ عنایت بلوچ The Emergence of the Baluch Nationalism in Pakistan Progressive، دسمبر 1980ء بھی ملاحظہ کیجئے۔

(13) عنایت اللہ بلوچ، Mir Mohd, Yousaf Ali Khan magassi,

(14) میر عبدالعزیز کرد، Sawaneh-e-Hayat، ماہنامہ بلوچ دنیا، جون، جولائی 1968ء صفحہ 40-39

(15) انجمن اتحادِ بلوچستان، شمس کردی، صفحہ 60-58 اور عبدالعزیز کرد، سوانح حیات، ماہنامہ بلوچی دنیا، جون، جولائی 1968

(16) IOR R/134/57۔

(17) میر عبدالعزیز کرد کا بیان، روزنامہ زمیندار، 18 ستمبر 1932۔ روزنامہ زمیندار مورخہ 28 ستمبر 1932 اور 29 دسمبر 1932 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(18) روزنامہ زمیندار، مورخہ 22 اکتوبر 1932ء

(19) مرید حسین مگسی، Roidad All India,Baluch and Baluchistan Conference(1993)، صفحہ 3-2

(20) ایضاً

(21) ہفتہ وار، Young Baluchistan، مورخہ 15 جنوری 1934ء

(22) عبدالرحمٰن، اوّلین بلوچ رہنما، بلوچی دنیا، جون، جولائی 1970ء

(23) ملک فیاض محمد یوسف زئی کے ساتھ انٹرویو۔ پاسبان مورخہ 20 جولائی 1943ء بھی ملاحظہ کیجئے۔

(24) عبدالکریم ابوالانقلاب بلوچستان، بلوچستان میں ریاستوں کی آزادی، صفحہ 77

(25) انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، صفحہ 73۔ نیشنل پارٹی کے سابق جنرل سیکریٹری میر گل خان نصیر کے علاوہ نیشنل پارٹی کے آخری صدر میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ انٹرویو

(26) کیا بلوچستان کو ریاست قلات کا نام دے کر ہندوستان سے علیحدہ کیا جائے گا؟، ہفتہ وار بلوچستان (ضمیمہ)، 16 دسمبر 1938

(27) ہفتہ وار بولان، 27 ستمبر 1946ء اور 26 مارچ 1947ء

Scanned by CamScanner

(28) کامل القادری ،ملک عبدالرحیم خواجہ خیل (نوکیں دَور)، 21اکتوبر 1966ء، صفحہ 2، دیکھئے۔
عبدالصمد اچکزئی کا مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں بیان، 26اکتوبر 1956ء

(29) IOR L/P+S/3174۔

(30) عنایت اللہ بلوچ، قائداعظم اور بلوچستان، ماہنامہ فکر ونظر، دسمبر 1976ء اور جنوری 1977ء

(31) انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، صفحہ 40-38

(32) انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، صفحہ 40-38

(33) IOR R/e/2/55۔

(34) IOR R/3/1/155۔

(35) انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ صفحہ 127-126

(36) برطانوی حکومت کی مشاورت سے قلات کا وزیراعظم مقرر کرنے کا حق

(37) گل خان نصیر، جلد دوم، صفحہ 599-598۔ گل خان نے میر احمد یار خان کو ان کے اختلافی نظریات مثلاً بلوچ قوم پرستی اور اسلامی اتحاد، کے باعث خانیت کی خودمختاری کے زوال کا مورد الزام ٹھہرایا۔

(38) میر احمد یار خان بلوچ، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 87

(39) میر احمد یار خان، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 87

(40) IOR L/P+S/13/1847۔

(41) ایم اے جناح، آئی آئی چندریگر اور دیگر کئی آئینی ماہرین نے قلات کا مقدمہ تیار کیا۔

باب 8

(1) ٹیرینس کریغ کوئن (Terence Creagh Coen)، The Indian Political Service، صفحہ 146

(2) اخوند محمد صدق، Tarikh-e-Baluchistan in Hittu Ram، صفحہ 313-211

(3) اپنے انٹرویو میں میر بزنجو نے یہ موقف اختیار کیا کہ نادر شاہ کے قتل کے فوراً بعد ناصر خان بلوچستان میں داخل ہوا اور احمد شاہ کے انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ ریورٹی (Raverty) کا بھی یہی موقف ہے۔

Notes on Afghanistan and Baluchistan، صفحہ 615

(4) قاضی نور محمد، جنگ نامہ، صفحہ 42-41

(5) ''سندھ اور پنجاب کا نظام'' پر ماؤنٹ بیٹن کا میمورنڈم، مورخہ 22مارچ 1876، (In Balochistan

Scanned by CamScanner

No.3,page 12)

(6) سی یو ایچی سن (C.U.Aitchison)، A Collection of Treaties,Engagments and Sanads، جلد XI، صفحہ 357-358

(7) گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان جلد دوم، صفحہ 11

(8) IOR.MSS.Eur F 134۔

(9) لیڈی بریٹی بیلفور، (Lady Bretty Balfour)، The History of Lord Lytton's Indian Administration، صفحہ 125

(10) ایضاً

(11) IOR R/1/346۔

(12) IOR R/1/342۔

(13) IOR R/1/34/14۔

(14) IOR R/1/34/60۔

(15) IOR L/P+S/13/1847۔

(16) IOR L/P+S/13/1847۔

(17) ایضاً

(18) L/P+S/13/1847۔ میر احمد یار خان بلوچ، Inside Baluchistan، صفحہ 267

(19) میر احمد یار خان بلوچ، Inside Baluchistan، صفحہ 141، اسی مصنف کی، تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 90

(20) IOR L/P+S/13/1847 ۔

(21) ایضاً۔

(22) ایضاً۔

(23) ایضاً۔

(24) میر احمد یار خان بلوچ، Inside Baluchistan، صفحہ 141 اور اسی مصنف کے قلم سے، تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ، صفحہ 90

Scanned by CamScanner

(25) عنایت اللہ بلوچ، Jinnah-Khan of Kalat Correspondence، صفحہ 83-78، اس کے علاوہ پانچواں ضمیمہ بھی ملاحظہ کیجئے۔

(26) پینڈریل مون (Penderel Moon)، Wavell، صفحہ 483

(27) حکومت قلات، اعلامیہ، صفحہ 7-1

(28) ایم رفیق افضل، Selected Speeches and Statements of Quaid-e-Azam M.A.Jinah، صفحہ 416-415

(29)- IOR L/P+S/13/1846 اور IOR L/WS/1/1190 1847، ساتواں ضمیمہ

(30)- IOR L/P+S/13/1846 اور 1847، آٹھواں ضمیمہ ملاحظہ کیجئے

(31) نہرو، The Discovery of India، صفحہ 287

(32)- IOR/P+S/12/3548 اور میر احمد یار خان، Inside Baluchistan، صفحہ 112

(33)- IOR/L/P+S/12/3174,IOR L/P+S/12/1846 and 1847

(34) جنرل آرسی منی کی فائل کو ایک خفیہ فائل سمجھا جاتا ہے جو وار آف لائبریری میں موجود ہے جس میں بلوچستان کی سٹریٹجک اہمیت کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

(35)- IOR L/P+S/13/1847۔ تفصیل کے لیے چھٹا ضمیمہ ملاحظہ کیجئے۔

(36)- IOR L/P+S/13/1847

(37) قلات کے سابق وزیر خارجہ، جناب، فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو

(38) کہا جاتا ہے کہ خان نے مسلم لیگ کو چاندی سے بھرا ٹرک دیا تا کہ ایک علیحدہ آزاد ریاست کے لیے تحریک چلائی جا سکے۔

(39) میر احمد یار خان بلوچ بلوچ قوم کے نام خانِ بلوچ کا پیغام، صفحہ 61

(40) میر احمد یار خان بلوچ، صفحہ 61، اور تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ، صفحہ 161

(41) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو

باب 9

(1) ملک اللہ بخش، تاریخ خوانین بلوچ، صفحہ 413-407

(2) میر گل خان نصیر، تاریخِ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 510-509

Scanned by CamScanner

(3) میر گل خان نصیر، تاریخِ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 515

(4) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو۔ مزید برآں، ''بولان'' 27 فروری 1948ء بھی ملاحظہ کیجئے۔

(5) پاکستان کے فارن سیکریٹری کا ریاست قلات کے وزیر خارجہ کے نام خط مورخہ 25 مارچ، 1948ء (غیر مطبوعہ)۔ مسٹر فیل نے مصنف کو اس خط کی نقل فراہم کی۔

(6) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو

(7) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو اور ٹی کوئن (T.Coen)، The Indian Political Service، صفحہ 146-147

(8) ایضاً

(9) ٹی کوئن (T.Coen)، The Indian Political Service، صفحہ 146-147

(10) جناب حسین عنقا اور ملک ایم پناہ کے ساتھ انٹرویو

(11) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو

(12) IOR L/P+S/13/1847-(3)

(13) میر احمد یار خان کے ساتھ انٹرویو جنہوں نے مصنف کو مجوزہ معاہدے کی ایک نقل مہیا کی۔

(14) IOR L/P+S/13/1847-۔ اس کے علاوہ آٹھواں ضمیمہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(15) میر احمد یار خان بلوچ، Partition of India,Its Effection Kalat State، (غیر مطبوعہ)، صفحہ 12-13

(16) IOR L/P+S/13/1847-

(17) ایضاً

(18) ٹی کوئن (T.Coen)، صفحہ 147

(19) ملک اللہ بخش، صفحہ 350-354

(20) ایضاً، صفحہ 357-358 اور ''بولان'' مورخہ 19 مارچ، 1948ء

(21) ایضاً

(22) ایضاً اور میر گل خان نصیر، تاریخِ بلوچستان، جلد دوم، صفحہ 528-534

(23) عنایت اللہ بلوچ، Jinnah-Khan of Kalat Correspondence، صفحہ 24 (غیر مطبوعہ)

Scanned by CamScanner

(24) میر احمد یار خان بلوچ، The Partition of India-Its Effects on Kalat State، صفحہ 18-17 (غیر مطبوعہ)

(25) ایضاً، صفحہ 21

(26) سید ایم فاروق احمد کے مطابق ''جام لسبیلہ ،غلام قادر کا بیان''، تاریخ پاکستان اور بلوچستان، صفحہ 127-126

(27) سید ایم فاروق احمد، صفحہ 128-127

(28) میر احمد یار خان بلوچ، The Partition of India-Its Effects on Kalat State، صفحہ 20 (غیر مطبوعہ)

(29) خان، میر احمد یار خانِ قلات کے ساتھ انٹرویو

(30) سید فاروق احمد کے مطابق ''جام لسبیلہ اور نوابزادہ شیر عمر آف مکران کا بیان''، صفحہ 20

(31) IOR L/P+S/13/1846 and 1847۔

(32) سید فاروق احمد کے مطابق، نوابزادہ شیر عمر آف مکران کا بیان، صفحہ 137-133

(33) چوہدری محمد علی، Emergence of Pakistan، صفحہ 282

(34) چودھری محمد علی، Emergence of Pakistan، صفحہ 282

(35) L/P+S/131/1847۔

(36) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو۔ ٹی کوئن (T.Coen) بھی ملاحظہ کیجئے۔

(37) L/P+S/131/1847۔

(38) L/P+S/131/1847۔

(39) IOR R/3/1/166۔

(40) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو

(41) شیر محمد مری کے ساتھ انٹرویو

(42) مسٹر فیل، گل خان نصیر اور میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ انٹرویو

(43) ایم سردار خان بلوچ، History of Baluch Race and Baluchistan، صفحہ 126-125

(44) ٹی کوئن (T.Coen)، صفحہ 147-146

Scanned by CamScanner

(45) میر احمد یار خان بلوچ، Inside Baluchistan، صفحہ 162

(46) ایضاً

(47) IOR L/P+S/13/1847

(48) میر احمد یار بلوچ، Inside Balochistan صفحہ 164

(49) میر احمد یار بلوچ، Inside Balochistan صفحہ 164

(50) عنایت اللہ بلوچ، قائداعظم اور بلوچستان، دسمبر 1976، جنوری 1977

(51) کے بی نظامانی، Kuch Yadeen in Peoples Front، مئی 1980ء

(52) خانِ قلات کے نام پرنس عبدالکریم کا خط، Prince Abdul Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(53) سلیگ ایس ہیریسن (Selig S.Harrison) کی کتاب In Afghanistan's Shadow، صفحہ 26

(54) مسٹر فیل (Mr.Fell) کے ساتھ انٹرویو

(55) قادر بخش نظامانی، کچھ یادیں، پرشین فرنٹ، مئی 1980ء

(56)- Prince Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(57)- Prince Karim versus Pakistan State (غیر مطبوعہ)

(58) تفصیل کے لیے دیکھئے، Prince Abdul Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(59) ایضاً

(60) ایضاً

(61) تفصیل کے لیے دیکھئے، Prince Abdul Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(62) منشی سلطان محمود خان، The Life of the Abdur Rehman,Amir of Afghansistan، جلد دوم، صفحہ 212

(63) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: رحمٰن پزواک کی کتاب، پختونستان

(64) تفصیل کے لیے دیکھئے: Abdul Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(65) ایضاً

Scanned by CamScanner

(66) تفصیل کے لیے دیکھئے: سلیگ ایس ہیریسن کی کتاب،

In Afghanistan's Shadow

(67) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: Prince Abdul Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(68) ایضاً

(69) روزنامہ ڈان، مورخہ 14 اگست 1960ء، جمنا داس اختر کی کتاب،

Political Conspiracies in Pakistan، صفحہ 49-50

(70) روزنامہ ڈان، مورخہ 14 اگست 1960ء، جمنا داس اختر کی کتاب،

Political Conspiracies in Pakistan، صفحہ 49-50

(71) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: Prince Abdul Karim versus Pakistan State، (غیر مطبوعہ)

(72) دلچسپ مطالعے کے لیے سلیگ ایس ہیریسن (Selig S.Harrison) کی کتاب In Afghanistan Shadow ملاحظہ کیجئے۔

(حصہ دوم)

ضمیمہ جات

(1) میر احمد یار خان کی کتاب، تاریخ قومِ بلوچ و خوانین بلوچ، صفحہ 126 اور ملک خدا بخش کی کتاب کے صفحہ 48-47 سے ماخوذ

(2) امورِ قلات کے متعلق اخبارات بذریعہ بلوچستان نمبر 1، لندن، 1877ء

(3) مُور (Moore)، International Law Digest، جلد اوّل، صفحہ 19-20

(4) بین الاقوامی مستقل عدالت انصاف کی مشاورتی رائے، سلسلہ B، صفحہ 21

(5) Calvo,Le Droit International-، جلد اوّل، صفحہ 172

(6) ولہم (Welhelm)، Theories Juridique des Protectorats، صفحہ 205

(7) حکومت ہند اور خانِ قلات کے درمیان طے پانے والا معاہدہ ۔ بلوچستان نمبر 2 میں دیکھئے، صفحہ 127، صفحہ 95

(8) ہندوستان کی مغربی اور شمال مشرقی سرحدوں کی تنظیم نو کے متعلق اخبارات (بلوچستان نمبر 3 کے مطابق)، صفحہ 13، پیرا 1 اور صفحہ 15، پیرا 9

Scanned by CamScanner

(9)امورِ قلات کے متعلق اخبارات (بلوچستان نمبر 1 کے مطابق)، صفحہ 530

(10) سر ڈبلیو ایل میرویدر کی جانب سے گورنر اور پریذیڈنٹ اِن کونسل، بمبئی کو لکھا گیا خط مورخہ 5 اپریل 1872ء ملاحظہ کیجئے۔

(11)بلوچستان نمبر 3، صفحہ 53

(12)دیکھئے Baluchistan District Gazetteer Series,Kharan، صفحہ 31

(13)۔Baluchistan District Gazetteer، خاران، صفحہ 37

(14)بلوچستان نمبر 1، صفحہ 106

(15)بلوچستان نمبر 1، صفحہ 180

(16)ملاحظہ کیجئے، بلوچستان نمبر 1، صفحہ 4 اور 253

(17)ملاحظہ کیجئے، ایچیسن (Aitchison)، Treaties,Engagements and Sanads، جلد XI، صفحہ 343

(18)بلوچستان نمبر 2، صفحہ 22

(19)۔Op.cit، صفحہ 87

(20)بلوچستان نمبر 2، صفحہ 122

(21)بلوچستان نمبر 1، صفحہ 86

(22)بلوچستان نمبر 1، صفحہ 409

(23)بلوچستان نمبر 1، صفحہ 409

(24)بلوچستان نمبر 7، صفحہ 239

(25)اوپنہم Oppenheim، International Law، جلد اوّل، صفحہ 353۔ اس کے علاوہ پٹ کوبٹ Pitt Cobbett، Leading Cases on International Law، صفحہ 118 بھی ملاحظہ کیجئے۔

(26)ہال (Hall)، International Law، صفحہ 93

(27)بمطابق امریکی ملکی اخبارات، Foreign Relations,II صفحہ 581-682 (Moore,Digest of International Law، صفحہ 281 میں مذکور)

(28)اوپنہیم کی International Law، جلد اوّل، صفحہ 433، مزید برآں ہیفلر (Heffler)، Das Europiisches Volkerrecht، صفحہ 69 بھی ملاحظہ کیجئے۔

Scanned by CamScanner

(29) مور (Moore)، صفحہ 306 بہ حوالہ United States v Reynes، 9 ہاورڈ، 127

(30) ہال، International Law، صفحہ 49۔

(31) مور، مندرجہ بالا، صفحہ 274، بہ حوالہ United States v Reynes

Scanned by CamScanner

منتخب کتابیات

1. غیر مطبوعہ ریکارڈ

(انڈیا آفس ریکارڈ اور پبلک ریکارڈ آفس سے مندرجہ ذیل مسلوں (files) اور نجی کاغذات کا مطالعہ کیا گیا اور ان سے مدد حاصل کی گئی)۔

IOR.L/P-S/10/37,733,875,1136

IOR.L/P-S/12/1846,1847,3548

IOR.L/P-S/12/45,1150,3168,3174 Col 23/48

IOR.L/P-S/13/1846,1847 and 1843

IOR.MIL/17/13/29(1,2,3)

IOR.1/34/63,54

R.1/35/1,131,63 -

R.3/1/55 -

R.3/1/166 -

V.37(1840) -

PRO.F.O.37/File82

IOR MSS EUR D 696/3

F 11/54,9 -

F 131/8/F.131/10 -

Scanned by CamScanner

F.695/5,2 -

بلوچستان کے متعلق جنرل مونی کا میمورنڈم (1944)، وار آفس، لندن

2. غیر مطبوعہ کتب اور کاغذات:۔

عنایت اللہ بلوچ:

انجمن اتحاد بلوچستان اور ریاست قلات نیشنل پارٹی کے متعلق دستاویزات (1929-1948)۔ کمیشن برائے تاریخی اور کلچرل ریکارڈ (NCHCR) اسلام آباد، 1975ء

عنایت اللہ بلوچ: افغان جرگہ: ریڈ شرٹس تحریک کا دستاویزی جائزہ، (NCHCR)، اسلام آباد، 1976ء

عنایت اللہ بلوچ:

جناح اور خانِ قلات کے درمیان خط و کتابت، (NCHCR)، اسلام آباد، 1977ء

میر احمد یار خان بلوچ: ہندوستان کی تقسیم: قلات پر اس کے اثرات، سلیگ ہیریسن کی The Roots of Baluch Nationalism، واشنگٹن، 1980ء

پرنس کریم بمقابلہ پاکستان سٹیٹ، کوئٹہ، 1948ء

ڈی وائی فیل کے نجی کاغذات

3. پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالہ جات

ٹی اے ہیتھکوٹ، British Policy and Balochistan(1854-1876)، یونیورسٹی آف لندن، 1969ء

نینا سونڈلر، The Political Structure of a Tribal Federation

ڈبلیو اے ولکوکس، The Politcal Assimilation of the Princely States of Pakistan، کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک، 1960ء

سی یہر، Present Economy and Political Development of Baluchistan States of Pakistan، یونیورسٹی آف الوینس، 1954ء

کتب

Essay on Freedom and Power، لندن، 1956، از ایکٹن، یو۔ ای۔ ای۔ ڈی۔

Scanned by CamScanner

Administration Report of Baluchistan Agency، برائے یکم اپریل 1933ء تا 31 مارچ، 1933، نیو دہلی، 1935ء

Administration Report of Baluchistan Agency برائے سال 1932-193، کلکتہ 1933ء

افغان انفارمیشن بیورو: The Pakhtun Question، رُوو سسیکس، 1951ء عبدالمجید افغانی، تاریخ افغانستان، آگرہ (اردو)

جمال الدین افغانی، تاریخ افغانستان (TatimatuBayan-fi-Tarikh-al-Afghan کا ترجمہ)، لاہور (اردو)

رفیق ایم افضل، Selected Speeaches and Statements of Quaid-e-Azam M.A.Jinnah، لاہور، 1960ء

اے احمد اور وان گرونبام جی ای Muslim Self Statement in India and Pakistan(1857-1969)، Wresbaden، 1970ء

اشتیاق احمد، Anglo-Iranian Relations(1905-1919)، بمبئی، 1974ء

رضوان احمد، Sayign s of Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah، کراچی، 1974ء (اردو)

سید فاروق احمد، تاریخ پاکستان اور بلوچستان، کراچی (اردو)

سی یو ایچی سن، A Collection of Treaties, Engagements and Sanad Relating to India and Neighbouring Countries، گیارہویں اور تیرہویں جلد، دہلی 1933ء

عبدالاکبر خان، اکبر، کاروانِ آزادی، پشاور، (اردو، پشتو)

جے ڈی اختر، Politcal Conspiracies my Pakistan:Liaqat Ali's Murder to Ayub Khan's Exit، نئی دہلی، 1969ء

چودھری محمد علی، The Emergence of Pakistan، نیویارک اور لندن، 1967ء

ملک اللہ بخش، تاریخ خوانین بلوچستان، کوئٹہ 1970ء (اردو) پبلشر گوشہء ادب کوئٹہ

ڈبلیو پی اینڈریو، Our Scientific Frontier، لندن 1880ء۔ انجمن اتحادِ بلوچستان، شمس گردی، کوئٹہ، 1931ء (اردو)، ایم عنقا، Russian:Rahil Koh، کراچی، 1935ء

کے لیون انٹووا، یونگارڈ کوٹوسکی جی، History of India (دو جلدوں میں)، ماسکو 1978ء

Scanned by CamScanner

عوامی پریس لمیٹڈ، اور بیان اپنا، لاہور 1976ء (اردو)

کے عزیز، The Making of Pakistan,A Study in Nationalism، لندن 1976ء

نصیر عسکری، مقدمہ بر شناخت سیستان و بلوچستان، تہران، 1357، (فارسی)

محمد اشرف، ہندوستانی مسلم سیاست ایک نظر، دہلی 1963ء (اردو)

محمد اشرف قاضی، Imgoctant Punjab Acts(as amended upto 31 October 1951 with Commentary) جلد سوم، لاہور، 1951ء

محمد ظہیر الدین بابر پادشاہ غازی، بابر نامہ (بابر کی یادداشتیں)، ترکی زبان میں اصل کتاب کا ترجمہ از انیت سسناہ بوریج، نئی دہلی 1922ء

لیڈی بیٹی بلفور، The History of Lord Lytton;s Indian Administration، 1876ء تا 1880ء، لندن 1899ء

ایم اے بلوچ، گجراک و خدابدن وقلات کے حملہ کی تفصیل، کوئٹہ، 1940ء (اردو)

میر خدا بخش بجارانی بلوچ، Seachlights on Baloches and Balochistan، کراچی، 1974ء

میر خدا بخش بجارانی مری بلوچ، از منہ بلوچ، تاریخ و روایات،، کوئٹہ، 1965، (اردو) گوشہ ادب کوئٹہ

میر خدا بخش مری بلوچ، قدیم بلوچی شاعری، کوئٹہ (بلوچی راردو) پبلشر گوشہ ادب کوئٹہ

میر احمد خان بلوچ، بلوچ قوم کے نام خانِ بلوچ کا پیغام، کراچی، 1973ء، (اردو)

میر احمد یار خان بلوچ، مختصر تاریخ بلوچ و خوانین بلوچ، (اردو) پبلشر گوشہ ادب کوئٹہ

میر احمد یار خان بلوچ، Inside Baluchistan - A Political Autobiography of His Highness Baiglar Baigi:Khan-e-Azam XIII، کراچی 1975ء

میر سردار خان بلوچ، The Great Baluch, The Life and Times of Ameer Chakar Rind 1454-1551 A.D، کوئٹہ 1963ء

محمد سردار خان بلوچ، History of Baluch Race and Baluchistan، کوئٹہ 1977ء

محمد سردار خان بلوچ، A Literary History of the Baluchistan، کوئٹہ 1977ء (سیلز اینڈ سروسز)

بلوچستان نمبر 1۔ امور قلات سے متعلق کاغذات کو ملک معظم کے حکم سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کیا گیا، لندن 1877ء

Scanned by CamScanner

بلوچستان نمبر2۔8دسمبر1876ء کو ہندوستان کی برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے درمیان معاہدہ سے متعلق کاغذات کوملک معظم کے حکم سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کیا گیا،لندن1877ء
بلوچستان نمبر3۔ہندوستان کی مشرقی اور شمالی سرحدوں کی ازسرِنوتشکیل سے متعلق کاغذات کوملک معظم کے حکم سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کیا گیا،لندن1878ء
بلوچستان کی سچی کہانی،لاہور(اردو)
عبدالکریم انقلابی،بلوچستانی،بلوچستان میں ریاستوں کی آزادی،کوئٹہ1940ء(اردو)
محمد برکی،نذر بلوچستان سفر نامہ،تہران 1953ء(فارسی)۔سوجن رائے بٹالوی،خلاصہ التواریخ، لاہور1966ء۔ایچ ڈبلیو بیلو،Afghanistan،کلکتہ 1908ء
روبن بلیک برن،Revolution and Class Struggle،لندن1977ء
ارون کومر بوس، Indian Revolution Abroad,1905-1922.In the background of International Development،پٹنہ1971ء
ٹی۔گورڈن باؤلز،The Peoples of Asia،لندن1977ء
ڈینیز برے،Census of India 1911، جلد چہارم،بلوچستان،کلکتہ1913ء۔ڈینز برے، The Life History of a Rrahui،کراچی1977ء۔
آرجے بروس،Notes on Baluch Traibes of Dejarat،گوشہءادب کوئٹہ
آرجے بروس،The Forward Policy and its Results،پبلشر گوشہءادب کوئٹہ
آرجے بروس، History of the Marri Baluch Tribes and its Relations with Bugti Tribe،لاہور1884ء
آئی برتھل،Geschichte der Internationale,Band 1،بون1978ء۔آر۔ایف برٹن، Sind Revisited،لندن1877ء۔چغابزدار،Chighai Guffar،کوئٹہ1975ء(بلوچی)
بریٹون بش کوپر،Britain and the Persian Gulf 1894-1974،برکلے1967ء
ای ایچ کار،A History of Soviet Russia. The Bolschevik Revolution(1917-1923)، جلدسوم،مڈلسیکس،لندن1965/1977ء
جیرارڈ کیلینیو،People Without A Country - The Kurds and Kurdistan،لندن 1980ء۔کی

Scanned by CamScanner

ہوئی چیانگ، China meen Qaumi Sawal، کراچی 1977ء (اردو ترجمہ)

جی ایس چھابڑا، The Advanced History of the Punjab، جلد دوم (Ranjit Singh and post Ranjit Singh Period)، لدھیانہ 1962ء

جی ایل چوپڑا، Chiefs and Families of Note in the Punjab، جلد سوم، لاہور 1940ء۔

الفریڈ کوبان، National Self Determination، شکاگو 1949ء

ٹیرنز کریغ کوئن، The Indian Political Survice,A Study in Indirect Rule، لندن 1971ء

ستیابراٹا رائے چودھری، Leftists Movement in India 1917-1947، کلکتہ 1976ء

والٹر کونور، The Nationaol Question in Marxist-Lennist Theory and Strate، پرنسٹن، 1984ء

ڈبلیو رچرڈ کوٹم، Nationalism in Iran، پٹوبرگ، 1964ء

جی این کرزن، Persia and the Persian، دو جلدیں، لندن۔

سٹیفنی ڈالے، Mari and Kunana:Tow old Babylonion cities، ایسکس

لانگ ورتھ ایم ڈیمز، The Baloch Race, A Historical and Ethnological Sketch، لندن 1904ء

اشاعت دوم سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

لانگ ورتھ ایم ڈیمز، PopularPoetryoftheBaloches، دو جلدیں، لندن 1907ء (گوشہء ادب کوئٹہ)

سی کو یبٹ ڈیویز، The Problem of the North-West Frontier 1890-1900 (with a survey of Policy since 1849)، لندن 1971ء (پہلی دفعہ اشاعت 1932ء)

ہوریس بی ڈیوس، The National Question-- Selected writings by Rosa Luxemburg، نیویارک 1976ء

اعلان آزادی، امریکی آئین، نیویارک

ڈبلیو کارل ڈوشے، Nationalism and Social Communication, An Enquiry into Foundation of Nationality، کیمبرج 1953ء

دستور العمل، An uman-e-watan، کوئٹہ 1938ء (اردو)

اے ایچ ڈانک، Customary Law of the Dera Ghazi Khan District، لاہور

ڈیوڈ ڈلکس، Curzon in India، دو جلدیں، لندن 1969ء

Scanned by CamScanner

ایڈرائین اے ڈیوارٹ، A History of British Relation with Sind، کراچی

ایچ ایم ڈیورنڈ، The First Afghan War and Its Causes، لندن 1879ء

آر ای ڈائیر، The Raiders of the Sarhad، لندن 1921ء

ایل ڈُپری، Afghanistan، پرنسٹن، 1973ء

ای آر ایلس، The Military Georaphy of Afghanistan، کلکتہ، 1893

ماؤنٹسٹارٹ ایلفنسٹون، An Account of the Kingdom of Caubul and its Dependence in Persia, Tartary, and India,Comprising a View of the Afghan Nation, and a History of the Dooraunee Monarchy، دو جلدیں، لندن 1839ء

ٹی اینسلی ایمبری، Pakistan's Western Borderlands, The Transformation of a Political Order، نیو دہلی، 1977ء

رابرٹ ایمرسن، From Empire to Nationa, The Rise to Self-Assertion of Asian and African Peoples، روسٹن، 1960ء

انسائیکلوبراٹینیکا، جلد دوم، شکاگو لندن، 1978ء۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (نیا ایڈیشن)، جلد اوّل، لیڈن، 1960ء

سی سٹینڈفورڈ۔ Soviet Russia and the Fas 1920-1927 A Documentary Survey، 1957ء

مولانا نور احمد خان فریدی، بلوچ قوم اور اس کی تاریخ، ملتان 1967ء (اردو)

ایم فاروقی، Pakista,Policies that led to Breakup، نیو دہلی، 1972ء

جی ای فیشنیشٹ، Acton's Political Philosophy.An Analysis، لندن 11

ابوالفضل، The Akbar Nama (ترجمہ از ایچ۔ بیوریج)، دہلی، 1975

سائیوتنگ فی، Towards People's Anthropology، بیجنگ، 1961ء

ایچ فیلڈ، Contribution to The Anthropology of Iran، شکاگو، 1939ء

محمود فیاض، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد XIV

ارنسٹ آیسکوغ فلویئر، Unexpected Baluchistan, A Survey with Observations,Astronomical, Geographical, Botanical etc.، کوئٹہ 1977ء (پہلی دفعہ

Scanned by CamScanner

اشاعت 1882ء)

گسٹیو فوشلر ہاک، Der Fischer Weltalmanach 1980، فرینکفرٹ 1979ء (جرمن)

ڈبلیو جارج فارسٹ، Selection from the Travels and Journals Preserved in the Bombay Secretariat، بمبئی، 1906ء

شیر محمد گنڈاپوری، تاریخ خورشید جہان، لاہور، 1894ء (فارسی) (گوشہء ادب کوئٹہ)

وائی وی گینکوسکی رگورڈن ایل۔آر، A History of Pakistan(1947-1958)، لاہور، 1966ء

وائی وی گینکوسکی، The Peoples of Pakistan,An Ethnic History، ماسکو، 1971ء

البرٹ گیسٹیگر، From Tehran to Baluchistan (جرمن سے ترجمہ)، شملہ، 1884ء

عبدالرحمٰن غور، ہماری جدوجہد، بلوچستان میں جدوجہد آزادی کی داستان، کوئٹہ (اردو)

عبدالرحمٰن غور، نغمۂ کوثر، کوئٹہ (بلوچی رارد و)، گوشہء ادب کوئٹہ

عبدالرحمٰن غور، Kurdistan and the Kurds، پراگ، 1965ء

ایم گوہر، Afghanistan dar Masir-e-marikh Kabul,1967، (فارسی)

جارج واٹرز گلبرٹسن، The Balochi Language, A Grammar and Manual، ہرٹفورڈ، 1923ء

عبدالکریم گولا کی کتاب، محمد حسین عنقا، کوئٹہ 1970ء

روز لاوزی گریوز، Persia and the Defence of India, A Study in the Foreign Policy of the Third Marquis of Salisbury، لندن 1959ء

ڈبلیو گریسنگر، German Intrigues in Persia, A Diary of a German Agent, The Niedermayer Expedition Through Persia to Afghanistan And India، (جرمن سے ترجمہ)، لندن 1916ء

آئی آر یگولویچ اور ایس وائی کوزلوف، Races and Peoples, contempofary Ethnic and Racial Problems، ماسکو 1974ء

آئی خروشیف، A Faternal Family of Nations، ماسکو 1967ء

Mughal History of Punjab، لاہور

اے ایچ حبیبی، مختصر تاریخ افغانستان، جلد دوم، کابل، 1970ء (فارسی)

Scanned by CamScanner

جی سائلویا ہائم، Arb Nationalism, An Anthropology، برکلے 1976ء

فریڈ ہالیڈے، Iran:Dictatorship and Development، ہارمنڈز ورتھ، 1979ء

قاضی عبدالحمید، The All Pakistan Legal Decisions، نویں جلد، لاہور 1962ء

ایچ بی حنا، Can Russia invade India?، لندن 1895ء

ایس سلیگ ہیریسن، In Afghanistan's Shadow:Baluch Nationalism and Soveit Temptations، نیویارک 1981ء (اشاعت دوم گوشہ ادب کوئٹہ)

محمد حسن، بلوچستان، ماضی حال اور مستقبل، گوشہء ادب کوئٹہ

محمد انور ہراوی، لشکر احمد شاہ درانی، کابل 1969ء (فارسی)

اے ڈبلیو ہفز، The Country of Baluchistan,its Geography, Topography, Ethnology and History، کوئٹہ 1975ء

آر بلر ہفز، Baluchistan، کلکتہ، 1908ء

ایچ ایچ ہنٹر، The Imperial Gazetter of India، جلد اوّل، لندن 1881ء

حکومت ہندوستان، (محکمہ خارجہ)، Report showing the Relations of the Brithish Government with the Tribes independent and dependent on the North West Frontier of Punjab; From Annexation in 1849 to the close of 1855, District Memorandum,Dera Ismail Khan، کلکتہ 1856ء

حکومتِ ہندوستان، Census of India 1911، جلد چہارم، بلوچستان؛ کلکتہ 1913ء

حکومت ہندوستان، Census of India 1911، جلد XIII: North West Frontier، پشاور 1912ء

حکومت ہندوستان، Desnatch on Proposals for constitutal Reforms، شملہ 1930ء

ہندوستان، امپیریل گزیٹر، Provincial Series، بلوچستان، لاہور 1976ء (پہلی دفعہ اشاعت، کلکتہ 1908ء)

حکومتِ ہندوستان، Baluchistan and First Afghan War، کلکتہ 1910ء

حکومت ہندوستان، Khelat Affairs. Selection from Government Record، کوئٹہ 1977ء (پہلی دفعہ اشاعت 1872ء)

Scanned by CamScanner

حکومتِ ہندوستان، Mardum Shumari Hindustan Fahrist

Agwam-e-Reluchistan، کوئٹہ 1941ء

حکومتِ ہندوستان، Military Report on Persia، جلد چہارم، شملہ 1923ء

افضل اقبال، Circumstances Leading to the First Afghan War، لاہور 1975ء

آر این اسمگلیوا، Ethnic Problems of the Tropical Africa, Can They Be Solved?،
ماسکو 1978ء

انٹیلی جینس برانچ، شملہ، Frontier And Overseas Expeditions From India، جلد سوم،
Baluchistan And The Frist War، کلکتہ 1909ء

شیخ اکرام، Mauj-e-Kausar، لاہور 1962ء (اردو)

امان اللہ جہانبانی، Amali,at-e-Quashun der Baluchistan، تہران، 1951ء (اردو)

امان اللہ جہانبانی، Serguzasht Baluchistan wa Marzhai، تہران (فارسی)

The events in East Pakistan, 'The Secretariat of The International Commission,Jurists
A Legal Study، جنیوا، 1977ء

حکومتِ قلات، Debates of Kalat Parliament، کوئٹہ 1947ء (اردو)

حکومتِ قلات، حکومت قلات کا اعلان، کوئٹہ 1947ء (اردو)

ایم عبدالکریم، واقعاتِ درانی، لاہور 1963ء (تاریخِ احمد کا اردو ترجمہ)

ریاستِ قلات کی نیشنل پارٹی، منشور، لاہور، 1937ء (اردو)

ریاستِ قلات کی نیشنل پارٹی، دستور، لاہور، 1938ء (اردو)

ریاستِ قلات کی نیشنل پارٹی، ریاست قلات کی ہندوستان سے علیحدگی کا مسئلہ، کوئٹہ، 1946ء (اردو)

نیفتلا خالفن، British Plots Against Afghanistan, Page from History، ماسکو، 1981ء

ایچ کے کاکڑ، Government And Society in Afghanista, The Reign of Amir Abdul
Rehman، آسٹن 1979ء

کیسنیگر البرٹ خان، From Tehran to Balochistan (جرمن سے ترجمہ)، شملہ، 1884ء

محمد امتیاز خان، Baluchistan، لندن، 1950ء

Scanned by CamScanner

انعام الحق کوثر، تحریک پاکستان میں بلوچستان کا حصہ، اسلام آباد، 1976ء (اردو)

انعام الحق کوثر، Pakistan Movement in Pakistan، اسلام آباد 1976ء

ہینز کوہن، The Idea of Nationalism, A Study in its Origins and Background، نیویارک 1944ء

موہن لال، Amir Dost Muhammad Khan of Kabul، جلد اوّل و دوم، لندن 1846ء

ایچ ٹی لیمبرک، Sir Charles Napier and Sind، آکسفورڈ 1952ء

ایچ ٹی لیمبرک، John Jacob of Jacobabad، آکسفورڈ 1952ء

کے ایس لیمبٹن، Landlord and Peasant in Persia، لندن، 1969ء

وی لینن، Critical Remarks on the National Question, The Right of Nations to Self-Determination، ماسکو، 1971ء

وی لینن، The National Liberation Movement in the East، ماسکو 1974ء

جے جی لورئر، Gazetteer of Persian Gulf، دو جلدیں، کلکتہ، 1915ء

روسا لکسمبرگ، The National Question, Selected Writings (edite by Horace B.Davis)، نیویارک، 1976ء

میری لٹن، The Lyttons in India-An Account of Lord Lytton's Vice Royalty(1876-1880)، لندن، 1979ء

سی ایم میک گریگر، Wandering in Baluchistan، لندن، 1882ء

سی ایم میک گریگر، Cental Asia.Baluchistan، لندن، 1875ء

جارج ایف میک موہن، The Indian Estates and Princes، لندن، 1936ء

ایف ہیکیسن، Remarks on Baluch Tribes، احمد پور، 1835ء

حفیظ ملک، Muslem Nationalism in India and Pakistan، لاہور، 1980ء

جی بی میلیسن، History of Afghanistan-From the earliest period to the outbreak of war 1878، لندن، 1879ء

ہندوستان کی مردم شماری، فہرست اقوامِ بلوچستان، کوئٹہ، 1941ء (اردو)

Scanned by CamScanner

مٹھا خان مری، رحم علی مری، کوئٹہ، 1978ء

کے مارکس، The First International and After، جلد سوم، لندن، 1981ء

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز، Ireland and the Irish Question، ماسکو، 1971ء

کے مارکس اور ایف اینگلز، Selected Works، جلد اوّل، ماسکو

کے مارکس اور ایف اینگلز، On Colonialism، ماسکو، 1974ء

چارلس میسن، Narrative of Various Journes in Balochistan, Afghanistan, the Punjab and Kalat، کراچی، 1977 (پہلی اشاعت 1844ء) اشاعت دوم گوشہء ادب کوئٹہ

چارلس میسن، Narrative of a Journey to Kalat، لندن، 1843ء گوشہء ادب کوئٹہ

سائیکویا اے میتھیسن، The Tigers of Baluchistan، لندن، 1967ء

غلام رسول مہر، عمر حیات ٹوانہ، لاہور، 1965ء (اردو)

پی مہرا، North Western Frontier and British India 1839-1942، چندی گڑھ، 1978ء

میرپ کی رپورٹ، Soviet Policy in the Middle East، واشنگٹن

میک کونیغی اے، Sibi District, Baluchistan District Gazetter Series، جلد سوم، بمبئی، 1907ء

جان ایس مل، Consideration on Representaive Government، لندن، 1861ء

ای موکلر، A Grammar of the Baloochee Language، لندن، 1877ء

پینیڈرل مون، Wavell, The Viceroy's Journal، لندن، 1973ء

محمود الحسن منشی، تاریخ احمد شاہی، دو جلدیں، ماسکو، (فارسی)

ذبیح اللہ ناصح، بلوچستان، تہران، 1344ء، (فارسی)

گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، کوئٹہ، 1979ء (بلوچی) گوشہء ادب کوئٹہ

گل خان نصیر، شے گاروک، کراچی، 1964ء، (بلوچی)

گل خان نصیر، کوچ و بلوچ، کراچی، 1969ء (اردو) پبلشرز سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

گل خان نصیر، تاریخ بلوچستان، دو جلدیں، کوئٹہ، 1952/1954ء (اردو) پبلشرز سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

جے نہرو، The Discovery of India، لندن، 1956ء

پیٹر نیٹل، روسا لکسمبرگ، لندن، 1969ء

Scanned by CamScanner

آسکروان نیدرمیئر، Unter der Glutsonne Irans، میونخ، 1925ء، (جرمن)

ایڈورڈ ای اولیور، Across the Border or Pathan and Bloch، لندن، 1890ء

گل خان نصیر، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، (بلوچی/اردو) پبلشرز سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

جینی ڈی اوور سٹیٹ اور مارشل ونڈ ملر، Communism in India، برکلے، 1959ء

حکومتِ پاکستان، Baluchistan، کوئٹہ، 1948ء

حکومت پاکستان، Census of Pakistan, Baluchistan, 1951، جلد دوم، کراچی، 1958ء

حکومتِ پاکستان، District Census Report, Jacobabad District، کراچی، 1962ء

حکومت پاکستان، (A note on the Hari Movement in Sindh (secret and confidential)،
کراچی، 1952ء

ایم پناھیان، Farhang Jughrafiyai Milli Baluchistan، بغداد، (فارسی)

کے ایم پینیکر، India and the Indian Ocean; An Essay on the Influence of Sea Power on
Indian History، لندن، 1946ء

رحمان پزواک، Pashtunistan، لندن، 1960ء

برائن پیریس، Baku Congress of the Peoples of the East Baku، ستمبر 1920ء، Stenographic
Report، لندن، 1977ء، (پہلی دفعہ اشاعت: پیٹروگراڈ (روس) 1920ء)

وائی ڈی فدکے، Politics and Language، بمبئی، 1971ء

ایم جی پیکولن، Beludzhei;Istoriia I Ekonimia، ماسکو، 1959ء (روسی)

مانک بی پتھاوالا، The Problem of Baluchistan، کراچی، 1953ء

ہنری پوٹنگر، Travels in Baluchistan and Sinde، لندن، 1816ء

ایچ پوزڈا، Das Dashtiary-Gebiet in Persisch-Belutschistan، وائن، 1978ء (جرمن)

نور محمد قاضی، جنگ نامہ، (یہ کتاب 1772ء میں میر ناصر خان اعظم کے دورِ حکومت میں لکھی گئی اور خالصہ
کالج، امرتسر نے اسے شائع کیا)، لاہور، 1933ء

اے قزلباش، بلوچوں کے رومان، مستونگ، 1962ء (اردو)

غلام رسول قرائے، تاریخ بلوچستان، لاہور، (اردو)

Scanned by CamScanner

جمعیت دیوان رائے، The Domiciled Hindus، دہلی، 1974ء (پہلی دفعہ اشاعت 1913ء)

سیدی علی رئیس، Miratul Memalik، استنبول، 1895ء (ترکی)

ہتو رام، تاریخ بلوچستان، کوئٹہ، 1973ء (پہلی بار اشاعت 1904ء) پبلشرز سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

ہتو رام، Sandeman in Baluchistan، کلکتہ، 1916ء پبلشرز سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

ہتو رام، گل بابر، لاہور، 1873ء (اردو)

ایچ جی ریورٹی، Notes on Afghanistan and Baluchistan، لاہور، 1976ء (پہلی بار اشاعت 1878ء)

جی رالنسن، Five Great Moranchies of the Ancient Eastern World، دو جلدیں، لندن، 1862ء

ایم راولسن، England and Russia in the East، لندن، 1875ء

ایم رضوی، The Frontiers of Pakistan's Foreign Policy، کراچی، 1971ء

ایچ ایچ رزلے، Census of India(1901)، جلد اوّل، کلکتہ، 1903ء

ایچ اے روس، A Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and N.W.F.Province، لاہور، 1911ء

ای سی روس، Memorandum on Makran، بمبئی، 1868ء

ڈائٹمر روتھرمنڈ، Asian Trade and European Expansion in the Age of Mercantilism، دہلی، 1981ء

ڈائٹمر روتھرمنڈ، The Phases of Indian Nationalism and other Essays، بمبئی، 1970ء

ملک سعید دہوار، بلوچستان ماقبل تاریخ، کوئٹہ، 1971ء (اردو) پبلشرز سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

تلک راج سریں، Russian Revolution and India، نئی دہلی

جودا ناتھ سرکار، Nadir Shah in India، کلکتہ، 1973ء، (پہلی دفعہ اشاعت 1925ء)

جے سیکسینا، Right of Self Dtermination:From Biafra to Balgla Desh، نئی دہلی، 1978ء

خالد بی سید، Pakistan - The Fromative Phase 1857-1944، لندن، 1968ء

وِک شنرسن (ترجمہ)، Leninism and the National Question، ماسکو، 1974ء

فریڈ شالز، Baluchistan(Pakistan)، گوٹنگن، 1974ء (جرمن)

Scanned by CamScanner

ایس پی سین، The French in India (1763-1816)، کلکتہ، 1958ء

آر بی سرجنٹ، The Portuguese of South Arabian Coast، آکسفورڈ، 1963ء

یعقوب شاہ، Census of Pakistan,1951، دوسری جلد، Baluchistan Reports and Tables، کراچی، 1952ء

مولوی شہیدی (رحیم داد خان)، بلوچستان کی مختصر تاریخ، سکھر، 1941ء (سندھی)

ایل پی سین، The Left Wing in India(1917-1919)، مظفر پور، 1968ء

حکومتِ سندھ، Selection from the Pre-Mutiny Record of the Commissioner in Sind

مولانا عبیداللہ سندھی، کابل میں سات سال، لاہور، 1352 A.H، (اردو)

گنڈا سنگھ، Ahmad Shah Durrani, Father of Modern Afghanistan، بمبئی، 1955ء

ای سمتھ، The Perso-Baluch Frontier(1870-1871),Eastern Persia، لندن، 1876ء

جے وی سٹالن، Collected Wroks، جلد دوم، ماسکو، 1953ء

جے وی سٹالن، The Foundations of Leninism، ترانا، 1959ء

پرسی سائیکس، A History of Persia، دو جلدیں، لندن، 1963ء (پہلی دفعہ اشاعت 1915ء)

پرسی سائکس، A History of Afghanistan، دو جلدیں، لندن، 1940ء

پرسی سائکس مولسورتھ، Ten thousand Miles in Persia or Eight Years in Iran، لندن، 1902ء

جی پی ٹیٹ، Seistan - A Memoir on the History, Tography, Ruins and People of the Country، کوئٹہ، 1977ء (پہلی دفعہ اشاعت 1910ء) پبلشر سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

اے طیب، Pakistan, A Political Geography، لندن، 1966ء

تھامس ایچ تھارنٹن، Col.Sir Robert Sandeman، لندن، 1895ء پبلشر گوشہء ادب کوئٹہ

ایل جے ٹروٹر، The Bayard of India, A Life of General Sir James Outram، لندن، 1903ء

اے ایل پی ٹکر، Sir Robert G.Sandeman,Peaceful Conqueror of Baluchistan، لندن، 1921ء

سی ایل ٹوپر، Punjab Customary Law Vol.II, Statement of Customary in Different Districts، کلکتہ، 1881ء

آر اے اولینوسکی، The Comintern and the East، ماسکو، 1970ء

Scanned by CamScanner

ایم ایس ویرانیلائی، Are we two Nations? Nationalities in Indian Politics، لاہور، 1964ء

فرنس اے والی، Politics of the Indian Ocean Region, The Balances of Power، نیویارک، 1976ء

آرتھر ونسٹن، The Defence of India، کلکتہ، 1922ء

ایڈورڈ ویکفیلڈ، Past Imperative-My Life in India(1927-1947)، لندن، 1966ء

میری ایلس واٹرز، Rosa Luxemburg speaks، نیویارک، 1970ء

جے ایم وکلے، Punjabi Musalmans, Handbook for the Indian Army، کلکتہ، 1915ء

ایل ایف ولیمز، Rushbrook:Pakistan under Challenge، لندن، 1975ء

آرنلڈ ٹی ولسن، The Persian Gulf. An Historical Sketch from the Earliest Times to the Beginning of the 20th century، لندن، 1959ء

رابرٹ جی ورسنگ، The Baluchis and Pathans، لندن، 1981ء

فلپ وُڈرف، The Men who Ruled India، لندن، 1958ء

ایم ای یپ، Strategies of British India-Britain, Iran and Afghanistan، آکسفورڈ، 1980ء

سیمھر ذبیح، The Communist Movement in Iran، برکلے، 1966ء

ایل زرنگ، The Sub-continent in World Politics and its Neighbours and the Great Powers، نیویارک

مضامین

عبدالصمد اچکزئی، ''بلوچستان کی قومی زبان'' (بولان) 19 اگست 1946ء

عبدالصمد اچکزئی، مغربی پاکستان ہائی کورٹ، لاہور میں بیان، 1956ء

عبدالصمد اچکزئی، بلوچستان و آزادی (پاکستان)، چارسدہ، 17 مئی 1946ء

ایس ایم علوی، Problems of Nationality in Contemporary Persia, in Kartkiya Soobshchenya Instuta Nanodv Azii 77 (1964)، سنٹرل ایشین ریویو، جلد XIV نمبر 1، 1966ء

کامل القادری، ''بلوچستان کی سیاسی تاریخ'' (بلوچی دنیا)، ملتان، جون 1973ء

کامل القادری، ''کوہِ مراد'' (نوکیں دور)، (بلوچی)، کوئٹہ 16 مارچ، 1967ء

Scanned by CamScanner

محمد حسین عنقا، ''بلوچ جماعت بنانے کی ضرورت''، (بولان) مستونگ، 19 اگست 1946ء

محمد حسین عنقا، ''ریاستِ قلات'' (بلوچستان)، کراچی، 26 جنوری، 1938ء

محمد حسین عنقا، ''بلوچی قومی زبان''، (بلوچستان)، کراچی، 24 اکتوبر 1937ء

محمد حسین عنقا، ''بلوچ سرداروں کا غیر مستحسن رویہ''، (البلوچ) کراچی، 13، اگست 1933ء

سی بوسورتھ، The Kufchis or Qurs in Persian History(Iran-Journal of Persian Studies)، جلد XIV، 1976ء

عنایت اللہ بلوچ، ''پاکستان میں قومیتوں کا مسئلہ اور اسلام''، (بلوچی دنیا)، نومبر 1973ء

عنایت اللہ بلوچ، ''قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی (1924-1948)''، (بلوچی دنیا)، اگست اور ستمبر 1976ء

عنایت اللہ بلوچ، ''قائداعظم اور بلوچستان'' (فکر و نظر، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا جریدہ)، اسلام آباد، دسمبر، جنوری، 77-1976ء

عنایت اللہ بلوچ، ''سرداری نظام''، (پیپلز فرنٹ)، لندن، اپریل 1979ء

عنایت اللہ بلوچ، The Emergence of Baluch Nationalism (پاکستان پروگریسو)، نیویارک، دسمبر 1980ء

عنایت اللہ بلوچ، The Tribal System:From Blessing to Blight، (پاکستان پروگریسو)، دسمبر 1980ء

عنایت اللہ بلوچ، Afghanistan,Pushtunistan and Belutschistan (Aubenpolitik-Zeitschrift f:Ir Internationale Fragen)

عنایت اللہ بلوچ، The Baluch Question in Pakistan and the Right of Self-Determination (Zingel)

ڈبلیو ہمبرگ، Pakistan in its Fourth Decade، 1983ء

عنایت اللہ بلوچ، Subnationalism in Pakistan (Journal of South Asian and Middle Eastern Studies)، 1982ء

عنایت اللہ بلوچ، ''محمد یوسف علی خان مگسی''، (آزاد بلوچستان)، لندن، دسمبر 1984ء جنوری اور فروری 1985ء

Scanned by CamScanner

نگارش سعیدی بلوچ، ''آزاد بلوچستان اور حکومتِ ایران''، (بلوچستان)، مارچ 1939ء

اے کے بلوچ، ''کیا بلوچ نسل سامی ہے'' (بلوچی دنیا)، اگست 1970ء

حمید بلوچ، Testament of Freedom (آزاد بلوچستان)، جون 1983ء

کہکشاں بلوچ، ''اوّلین بلوچی قائد، یوسف علی خان مگسی''، (بلوچی دنیا)، مئی 1971ء

ایس کے بلوچ، ''ڈیرہ اسماعیل خان'' (بلوچی دنیا)، نومبر، دسمبر 1966ء

ڈیوسن آئی بگو، Dera Ghazikhan:The Baluch Tribal Area، (Journal Royal Central Asian Society)، جلد XXXVII، 1950ء

آئی براؤنلی، An Essay in the History of Self Determination، (Grotin Society Paper-9G-1968)

سی ای بروس، The Sundeman Policy As Applied to Tribal Problems، (Journal of Royal Central Asian Society)، جلد XIX، 1932ء

فقیر بخش بگتی، ''علامہ سید محمد جونا پوری'' (نوکیں دَور)، 16 مارچ 1967ء

کریم دشتی، ''بلوچی رسم الخط'' (بلوچی دنیا)، اگست 1970ء

عبدالصمد درانی ''ہماری جدوجہد کی داستان'' (عبدالرحمٰن) پبلشر گوشۂ ادب کوئٹہ

گوہر، ''ہماری جدوجہد''، کوئٹہ

جے ایلفنبن آئی ڈی، Baluchi Language-Linguistic Survey، (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)، جلد اوّل۔ آئی لیڈن، 1960ء (نیا ایڈیشن)

اے ای ایل انیموئل، The Baluchis of Upper Sindh، (Journal Anthropological Society of Bombay)، 1911ء

نور احمد خان فریدی، مکران اعظم اور عظیم مکران، (نوکیں دَور)، 16 مارچ 1967ء

آر این فرائی، Baluchitan، (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)، جلد اوّل، لیڈن، 1960ء

اے آر غور ''یوسف مگسی، خطوط کے آئینہ میں'' (بلوچی دنیا)، جولائی 1973ء

احمد آئی غوری، ''ڈیرہ غازی خاں کی سرداریاں''، (بلوچی دنیا)، اگست، ستمبر 1978ء

الیف گولڈزمڈ، Notes on Eastern Persia and Western Baluchistan، (Journal Royal

Scanned by CamScanner

Geographic Society)، جلد37، 1867ء

ایف گولڈ زمڈ، Diary of Proceedings of Mission into Mekran for Politics and Survey Purposes from 12th to 19th December 1861، (Journal Royal Geographic Society)، جلد37، 1863ء

این پی گرانٹ، Journal of a Route through the Western Part of Makran(1809)، (Journal Royal Asiatic Society)، جلد پنجم، 1839ء

ٹی ہولڈش، The Annals of our Indian Frontier، (Journal of the Anthropological Institute,Roayal Geographical Society)، جلد29، 1885ء

ٹی ہولڈش، The Perso-Baluch Boundary، (Geographical Journal)، لندن1897ء

بُلر آر ہفز، Marris and Baluchis، (Census of India 1901)، جلد اوّل، کلکتہ، 1908ء

آغا سلطان ابراہیم، ''خان میر خداداد خان'' (الحسیف)، جیکب آباد، 20 اگست 1937ء

آغا سلطان ابراہیم، ''میر نصیر خان کی حکومت''، (الحسیف)، جیکب آباد، فروری 1936ء

آغا سلطان ابراہیم، ''میر مہراب خان''، (الحسیف)، سالنامہ، جیکب آباد، 1937ء

علی جعفری، The Confusion over Kuch and Baluch، (Journal Asiatic Society of Pakistan)، ڈھاکا، دسمبر 1963ء

عبداللہ جان جمالدینی، Subha Star، (بلوچی)، کوئٹہ، جنوری، فروری 1976ء

این محمد جمالی، ''بلوچی رسم الخط''، (بلوچی دنیا)، اگست 1970ء

جہانگیر شاہ جوگیزئی، ''بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کی روئیداد'' بمطابق ایس احمد فاروق احمد کی کتاب، تاریخ پاکستان اور بلوچستان، کراچی، 1977ء

"Juma Khan versus State of Pakistan"، (The Pakistan Legal Decisions(PLD))، 1962ء

ایم قیصرانی، ''بلوچی شاعری اور فرنگی سامراج''، (ماہِ نو)، لاہور، اگست 1978ء

عبدالغفار خان، ''شملہ سدئی داد نصیبہ بلوچستان''، (پختون)، 24 مارچ 1946ء

عبدالعزیز کُرد، 'ملک عبدالرحیم خواجہ خیل اور بلوچستان کی انگرتم (نوکیں دور)، 21 اکتوبر 1966ء

عبدالعزیز کُرد، ''تحریک آزادی کا ساتھی۔ مگسی''، (بلوچی دنیا)، مئی 1971ء

Scanned by CamScanner

عبدالعزیز کرد، ''سوانح حیات''، جون۔ جولائی 1968ء

ای ایس لینٹ، American Foreign Policy and Principles of Self Determination، (World Affairs)، 71-1970ء

ایم لیبوی، Marxism and The National Question، (بمطابق روبن بلیک برن کی کتاب Revolution and Class Struggle)، لندن، 1977ء

اے ایچ میک موہن، The Southern Borderlands of Agfhanistan، (Journal Royal Geographical Society)، جلد 9، 1897ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''پیغام''، (البلوچ)، کراچی، 30 جولائی 1933ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''سیاست مقدم ہے یا اقتصادیات''، فروری 1935ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''جینا چاہتے ہو تو جینے دو''، (بلوچستان)، 30 مئی، 1936ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''مکاتیب مگسی''، (بلوچستان)، 30 مئی، 1986ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''فارسی نظم''، (بلوچستان)، 30 مئی 1936ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''مکاتیب مگسی''، (بلوچستان)، 30 مئی 1938ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''مسہو گان برطانیہ کے جرگہ ہال میں نرالا رقص''، (بلوچستان)، 30 مئی 1936ء

ایم یوسف علی خان مگسی، ''مکاتیب بنام امین کھوسہ''، (الحنیف)، 20 اگست، 1937ء

گل خان نصیر، ''ریاست قلات کی قومی زبان''، (بولان)، 19 اگست 1946ء

قادر بخش نظامانی، ''کچھ یادیں''، (پیپلز فرنٹ)، مئی 1980ء

ایس ڈبلیو پاسٹنر، Power and Pirs Among the Pakistani Baluch، (Journal of Asian and African Studies)، جولائی، اکتوبر 1978ء

ایس ڈبلیو پاسٹنر، Competitive Saints of the Baluch، (Asian Affairs)، فروری 1980ء

ڈبلیو پولاڈ، Pushtunistan، (بمطابق، ٹی ایمبری کی کتاب، Pakistan's Western Borderlands)، نئی دہلی 1977ء

کامل القادری، ''کوہِ مراد''، (نوکیں دور)، کوئٹہ، 16 مارچ 1967ء

عبدالرحمٰن، ''میر عبدالعزیز کرد''، (بلوچی دنیا)، جون۔ جولائی 1968ء

Scanned by CamScanner

عبدالرحمٰن، ''اوّلین بلوچی رہنما''، جون۔جولائی1970ء

میر عالم رقیب، ''موریہ خاندان''، (بلوچی دنیا)، جولائی1973ء

انور رومان، ''مکران قبل تاریخ''، (نوکیں دور)، 16 مارچ1967ء

انور رومان، ''نوابزادہ یوسف علی خان مگسی''، (بلوچی دنیا)، مئی1971ء

انور رومان، Brahuis of Quetta-Kalat Region، (Journal of Pakistan Historical Society)، کراچی، جنوری1960ء

رابرٹ سنڈیمن، Notes on Tours in Baluchistan، (Proceedings of Royal Geographic Society)، جلد XIII، لندن1891ء

قاضی مولانا عبدالصمد سربزی، ''بلوچی اور بلوچستان''، (بلوچی دنیا)، ستمبر1966ء

قاضی مولانا عبدالصمد سربزی، ''مکران اور اس کا جغرافیہ''، (بلوچی دنیا)، ستمبر1966ء

بریکیٹ ایچ سیلاسی، Evolution of the Principle of Self-Determination، (Horn of Africa)، اکتوبر، دسمبر1978ء

واٹسن ہف سیٹون، Reflections on Europe's Experience of Separatism، (The Politics of Separatism,Collected Seminar Papers No.19)، لندن

پیام شاہجان پوری، ''سید احمد شہید کا ورودِ بلوچستان''، (جمہوریت)، اکتوبر25-19، 1974ء

اے کے شاہوانی، ''بلوچستانوں کے سرداروں کی تاریخ''، (نوائے وطن)، 9 جون1976ء

غلام محمد شاہوانی، ''تاریخِ مکران''، (نوکیں دور)، 16 مارچ1967ء

عبدالکریم شورش، ''عبدالرحیم خواجہ خیل''، (بلوچی دنیا)، نومبر، دسمبر1966ء

عبدالکریم شورش، ''مکران اور قومی تحریکیں''، (نوکیں دور)، 16 مارچ1967ء

سی پی سکرائن، The Highlands of Persian Baluchistan، (The Geographic Journal) اکتوبر1931ء

جے ڈبلیو سپین، Politcal Problems of a Borderland (بمطابق ایمبری ٹی اینیسلی کی کتاب Pakistan's Western Borderlands)، نئی دہلی، 1971ء

ای سمتھ، The Perso Baluch Frontier(1870-71)، (بمطابق ایسمتھ لوئٹ کی کتاب Eastern

Scanned by CamScanner

Persia)، لندن، 1876ء

برائن سپونر، Kuch, Baluch and Jehthyophagi)، Iran-Journal of Persian Studies) جلد دوم، لندن 1963ء

برائن سپونر، Notes on Baluchi Spoken in Persian Baluchistan)، Iran-Journal of Pakistan Studies)، جلد پنجم، 1967ء

برائن سپونر، Who are the Baluch)، (بمطابق ای بوسورتھ اوری ہیلنبر انڈسڈ کی کتاب Qajar Iran)، ایڈنبرگ، 1983ء

برائن سپونر، Nomadism in Baluchistan)، (بمطابق لشنک اورای ڈی سوتھیمر کی کتاب Pastoralists and Nomads in South Asia)، ویزبدن، 1975ء

این سوڈلر، The Development of Kalat)، Journal on African and Asian Studies)، جلد ہفتم، 1972ء پبلشر سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

این سوڈلر، Brahui Political Organization and the National State)، (بمطابق ایمبری ٹی اینسلی Pakistan's Western Borderlands)، نئی دہلی 1977ء

ڈبلیو سوڈلر، Economic Change in Baluchistan)، (بمطابق ایمبری ٹی اینسلی کی کتاب Pakistan's Western Borders)، نیو دہلی 1977ء

تھامس ایچ تھارنٹن، Sir Robert Sanduman and the Indian Frontier Policy)، Asiatic Quarterly Review)، جولائی۔اکتوبر 1985ء پبلشر گوشہء ادب کوئٹہ

ایم ویز، Political Integration and Political Development)، (The Annals) جلد 38، مارچ 1965ء پبلشر گوشہء ادب کوئٹہ

اخبارات

ماہانہ بلوچی دنیا، ملتان

فکر و نظر، اسلام آباد

پختون، چارسدہ

ماہِ نور، لاہور

Scanned by CamScanner

Horn of Africa, Summit, New Jersy

Royal Central Asian Journal,London

ہفتہ وار	البلوچ، کراچی
	الحنیف، جیکب آباد
	بلوچستان، کراچی
	بلوچستانِ جدید، کراچی
	بولان، مچھ، مستونگ
	جمہوریت، لاہور
	نجات، کراچی
روزنامہ	زمیندار، لاہور
	ڈان، کراچی

Scanned by CamScanner

کتاب میں مستعمل اصطلاحات کے معنی

درج ذیل فہرست میں شامل اصطلاحات یا الفاظ، بلوچی، فارسی، ترکی، سندھی اور اردو زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مختلف ممالک میں کئی اصطلاحات کے مختلف معنی اور تاثرات ہوتے ہیں۔ ہم نے بلوچی معاشرے میں ان اصطلاحات اور الفاظ کا ترجمہ اور معانی درج کیے ہیں۔

امیر = حکمران

انجمن = سیاسی تنظیم

باہوٹ = پناہ

بُلک = قبائلی ضلع

بلوچیات = بلوچیت

بَرّ = انتقام

بیگلر بیگی/بیلر بے = سرداروں کا سردار

ڈیرہ = پڑاؤ

ڈیرہ جاٹ = یہ اصطلاح، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ فتح خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے بلوچی علاقوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

دیت = خون بہا

فرمان = شاہی حکم

غیرت = عزت

Scanned by CamScanner

گیدان	=	خیمہ
حان	=	پہلے بلوچی وفاق کے سربراہوں کا لقب
جرگہ	=	اجتماع
خان	=	بلوچستان کے حکمران کا لقب
لاج	=	شرم، غیرت، عزت
لشکر	=	فوج، قبائلی فوج
میر	=	عزت سے پکارنے کا لقب اور سندھ کے بلوچی حکمرانوں کا لقب
ملا	=	تعلیم یافتہ شخص، مسلمان کسان
معظم	=	عظیم
ناموس	=	عزت
نائب	=	گورنر
نواب	=	حصہ
فالس	=	گروہ
پیرا	=	قبیلہ
قابیلہ	=	جج، منصف
قاضی	=	علمبردار
راہزن	=	قبائلی سردار، حکمران
شیہ	=	قبیلے کا سردار
وطن	=	آبائی سرزمین
وزیر	=	وزیراعظم

Scanned by CamScanner

حالاتِ زندگی

1. محمد حسین عنقا

پیدائش 20 ستمبر 1907ء میں مچھ میں ہوئی۔ والد کا پیشہ ٹھیکیداری تھا۔ سکول کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ 1931ء میں استعفیٰ دیا اور بلوچستان نیشنل پریس کی بنیاد رکھی۔ بہت سے بلوچی اخبارات میں بطور مدیر کام کیا۔ بلوچی نیشنل موومنٹ (1933-1948ء) سے تعلق رہا۔ بلوچستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک بانی رکن تھے۔ پہلے بلوچی قومی نغمے کے علاوہ بہت سے سیاسی کتابیں اور علمی مقالوں کے مصنف ہیں۔ سیاسی الزامات کے تحت پہلے برطانوی اور پھر پاکستانی حکومت نے قید رکھا۔ 1977ء میں وفات پائی۔

2. عبدالوحید عزت (جمالدینی)

پیدائش بمقام نوشکی 1918ء میں ہوئی۔ مختصر کہانی نویس، مشہور بلوچی شاعر ہیں۔ ماہنامہ ''بلوچی''، کراچی/کوئٹہ کے مدیر رہے۔ بلوچی زبان میں ترقی پسند ادب کے بانی ہیں۔ ستمبر 1982ء میں وفات پائی۔

3. پرنس عبدالکریم بلوچ

میر محمد اعظم جان خان، خانِ قلات (1933-1931ء) کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ کراچی میں تعلیم پائی اور مارچ 1948ء تک مکران کے گورنر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے فوجی قبضے کے خلاف پہلی بلوچی تحریکِ مزاحمت کی قیادت کی۔ جون 1948ء میں گرفتار ہونے کے بعد قید میں ڈال دیئے گئے۔ عوامی پارٹی اُستمان گل (Ustman Gal) کی بنیاد رکھی اور نیشنل عوامی پارٹی کے قیام میں حصہ لیا۔ بلوچستان میں سندھی، بلوچی اور پختون فرنٹ کے سربراہ کے طور پر کام کیا۔ 1986ء میں وفات پائی۔

Scanned by CamScanner

4. دوست محمد خان بارانزئی

انیسویں صدی کے اواخر میں بمقام بامپٹ (مغربی بلوچستان) پیدا ہوئے۔ ماموں، سردار بہرام خان نے بلوچی قبائل کے بلوچی قبائلی وفاق کی مکران میں بنیاد رکھی۔ ماموں کی وفات کے بعد وفاق کا سربراہ منتخب کرلیا گیا۔ وفاق کی سرحدوں کو وسعت دی اور سرحد وسیستان کے بلوچی قبیلوں کے ساتھ فوجی اتحاد کیا۔ 28-1927ء میں ایرانی حملے کی مزاحمت کی۔ 1928ء میں رضا شاہ نے بات چیت کے لیے تہران آنے کی دعوت دی اور شاہِ ایران کے حکم پر گرفتار کر کے موت کی سزا دے دی گئی۔

5. میر غوث بخش بزنجو

بزنجو قبیلے کے سردار خیل کے خاندان بمقام نال پیدا ہوئے۔ کراچی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ 1937ء میں بلوچی سیاست میں شامل ہوئے۔ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے 47-1946ء میں کام کیا۔ پاکستان کے ساتھ بلوچستان کے الحاق کی مخالفت کی۔ اُستمان گل اور بعدازاں نیشنل عوامی پارٹی کے نائب صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1973-1972ء کے دوران گورنر رہے۔ اس وقت وہ نیشنل پارٹی کے صدر ہیں۔

6. صاحبزادہ عبدالرحمٰن بگتی

پیدائش ڈیرہ بگتی (1907ء) میں ہوئی۔ بگتی تمندار (سردار)، مہراب خان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ بلوچی قبائلی علاقوں میں تحصیلدار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1931ء میں انجمنِ اتحاد بلوچستان میں شامل ہوگئے اور 1938-1934ء میں کوئٹہ اور سبی کی شاخوں کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ بگتی علاقہ میں سرداری نظام کے خلاف مشہور بلوچ بغاوت کی قیادت کی۔ 1950ء میں جیکب آباد میں وفات پائی۔

7. سردار بابر خان دودئی

مکران میں پیدائش ہوئی۔ اپنے والد، میر سہراب خان کے ساتھ مل کر مشرقی بلوچستان میں ڈیرہ جاٹ کے دودئی وفاق کی بنیاد رکھی۔ بجارانی اور مری کو زیر نگیں لانے کے لیے دودئی فوج کی قیادت کی۔ دودئیوں اور مریوں کے درمیان جنگ کے موضوع پر کئی ایک رزمیہ نظمیں تخلیق کیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان (پاکستان شمال مغربی سرحدی صوبہ (اب پختون خوا) کے جنوب میں واقع بابر نامی ایک قصبے میں سولہویں صدی میں وفات پائی۔

Scanned by CamScanner

8. محمد فاضل درخانی

درخان (قلات) میں سولہویں صدی میں پیدائش ہوئی۔ محمد فاضل درخانی ایک مسلمان مذہبی عالم تھے جنہوں نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے یورپی تبلیغی جماعتوں اور مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات کے خلاف کام کیا۔ 1892ء میں وفات ہوئی۔ آبائی گاؤں، درخان (مشرقی بلوچستان) میں دفن ہوئے۔

9. جام دُرّک

اٹھارہویں صدی کے وسط میں پیدائش، قلات میں ہوئی اور 1806ء میں وفات پائی۔ وہ نصیر خان اعظم کے درباری شاعر تھے جنہوں نے بلوچی ادب میں غزلیں متعارف کروائیں اور بلوچوں اور افغانیوں کے درمیان جنگ (1758ء) کے موضوع پر رزمیہ نظمیں لکھیں۔ ''ملک الشعرا'' کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انہیں لہری کے قریب گُرج تنگی میں دفن کیا گیا۔

10. ڈی وائی فَیل

سکاٹ لینڈ (انگلستان) میں پیدائش (1910ء)۔ آکسفورڈ سے گریجویشن کی اور بمبئی میں ہندوستان کی سرکاری ملازمت (1934-1937ء) اختیار کی۔ سیاسی ملازمت میں داخل ہوئے اور بلوچستان کے علاوہ برطانوی افغانستان میں خدمات انجام دیں۔ 48-1947ء میں خانِ قلات کی حکومت میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کیا۔

11. مولوی حضور بخش جتوئی

ریاست قلات کے صوبے کچھی کے ایک گاؤں تائب سانی میں انیسویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے۔ درخان کے مدرسے میں تعلیم پائی اور بعدازاں اپنے گاؤں میں دینی عالم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وفات ہوئی۔ ایک بلوچی مذہبی شاعر تھے۔ انہوں نے اسلام کے موضوع پر بہت سی عربی کتب کا بلوچی زبان میں ترجمہ کیا۔

12. حبیب اللہ خان بلوچ کولاچی

1907ء میں جھوک گوہل میں پیدائش ہوئی جو بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے علاقوں کی نسلی سرحدوں پر واقع ہے۔ ان کے والد سردار رب نواز نے 1918ء میں برطانیہ مخالف سرگرمیوں میں حصہ لیا جس کے باعث گرفتار ہوئے، ان کی زمین ضبط کر لی گئی۔ انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان

Scanned by CamScanner

میں اپنے بھائی سردار عبدالرحمٰن خان کے ساتھ مل کر ''انجمن'' کی بنیاد رکھی۔ سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر برطانویوں نے گرفتار کرلیا۔ 12 دسمبر 1974ء کو وفات پائی۔

13. غلام رسول خان کورائی

پیدائش ڈیرہ غازی خان (مشرقی بلوچستان)، وسط انیسویں صدی۔ 1930ء میں اتحادِ بلوچاں کی بنیاد رکھی جسے 1931ء میں انجمن کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ بلوچی تاریخ پر کتابیں لکھیں۔ سیاست میں داخل ہونے سے قبل برطانوی ہند میں بطور جج کام کیا۔ اپنے آبائی گاؤں، کوٹ غلام رسول، ڈیرہ غازی خان میں 1938ء میں وفات پائی۔

14. میر عبدالعزیز کُرد

پیدائش، مستونگ 1904ء۔ والد، قلات میں ایک سرکاری افسر تھے۔ ابتدائی تعلیم مستونگ میں حاصل کی۔ ''ینگ ترکس'' سے متاثر ہوکر ''ینگ بلوچ پارٹی'' قائم کی۔ 1930ء میں مگسی کی زیرِ قیادت انجمن میں شمولیت اختیار کی اور پہلے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے 1937ء میں انجمن کی ''ریاست قلات نیشنل پارٹی'' کے نام سے ازسرِنو تشکیل کی اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ آزاد بلوچستان کے شدید حامی تھے۔ 1933ء میں عظیم تر یا متحدہ بلوچستان کا پہلا نقشہ شائع کیا۔ 1979ء میں وفات پائی۔

15. میر محمد یوسف علی خان عزیز مگسی

جھل کے مقام پر جنوری 1918ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مگسی قبیلے کے تمن دار (سردار) تھے۔ اپنی تعلیم نجی اساتذہ سے حاصل کی۔ 1920ء میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ انجمن کی بنیاد رکھی اور 1930ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ 1932ء اور 1933ء میں حیدرآباد اور جیکب آباد میں بلوچستان اور بلوچی کانفرنسوں کا انعقاد کیا۔ 1934ء میں لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ ینگ ترکس، مارکس، لینن اور محمود ترزی کی تعلیم سے متاثر ہوئے۔ 1935ء میں کوئٹہ زلزلے میں ہلاک ہوگئے۔

16. رحم علی مری

پیدائش انیسویں صدی۔ بلوچی رزمیہ شاعر تھے۔ نواب خیر بخش خان مری اوّل کی زیرِ قیادت برطانوی سامراجیت کے خلاف مریوں کی بغاوت (1910-1920ء) میں حصہ لیا۔ بلوچی ادب میں ایک انقلابی رجحان تخلیق کیا۔ سامراجیت اور سرداری نظام کے خلاف پچاس ہزار سے زائد نظمیں لکھیں۔ 1930ء کی دہائی میں وفات پائی۔ انہیں بیداری کے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ ایک بلوچی

Scanned by CamScanner

مصنف، میر مٹھا خان مری نے ان کی کچھ شاعری اکٹھی کر کے شائع کی۔

17. شیر محمد مری (جنرل شیروف)

شیر محمد مری، کوہلو کے مقام پر 1924ء میں پیدا ہوئے۔ سبی میں تعلیم حاصل کی اور 1945ء میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے کوہِ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے بلوچی علاقوں میں ''مظلوم پارٹی'' قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ سرداری نظام کی مخالفت کی جائے اور ایک آزاد و خودمختار بلوچستان کی حمایت کی جائے۔ انہوں نے ''بلوچ عوام'' کے لبریشن فرنٹ کے لیے کام کیا جس کے سربراہ نواب خیر بخش خان مری تھے۔ انہوں نے مری قبائلی علاقے میں قومی تحریکِ مزاحمت (1962-1968ء) میں حصہ لیا۔

18. میر گل خان نصیر

میر گل خان نصیر کی پیدائش بمقام نوشکی 1910ء میں ہوئی۔ انہوں نے بہت سے ادبی جرائد کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد ازاں، انہوں نے ریاست قلات کی سرکاری ملازمت اختیار کی اور بلوچستان میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے کام کیا (1972-73ء)۔ وہ اپنے سیاسی نظریات کے باعث برطانوی اور پاکستانی حکومت کے اسیر رہے۔ وہ بلوچی اور اردو زبانوں کے شاعر تھے۔ انہوں نے 1981ء میں وفات پائی۔

19. قادر بخش نظامانی

ایک بلوچ گھرانے میں ٹانڈو قیصر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ماسکو میں تعلیم حاصل کی۔ وہ بلوچستان میں کمیونسٹ پارٹی اور سندھ کی ہاری پارٹی کے بانیوں میں سے ہیں۔ 1948ء میں پہلی بلوچ تحریک مزاحمت میں شرکت کی۔ وہ کئی ایک بلوچی اخبارات کے مدیر رہے۔ انہوں نے لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کی اور بلوچستان لبریشن آرگنائزیشن کا ترجمان ''آزاد بلوچستان'' شائع کیا جس کے سربراہ سردار عطاء اللہ خان مینگل، بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ تھے۔

20. صاحبزادہ شہباز خان نوشیروانی

پیدائش، خاران شہر۔ نواب امیر محمد یعقوب خان کے بیٹے تھے۔ ریاستِ قلات کی نیشنل پارٹی کے صدر کی حیثیت سے 1937ء میں کام کیا۔ بلوچ لیگ میں 1946ء میں شرکت اختیار کی۔ 1948ء میں مسلم لیگ اور 1974ء میں پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔

Scanned by CamScanner

21. ملک محمد پناہ

ریاستِ قلات میں پیدا ہوئے۔ بلوچستان میں تعلیم حاصل کی۔ 1948ء تک حکومت قلات کی سرکاری ملازمت میں رہے۔ 1948ء میں پرنس عبدالکریم کی قیادت میں پہلی قومی تحریک مزاحمت میں شرکت کی۔ گرفتار ہو کر قید خانے بھیج دیئے گئے۔ کوئٹہ کے ''نوائے وطن'' کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ بلوچی زبان میں لکھتے تھے۔ 1982ء میں وفات ہوئی۔

22. سر نواب سید شمس شاہ

گجرات (پنجاب) کے ایک گاؤں ''پیر جتنا'' میں انیسویں صدی میں پیدا ہوئے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز پٹواری کی حیثیت سے کیا۔ 1920ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے انہیں قلات کا وزیراعظم مقرر کر دیا۔ انہیں بلوچستان میں ایک ظالم وزیراعظم سمجھا جاتا تھا اور 1932ء میں انجمن کی شدید مخالفت کے باعث انہیں وزیراعظم کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اپنے آبائی صوبے پنجاب (برطانوی ہند) میں ان کا انتقال ہوا۔

23. عبدالکریم شورش

مستونگ کے مقام پر 1912ء میں پیدا ہوئے۔ ''بلوچ ینگ پارٹی''، ''انجمن'' اور ''قلات نیشنل پارٹی'' کے علاوہ، اُستمان گل کے بانی رکن تھے۔ بلوچی زبان کے ماہنامہ ''نوکیں دَور''، کوئٹہ کے مدیر رہے۔ بلوچی، اردو اور بروہی زبانوں میں لکھتے رہے۔

Scanned by CamScanner

نقشه جات

Scanned by CamScanner

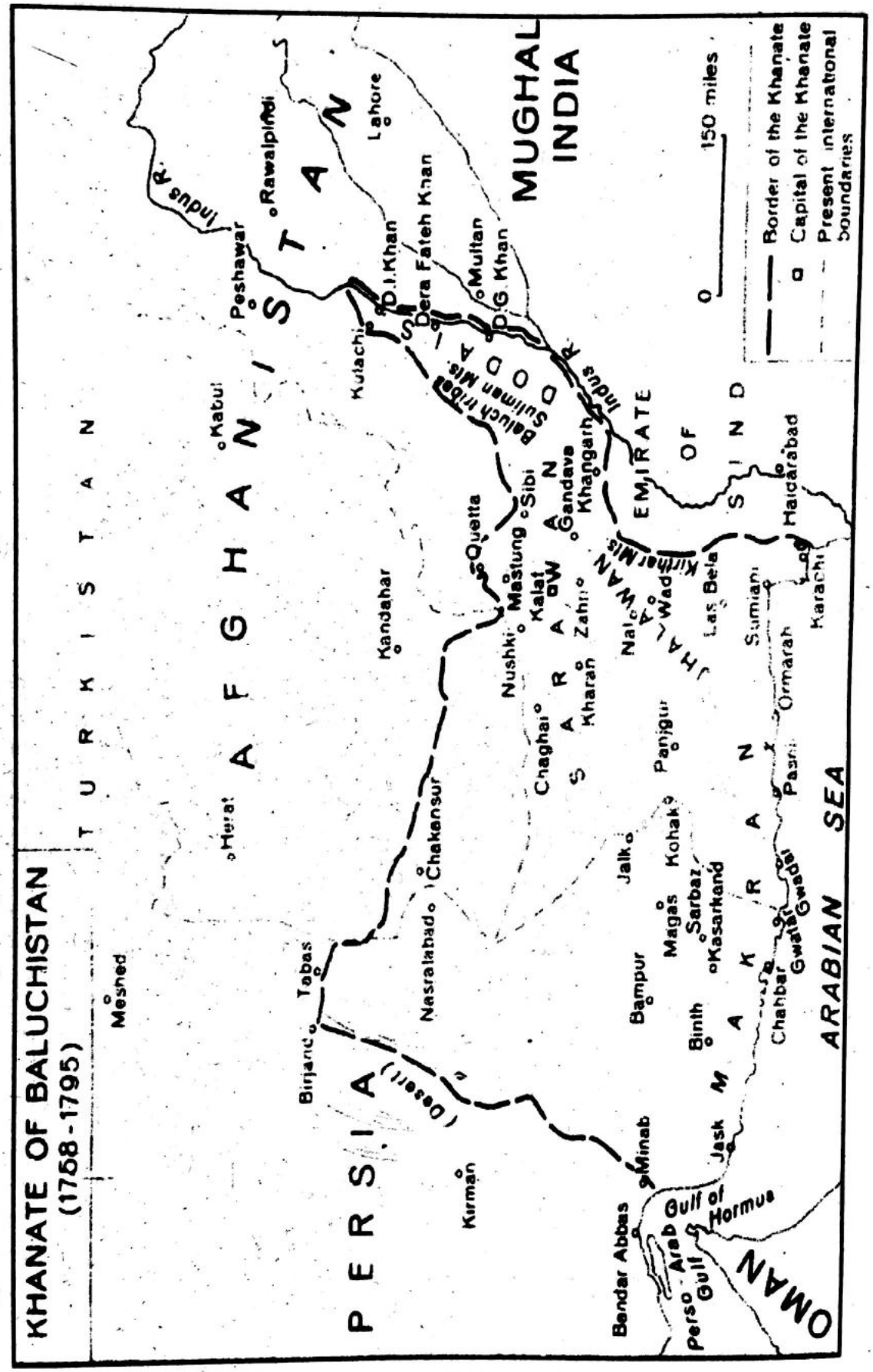

خان بلوچستان کی حکومت (1758-1795ء)

Scanned by CamScanner

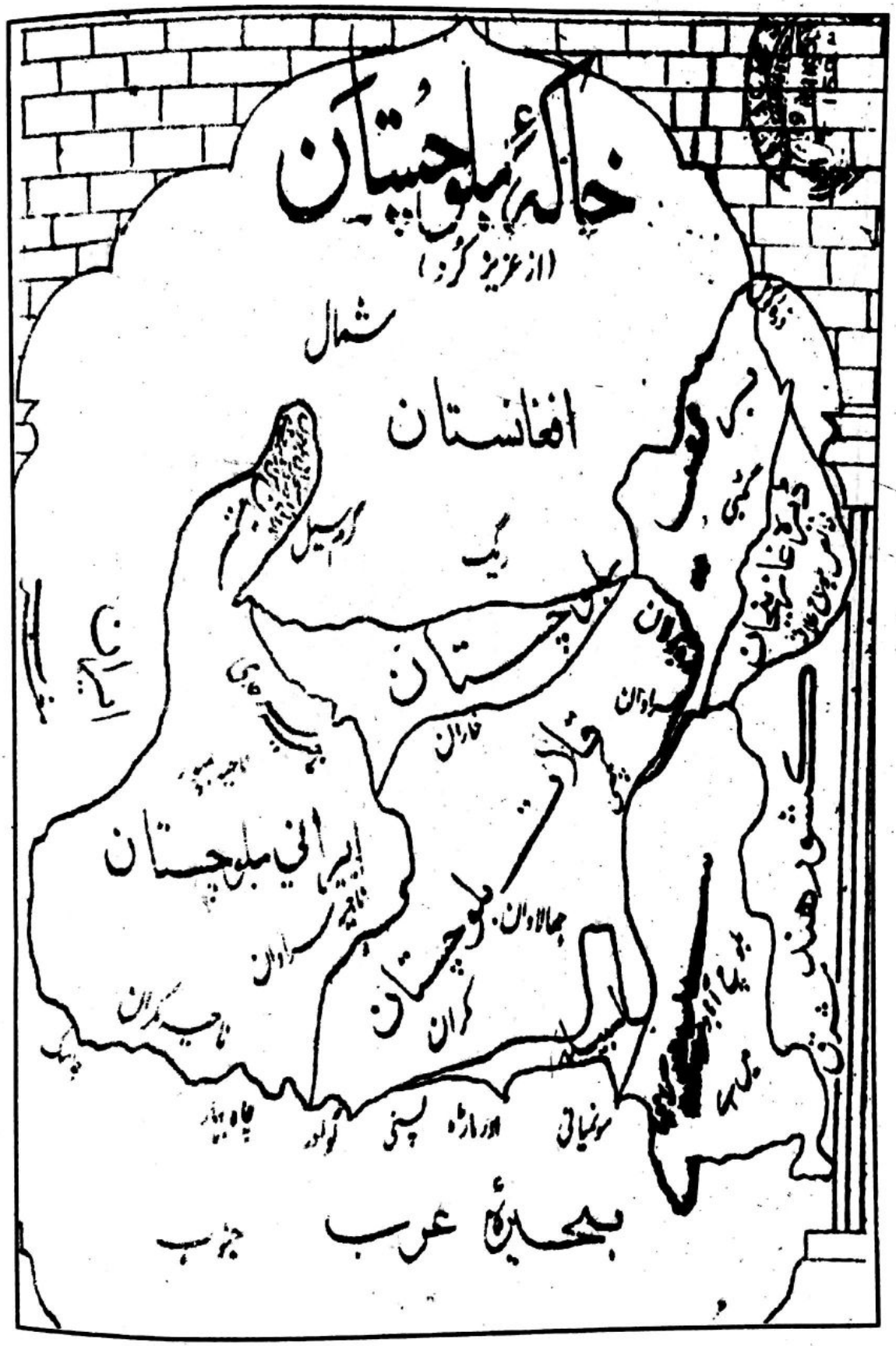

خاکہ بلوچستان

Scanned by CamScanner

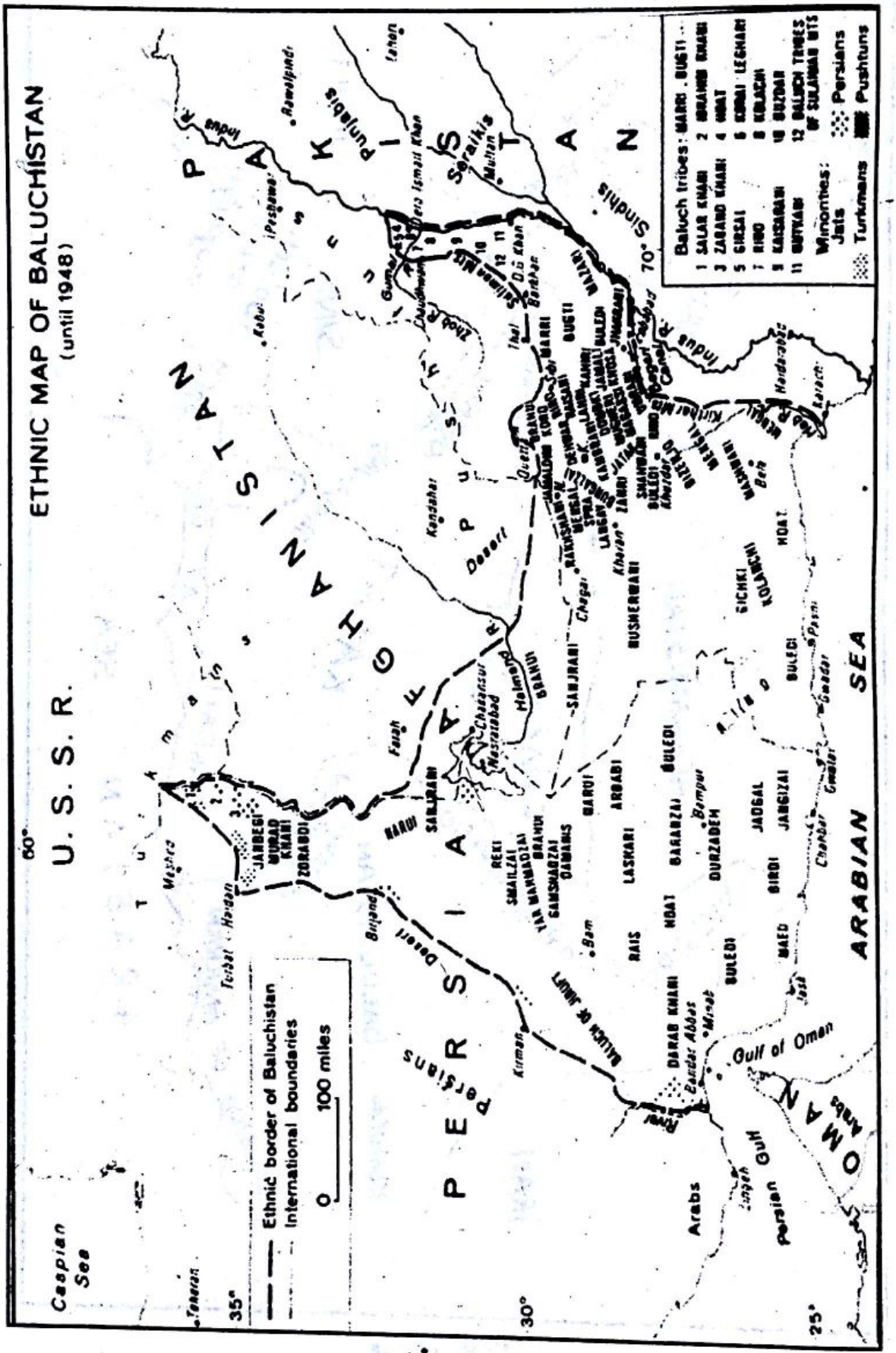

بلوچستان کا نسلی نقشہ

Scanned by CamScanner

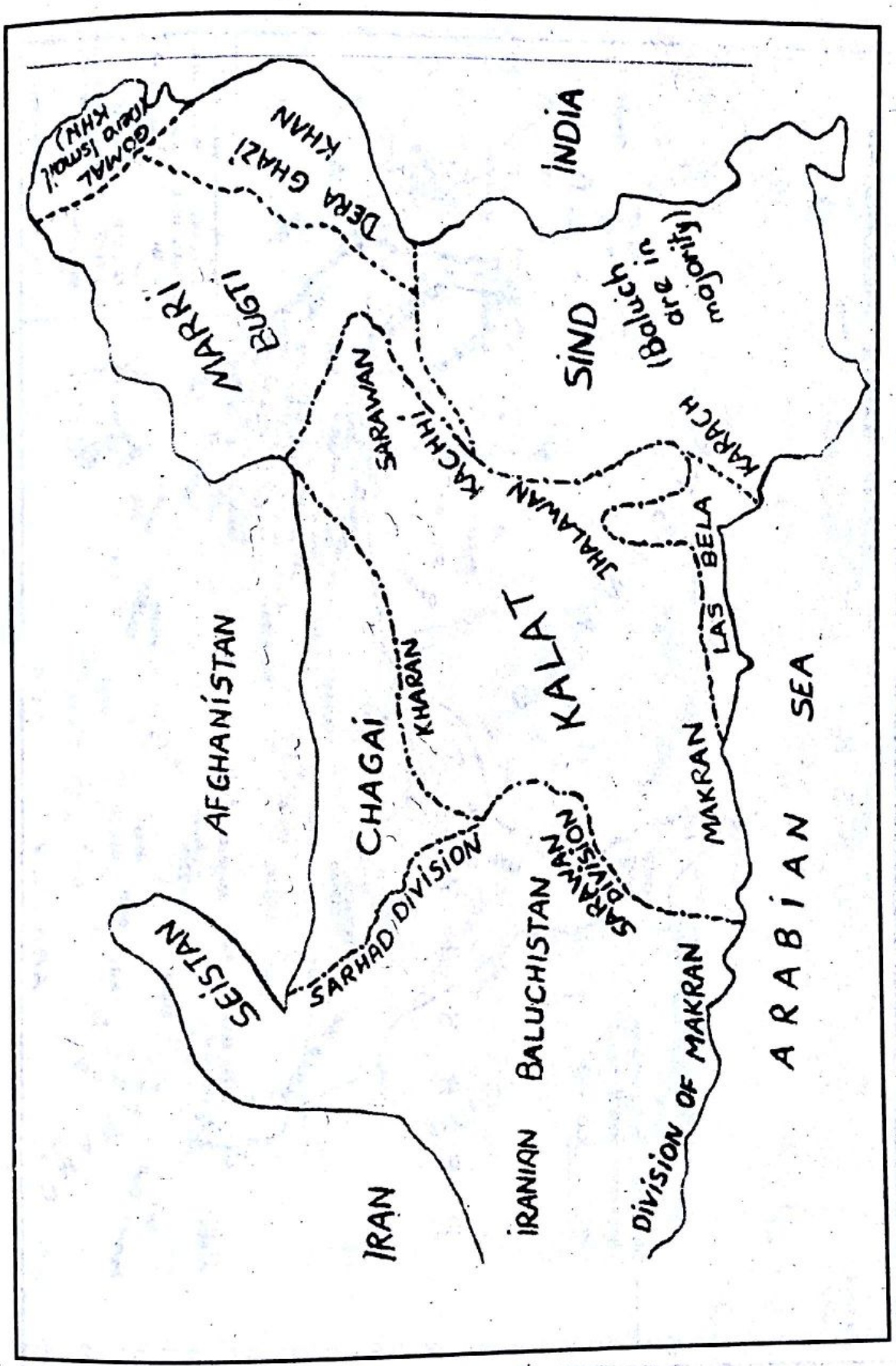

بلوچستان کا نقشہ

Scanned by CamScanner

بلوچستان کا مسئلہ

بلوچ قوم پرستی کا ایک جائزہ

عنایت اللہ بلوچ

بلوچستان کا مسئلہ
بلوچ قوم پرستی کا ایک جائزہ
عنایت اللہ بلوچ

جمہوری پبلیکیشنز کی شاندار کتابیں

بلوچستان۔ آزادی سے صوبائی بے اختیاری تک	احمد سلیم
بلوچستان مسئلہ کیا ہے؟	مجاہد بریلوی
مقصد سیاست (ہائے بلوچستان میرے لوٹ بانٹ پر لہو کی سوانح عمری)	بی۔ ایم۔ کٹی
پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	لیفٹیننٹ کرنل شریف الحق دالیم
اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آرا امام
جو میں نے دیکھا (پاکستانی سیاست و حکمرانی کی اندرونی کہانی)	راؤ رشید
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی۔ سرمائے کے آقا	فرخ سہیل گوئندی
کامی کازی ڈائری۔ جاپانی خودکش طلبا کے تاثرات	امیکو اوذوکی تیرنے
تاریخ سلطنت عثمانیہ۔ سلیمان عالیشان	ہیرالڈ البرٹ لیمپ
تاریخ گلگت	ڈاکٹر امر سنگھ چوہان
گرفتار لفظوں کی رہائی (گردوتر ک تنازع پر لکھا گیا ناول)	اویا بیدر
ناظم حکمت کے ساتھ جیل	اورحان کمال

ISBN 978-969-9739-76-7
9 789699 739767
Jumhoori Publications

Scanned by CamScanner